دعوت
رجوع اِلی القرآن
کا منظر و پس منظر

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

دعوت

رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

تألیف

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 ۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ فون 3- 5869501

نام کتاب ——— دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر

مؤلف ——— ڈاکٹر اسرار احمد

بار اول (مارچ ۱۹۹۰ء) ——— ۲۲۰۰

بار دوم (اپریل ۱۹۹۲ء) ——— ۲۰۰۰

بار سوم (نومبر ۲۰۰۱ء) ——— ۱۱۰۰

ناشر ——— ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ——— ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ——— /۱۰۰ روپے

دعوت رجوعِ الی القرآن ﷺ
کا منظر و پس منظر

انتساب

اُن باہمّت نوجوانوں کے نام

جو حدیثِ نبویؐ

خَیْرُکُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ

کو اپنا نصب العین بنالیں!

اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کردیں

بخاریؒ عن عثمانؓ ابن عفّان مرفوعًا

تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا عِلم حاصل کریں
اور اسے دوسروں تک پہنچائیں

ترتیب

ع ”گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہ پارینہ را !“

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز اور چودھویں صدی ہجری کے رُبعِ اوّل کے اختتام کے لگ بھگ جو عظیم شخصیت بیک وقت برّعظیم پاک و ہند کے سیاسی و قومی افق پر بھی ضوفشاں تھی، اور ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کے دینی و روحانی افق پر بھی خورشیدِ جہانتاب کے مانند چمک رہی تھی، وہ اسیرِ مالٹا مولانا محمود حسن رح کی تھی، جنہیں ملّت کے باشعور طبقات نے بجا طور پر شیخ الہند کا خطاب دیا ــــــ انہوں نے تقریباً نصف صدی تک روایتی تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول، اور جہادِ حریّت و استخلاصِ وطن میں سرگرم رہنے کے بعد، اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایّام میں جبکہ ان کی عمر ستّر سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور بقول مولانا ابو الکلام آزاد "ان کا قد بھی اُن کے دِل کی مانند اللہ کے آگے جُھک چکا تھا" دار العلوم دیوبند میں منعقدہ ایک اہم اجتماع میں حلقۂ دیوبند کے جملہ اکابر علماء کی موجودگی میں اپنی پونے چار سالہ اسیری کے دَوران کے غور و خوض کا حاصل، اور تامّل و تفکر کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پُوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

یہ روایت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ہے جو اُس اجلاس میں بنفسِ نفیس موجود تھے۔ اور انہوں نے اپنی تالیف "**وحدتِ امّت**" میں نہ صرف یہ کہ شیخ الہندؒ کے ان فرمودات کو نقل فرماکر امّت پر ایک احسانِ عظیم کیا، بلکہ ان پر یہ حکیمانہ اضافہ بھی فرمایا کہ:

"۔۔۔ قرآن کو چھوڑنا، اور آپس میں لڑنا، غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجہ میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔" (وحدتِ امّت، صفحات ۳۹، ۴۰)

عام محاورے کے مطابق تو اسے "حسنِ اتفاق" ہی سے تعبیر کیا جائے گا لیکن حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے یہ برّعظیم کے مسلمانوں پر اللہ تعالےٰ کے عظیم فضل و کرم کا مظہر ہے کہ عین اُس وقت (۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۴۰ھ) جب مذکورہ بالا آفتابِ ہدایت غروب ہو رہا تھا آیاتِ قرآنیہ: "وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝" کے مصداق ——— اور حضرت شیخ الہندؒ کی اس گواہی کے عین مطابق کہ:

"میرے اُس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔" (خطبۂ علی گڑھ)

جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے حلقے سے علاّمہ اقبال ایسے مفکرِ اسلام اور داعیٔ قرآن کی شخصیت ماہتاب عالمتاب کے مانند نمودار ہو چکی تھی ——— اور الحمد للہ کہ اِس نابغۂ ملّت کی تشخیص و تجویز بھی بالکل یہی تھی کہ ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ

اور ؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست اُو — زندہ و پائندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اور ؎ برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

مزید برآں، حضرت شیخ الہندؒ کے فرمودات پر جو حکیمانہ اضافہ مفتی محمد شفیعؒ نے کیا تھا، اس حکیم الامت نے اس کی توثیق بھی نہایت آب و تاب اور غایتِ جلال و جمال کے ساتھ کر دی یعنی ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است — پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست — اعتصامش کُن کہ "حبل اللہ" اوست[1]

چوں گہر در رشتۂ او سُفتہ شو — ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو!

گویا امتِ مسلمہ کے موجودہ زوال و اضمحلال اور ذلّت و نکبت کے سبب کی تشخیص، اور اُس کے اصل علاج کی نشاندہی کے ضمن میں چودھویں صدی ہجری کے ان دونوں اعاظمِ رجال کی آراء ع "متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!" کے مصداق متحد اور متّفق ہوگئیں، اور ایسا ہونا بالکل فطری تھا، چونکہ کلامِ الٰہی اور حدیثِ رسولؐ کو دونوں کے غور و فکر کے اصل مبنیٰ و مدار اور منبع و سرچشمہ ہونے کی حیثیت حاصل تھی، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد صحیح مسلمؒ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں موجود ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ" یعنی "اللہ تعالیٰ اسی کتاب (قرآن حکیم) کی بدولت بہت سی قوموں کو بامِ عروج پر پہنچائے گا، اور اسی (کو ترک کرنے) کے باعث دوسروں کو رُسوا کر دے گا۔" جو درحقیقت توضیح اور ترجمانی ہے اِن آیاتِ قرآنیہ کی کہ:

"وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ط"[2]

اور "اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ"[3]

یعنی قرآن حکیم کسی شاعر کی لایعنی اور لاحاصل سخن سازی نہیں ہے بلکہ قوموں اور امتوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی عدالت کا مظہر بن کر نازل ہوا ہے اور اب اِسی کی میزانِ عدل میں قوموں کی

---

[1] آیۂ قرآنی: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا" آل عمران: ۱۰۳

[2] سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت: ۱۰۵ — [3] سورۃ الطارق۔ آیات: ۱۳ و ۱۴

قسمتیں تولی جائیں گی اور امتوں کی تقدیروں کے فیصلے ہوں گے۔

اِن سطور کا عاجز و ناچیز راقم اس عالمِ آب و گِل میں حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بارہ سال بعد اور علامّہ اقبال کی وفات سے چھ سال قبل (۱۹۳۲ء میں) وارد ہوا۔ اور جب اُس نے شعور کی آنکھ کھولی تو یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شیخ الہندؒ کو تو اُن کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی فراموش کر دیا تھا[1] البتہ علامّہ اقبال کا طوطی بول رہا تھا اور اُن کی کم از کم اُردو شاعری کا ڈنکا برِ عظیم کے طول و عرض میں بج رہا تھا ــــــ اور اس سے پیدا شدہ جذبۂ ملّی تحریکِ پاکستان کی رُوحِ رواں بنا ہوا تھا۔ اِن حالات میں جب ۱۹۴۲ء میں راقم نے پانچویں جماعت کے طالبِ علم کی حیثیت سے "بانگِ درا" کی مشہور نظم "جوابِ شکوہ" پڑھی تو اس کا یہ شعر اس کے شعور میں پیوست ہو کر رہ گیا کہ

---

[1] میرے نزدیک اس کا سبب ع "اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شُدی!" کے مصداق حضرت شیخ الہندؒ کی وہ وسعتِ نظر، وسعتِ ظرف، اور وسعتِ قلب تھی جس کے تحت انہوں نے ایک[1] جانب تو وہ بات فرما دی جس کا حوالہ اُوپر آ چکا ہے۔ یعنی "میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں!" ــــــ اور ظاہر ہے کہ مدرسوں اور خانقاہوں کے باسیوں کو یہ بات کسی طرح بھی اچھی نہیں لگ سکتی تھی۔ ــــــ اور دوسری[2] جانب اپنے تلامذہ، متوسّلین اور مسترشدین کے حلقے سے باہر کے ایک بتّائیس سالہ نوجوان کے بارے میں نہ صرف یہ کہ یہ فرما دیا کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے" بلکہ اپنے قلبی احساسات کی ترجمانی اس شعر کے ذریعے بھی کر دی کہ ؎ "کامل اس طبقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی۔ کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!" ــــــ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ۱۹۲۰ء میں اپنے انتقال سے کچھ ہی دن پہلے یہ تجویز باصرار پیش فرمائی کہ جملہ علماء کرام اسی نوجوان (مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر اس وقت کل بتّیس ۳۲ برس تھی!) کو امام الہند مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں ــــــ گویا حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ و متوسّلین کا معاملہ اس شعر کا مصداق کامل ہے کہ ؎

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں — اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

لہٰذا راقم نے اپنی نوجوانی میں اگرچہ عملاً تو اوّلاً مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ذریعے تحریکِ پاکستان میں حصّہ لیا، اور بعد ازاں اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ذریعے تحریکِ اقامتِ دین سے وابستگی اختیار کی ــــــ لیکن اس عرصہ کے دوران، بحمداللہ، قرآنِ حکیم کے ساتھ اُس کے ذہن و قلب کا رشتہ مضبوط تر ہوتا چلا گیا ــــــ اور اِس ’سیر اِلی القرآن‘ کے ضمن میں راقم جہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور اُن کی تفہیم القرآن‘ اور مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے ترجمان القرآن سے متعارف ہوا، اور اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی اور اُن کے استاذ اور امام حمیدالدّین فراہیؒ کے طریقِ ’تدبّرِ قرآن‘ سے روشناس ہوا، وہاں الحمدللہ کہ ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ اس کا ذہنی و قلبی رشتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن اور شیخ الاسلام مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ کے حواشی کے ذریعے سلفِ صالحین اور راسخون فی العلم کے ”عُروۃ وثقیٰ“ سے بھی قائم ہو گیا ــــــ اور اس کے بعد تین چار سال کے اندر اندر ہی راقم کے فہم و فکرِ قرآن کے اِن ’ابعادِ ثلاثہ‘ پر ایک ’بُعدِ رابع‘ (FOURTH DIMENSION) کا اضافہ علّامہ اقبال کے فلسفیانہ، اور صحیح تر الفاظ میں متکلّمانہ اور متصوّفانہ افکار کا ہو گیا (جن کے ضمن میں راقم ڈاکٹر محمّد رفیع الدّین، اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مرہونِ مِنّت ہے)۔

راقم کے ’درس قرآن‘ کا چرچا زمانۂ تعلیم ہی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی کے دوران ہو گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد راقم منٹگمری (حال ساہیوال) منتقل

(گزشتہ سے پیوستہ)
یہی وجہ ہے کہ جب راقم نے پہلی بار مولانا سیّد حامد میاںؒ مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور اور خلیفۂ مجاز سیّد حسین احمد مدنیؒ کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ چودھویں صدی ہجری کے اصل مجدّد حضرت شیخ الہندؒ تھے تو وہ ایک دم چونک سے گئے۔ اور انہوں نے میری رائے کی تصویب فرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ حلقۂ دیوبند میں کسی کا ذہن ادھر نہیں گیا۔ اور نگاہیں یا مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف اُٹھتی رہیں یا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی جانب!

ہوا تو اگرچہ اس کے بعد سے ۱۹۶۵ء تک کے گیارہ سالوں کے دوران حالات کے کئی اُتار چڑھاؤ آئے اور وصل و فصل کی متعدد داستانیں رقم ہوئیں، چنانچہ جماعتِ اسلامی سے وابستگی بھی ہوئی اور پھر سوا دو سال کے بعد علیحدگی بھی۔ مزید برآں دو مرتبہ کراچی نقل مکانی ہوئی، ایک بار ۱۹۵۸ء میں اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے نئی رفاقت کی تلاش میں، اور دوسری بار ۱۹۶۲ء میں ایک مشترک خاندانی کاروبار کے سلسلے میں ـــــ لیکن الحمدللہ کہ اس پورے عرصے کے دوران ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

کے مصداق درس و تدریسِ قرآن اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ چنانچہ ساہیوال میں تو نہ صرف یہ کہ مقامی طور پر میرے درسِ قرآن کا ڈنکا بج گیا تھا بلکہ آس پاس کے شہروں اور قصبوں یعنی اوکاڑہ، پاکپتن، چیچہ وطنی اور عارف والہ میں بھی ماہانہ درسِ قرآن کا سلسلہ چل نکلا تھا ـــــ اسی طرح کراچی میں بھی کبھی ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی مرحوم کے زیرِ اہتمام ـــــ اور کبھی خود اپنے ہی انتظام و انصرام میں درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا ـــــ مزید برآں، کراچی کی پہلی نقلِ مکانی کے دوران راقم نے مولانا افتخار احمد بلخی مرحوم سے تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصّہ سبقاً سبقاً پڑھا اور دوسری نقلِ مکانی کے دوران اُن ہی کے اصرار پر کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ۱۹۶۵ء میں ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کر لیا۔ (جس میں اتفاقاً یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن بھی آ گئی!)

۱۹۶۵ء ہی کے وسط میں راقم الحروف غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد کے پختہ ارادے، اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کی منظّم منصوبہ بندی کے عزمِ مصمّم کے ساتھ دوبارہ واردِ لاہور ہوا۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن یہی دو کام میری زندگی کا مرکز و محور رہے ہیں۔ اور اِن پچیس سالوں کے دوران، الحمدللہ، ثمّ الحمدللہ، کہ میرے اوقات اور میری صلاحیتوں اور توانائیوں کا اکثر و بیشتر حصّہ اصلاً غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد، اور عملاً تعلّم و تعلیمِ قرآن کی مساعی میں صَرف ہوا ہے۔

اِس رُبع صدی کے پہلے پانچ سالوں کے دوران تو ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقّت بھی، کیا طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی!

کے مصداق میڈیکل پریکٹس کا تسمہ بھی لگا رہا ـــــــ بعد کے بیس سالوں کے دَوران تو ع
"جو لکھا پڑھا تھا نیازؔ نے اُسے صاف دِل سے بھلا دیا !" ــــــ اور ع " وہ جو قرض رکھتے تھے
جان پر وہ حساب آج چکا دیا !" کے مصداق یہ 'تہمت' بھی باقی نہ رہی۔ اور 'نیتوں' کا معاملہ تو
اللہ ہی کے حوالے ہے، کم از کم ظاہری اور خارجی اعتبار سے اس پورے عرصے کے دَوران
راقم 'ہمہ وقت' اور 'ہمہ وجوہ' اِن ہی مقاصدِ عظیمہ کے لیے 'وقف' رہا۔ اور ناگزیر استراحت' اور
ضروری علائق وحوائجِ دنیوی کے سوا راقم کے وقت کا کوئی لمحہ' اور اُس کی صلاحیّت اور
توانائی کا کوئی شمّہ حصُولِ دنیا یا تلاشِ معاش کی مساعی میں صرف نہیں ہوا ! فللہ الحمد والمِنّۃ !!

اور اب جبکہ راقم کی عمر شمسی حساب سے 'اٹھاون' اور قمری تقویم سے ساٹھ برس ہو اچاہتی
ہے ـــــــ اور راقم کی قلبی کیفیت فی الواقع وہی ہے جو انشاء اللہ خاں انشاؔ کے اس شعر میں
بیان ہوئی کہ ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں   بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیّار بیٹھے ہیں !

اور میں واقعتہً اپنے آپ کو الفاظِ قرآنی : " وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ
لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ " (الواقعہ: ۸۵) کے مصداق عالمِ آخرت سے قریب تر اور عالمِ دُنیا سے
ذہناً اور قلباً بعید اور منقطع محسوس کرتا ہوں ـــــــ جب کبھی تنہائی میں اپنی گزشتہ زندگی خصوصاً اُس
کے چالیس سالہ شعوری دَور پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ـــــــ اوّلاً تو نہ صرف یہ کہ اپنے باطن میں نہایت
گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ ع " جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے !"
بلکہ قلب وروح کی سرزمین پر ایک جانفزا فرحت اور مسرّت آمیز انبساط کی تسکین بخش پھوار سی پڑتی
محسوس ہوتی ہے کہ ع " شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم !" ـــــــ اور اس کے معاً بعد
قلب کی گہرائیوں سے شکرِ الٰہی اور حمدِ خداوندی کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے کہ یہ سب اُسی تعالیٰ کا فضل وکرم
اور اُسی تعالیٰ کی توفیق وتیسیر ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم !! ـــــــ بلکہ یہ تو ایک مشہور مقولہ ہے جو غیر
ارادی طور پر قلم سے ٹپک پڑا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ میرے حقیقی اور واقعی احساس کی تعبیر سے قاصر
ہے، اس لیے کہ، بحمد اللہ، میرے سامنے تو ہر آن یہ حقیقت رہتی ہے کہ : " هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ

اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى " (النّجم : ۳۲)

قارئین میرے اس اظہارِ اطمینان وانبساط کو کسی تعلّی، یا تکبّر، یا اعجابِ نفس پر محمول نہ کریں اس لیے کہ راقم کے نزدیک اس حقیقت کا شعور وادراک تو ایمان کا صرف ابتدائی درجہ ہے کہ انسان کا کوئی ارادہ اللہ تعالیٰ کی توفیق وتیسیر کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ کے فضل و کرم سے راقم الحروف کو تو اِس امر کا بھی حق الیقین حاصل ہے کہ خود انسانی ارادہ بھی سراسر مشیّتِ الٰہی کے تابع ہے اور کسی نیک کام کی توفیق وتیسیر ہی نہیں، اُس کے ارادے کی ابتدائی تحریک بھی اُسیؒ کی جانب سے ہوتی ہے ——— گویا معاملہ صرف " لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ " ——— اور " لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ " ہی کا نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر " وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ " (الدھر: ۳۰) کا ہے!! ——— اور میرے نزدیک " ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ " (طٰہٰ : ۴۰-۴۱) کی کیفیت صرف حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ہی کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ مبدءِ فیّاض کی جانب سے جس انسان کو بھی کسی خیر کی توفیق ارزانی ہوتی ہے اس کے معاملے میں کسی نہ کسی درجے میں اِسی کیفیت کا انعکاس موجود ہوتا ہے!

اور " من آنم کہ من دانم "! کے مصداق، ظاہر ہے کہ، یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کہاں کہاں سے بچا کر لایا ہے، کن کن مراحل پر اُس نے میری دستگیری فرمائی ہے، اور کن کن مواقع پر اُس نے مجھے گویا دھکیل کر اپنی راہ پر لگایا، اور کسی دوسری جانب متوجّہ ہونے سے روکا ہے!

لٰہذا میرا اظہارِ مسرّت ہرگز کسی جذبۂ تفاخر ومفاخرت کی بنا پر نہیں، بلکہ محض " تحدیثاً للنّعمة " ہے ——— اور شکرِ خداوندی، اور " وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ " (الضّحیٰ: ۱۱) کی تعمیل کے علاوہ اگر کوئی اور جذبہ اس میں شامل ہے تو وہ بھی " فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ " (التوبہ : ۱۱۱) اور " فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا " (یونس: ۵۸) کے سوا کچھ نہیں۔

تو کیسے ممکن ہے کہ میں اظہارِ مسرّت نہ کروں، بلکہ خوشیاں نہ مناؤں اس پر کہ اللہ تعالےٰ

نے اپنے ایک عاجز اور ناچیز بندے کو جس نے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی، اور جو کالج کی سطح پر نہ کبھی ادب یا فلسفہ کا طالب علم رہا، نہ عمرانیات یا اسلامیات کا، بلکہ سائنس اور طب کی تحصیل میں مصروف رہا ـــــ "اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ" کے مصداق اپنی کتاب حکیم کے علم و حکمت اور خاص طور پر اس کی دعوت کی نشر و اشاعت کے لیے اس درجہ "خالص" کر لیا کہ اسے "ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم۔ اِلّا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم!" کے مصداق تعلیم و تعلّمِ قرآن کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے کوئی دلچسپی نہ رہی، اور پھر اس کے درسِ قرآن کو اتنا قبولِ عام بخشا کہ وہ

"عوامی درسِ قرآن"

کے اُس خواب کی عملی تعبیر بن گیا جو لگ بھگ نصف صدی قبل چودھویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم نے دنیا سے رحلت کے قریب دیکھا تھا! ع "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!"

رہا شکرِ خداوندی، تو واقعہ یہ ہے کہ اگر میرے ہر بُنِ مو ہی نہیں جسم کے ہر خُلیے کو زبان عطا ہو جائے جو ہر لحظہ اور ہر آن حمد و تسبیح میں مشغول رہے، تب بھی اللہ تعالیٰ کے اُس احسانِ عظیم اور فضلِ کبیر (جو یقیناً "اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا" ــ بنی اسرائیل: ۸۷ ہی کا ایک ادنیٰ عکس ہے) کے شکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا جو اس عبدِ ضعیف پر اس صورت میں ہوا کہ اس تعؔ نے اوّلاً اسے اپنی اُس کتابِ عزیز کے علم و فہم اور ہدایت و حکمت کے ساتھ ذہنی اور قلبی مناسبت عطا فرمائی جسے خود اُس تعؔ نے "اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o" کی رُو سے اپنی شانِ رحمانیت کا مظہرِ اعظم قرار دیا ہے، اور پھر اُسے اس دَور میں کم از کم اُردو سمجھنے والے لوگوں کی حد تک "خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ o" کی عملی تفسیر بنا دیا۔ اور اس "بیانُ القرآن" کے لیے اُس کے ذہن اور زبان کی گرہوں کو اس طرح کھول دیا کہ بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں ہزاروں انسان اس کے درسِ قرآن کو مسلسل دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے تک بالکل ساکن و ساکت اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور اُن کی دلچسپی بجائے کم ہونے کے بڑھتی چلی جاتی ہے!

ناواقف حضرات ان الفاظ کو یقیناً مبالغے پر محمول کریں گے، لیکن اس تحریر میں اس

حقیقتِ واقعی کے مفصّل شواہد پیش کرنا ممکن ہے نہ مطلوب! البتہ وہ ہزاروں اشخاص جنہوں نے کبھی لاہور میں مسجد خضرا یا مسجد شہداء کے اتوار کی صبح کے ہفتہ وار درسِ قرآن کا منظر دیکھا ہے، یا جنہوں نے کراچی کی بے شمار مساجد میں درسِ قرآن کے اجتماعات، اور اُن پر مستزاد تاج محل ہوٹل کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں "شامِ الہدیٰ" کی نشستوں میں سے کسی میں شرکت کی ہے، یا جنہیں ستمبر ۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو (کینیڈا) کے چودہ روزہ درسِ قرآن کی کیفیات کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، یا جنہوں نے دسمبر ۱۹۸۵ء میں ابوظبی کے ہفت روزہ مجالسِ درس کے شرکاء کے جوش و خروش اور ہجوم و اژدہام کی جھلک دیکھی ہے —— اور سب سے بڑھ کر جنہوں نے اپریل ۱۹۸۴ء میں مکّہ مسجد، حیدرآباد (دکن) کا منظر دیکھا ہے جہاں مسلسل تین دن محتاط ترین اندازے کے مطابق پندرہ ہزار مردوں اور پانچ ہزار خواتین نے ڈھائی ڈھائی گھنٹے کے خطباتِ قرآنی میں انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کی تھی، وہ گواہی دیں گے کہ مبالغے کا کیا سوال، مندرجہ بالا الفاظ تو ان مجالس کی واقعی کیفیات کی بدرجۂ ادنیٰ ترجمانی سے بھی یکسر قاصر ہیں!

اسی طرح پاکستان ٹیلیویژن پر لگ بھگ چار سال تک راقم کے 'بیان القرآن' کا جو ڈنکا بجتا رہا اس کی حسین اور خوشگوار یادیں، اس کی بندش پر ساڑھے سات سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود، لاکھوں نہیں کروڑوں لوگوں کے قلوب و اذہان میں اب تک تازہ ہیں۔ چنانچہ مسلسل تین سال تک پورے ماہ رمضان مبارک کے دوران افطار سے متصلاً قبل "الکتٰب" اور "الٓمّٓ" کروڑوں بندگانِ خدا کے لیے "نُورٌ علٰی نُورٍ" کے مصداق روزہ کی برکات پر مستزاد روح کی بالیدگی کا سامان فراہم کرتے رہے، اسی طرح "حکمت و ہدایت" کے ذریعے ذہن و فکر کو قرآنی غذا ملی، تو "رسولِ کاملؐ" کے ذریعے قرآنی فلسفۂ رسالت، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت کے اختتام اور رسالت کی تکمیل کے عملی تقاضوں کے شعور کی خوشبو سے پاکستان کی فضائیں معطر ہوئیں ——

اور سب سے بڑھ کر جب مسلسل پندرہ ماہ تک ہر ہفتے "الھدیٰ" کے ہدایت آفریں اور ایمان پرور نغموں سے پاکستان کا طول و عرض وجد میں آگیا (اس لیے کہ یہ پروگرام پورے پاکستان میں نیشنل ہک اَپ پر پاکستان کے تمام ٹیلیویژن اسٹیشنوں سے بیک وقت ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا) —— تو ایک جانب اسے جو قبولِ عام حاصل ہوا، اور اس سے جو شہرت راقم کو حاصل ہوئی اس کی مقدار اتنی زیادہ

تھی کہ راقم کو اپنے بارے میں فتنہ و استدراج کے اندیشے لاحق ہو گئے ـــــ اور دوسری جانب "میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں۔ غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں!" کے مصداق الحاد اور اباحیت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا اور مغرب کی مادر پدر آزاد تہذیب کے دلدادہ مردوں اور عورتوں کی جانب سے الامان والحفیظ کا شور اُسی طرح بلند ہوا جس طرح کبھی حضرتِ موسیٰؑ کی للکار سے فرعون اور اس کے حواریوں کے ایوانوں میں "وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ" کی دُہائی کی صورت میں ہوا تھا ـــــ یعنی "یہ دونوں (موسیٰؑ اور ھٰرونؑ) چاہتے ہیں کہ تمہاری مثالی تہذیب کو تباہ اور تمہارے قابلِ فخر تمدن کو ملیامیٹ کر دیں، پس اپنی پوری قوت کو مجتمع کرو اور ان کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہو! گویا بقول اقبالؔ ؎ "نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!"[۱]

تو کیسے ممکن ہے کہ میری روح وجد میں نہ آتے اور میں اپنے باطن میں اُس کیفیت کے حامل "رقصِ جاں" کا مشاہدہ نہ کروں جس کا نقشہ عُرفی نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے کہ ؎

چہ خوش رقصید عُرفی بر درِ کاشانۂ وحدت — برہمن گفت ایں کافر چہ استادانہ می رقصد!

جبکہ میرے علم میں مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی یہ 'خبر' بھی ہے کہ:

"مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللهِ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلٰئِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ"[۲]

بلکہ اس 'خبر' سے بڑھ کر وہ 'ضمانت' بھی ہے جو اُس طویل حدیث کے آخر میں وارد ہوئی

---

[۱] اس پر بھی اللہ کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے اس آزمائش میں بھی مجھے کامیابی عطا فرمائی اور میں نے ٹی وی سے مستقل انقطاع قبول کر لیا لیکن اپنے موقف میں کوئی لچک پیدا نہ کی!

[۲] مسلم عن ابی ہریرۃؓ: "جب بھی کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اس کی کتاب پڑھتے اور آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہیں تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے، رحمتِ خداوندی ان پر سایہ کر لیتی ہے، فرشتے اُن کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ اپنے (ملائکہ و ارواحِ مقربین کے سامنے کرتا ہے"

ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشاد فرمانے پر کہ: "إِنَّهَا ستكونُ فتنةٌ" (عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوگا) جب حضرت علیؓ نے سوال کیا: "ما المخرجُ منها يا رسول الله؟" (اے اللہ کے رسولؐ اس سے بچ نکلنے کا راستہ کون سا ہوگا؟) تو اس کا کافی و شافی جواب تو آپؐ نے دو الفاظ میں ادا فرما دیا یعنی "كِتَابُ الله" لیکن اس کے بعد اس کی مزید تشریح کے طور پر آپؐ نے کتاب اللہ کی مدح اور اس کی عظمت کے بیان میں فصاحت و بلاغت کے جو موتی پروئے ان میں خود قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا کامل عکس موجود ہے ——— اور جہاں اس 'بیانِ عظمتِ قرآن' کے تین تین حسین جملوں پر مشتمل یہ حصے بھی لائقِ حفظ ہیں کہ:

- فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ
- وَهُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ
- لا تنقضي عجائبُهُ ولا يَشْبَعُ منهُ العلماء ولا يخلَقُ عن كثرةِ الرّدّ
- مَنْ قال بهِ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بهِ أُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ

وہاں آخری نوید جانفزا تو اس قابل ہے کہ ہر خادمِ قرآن اسے حرزِ جاں بنا لے ——— یعنی:

"وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"[1]

---

[1] جامع ترمذیؒ و سنن دارمیؒ: " ● اس میں تم سے پہلے گزر جانے والوں کی اطلاعات بھی ہیں، اور تمہارے بعد پیش آنے والے حالات کی خبر بھی ہے اور تمہارے مابین ہونے والے جملہ اختلافات اور نزاعات کا حل بھی ہے۔ ● یہی اللہ کی مضبوط رسی ہے، اور یہی حکمت بھرا ذکر ہے، اور یہی صراطِ مستقیم ہے ● اس کی رعنائیاں کبھی ختم نہ ہوں گی اور اہلِ علم اس سے کبھی سیر نہ ہوں گے اور بار بار پڑھنے کے باوجود اس پر باسی پن طاری نہ ہوگا ——— ● جس نے اس کی بنیاد پر کوئی بات کی اُس نے سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اس کا اجر محفوظ ہے، اور جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا ——— (اور سب سے بڑھ کر یہ کہ) جس نے اس کی جانب دعوت دی (خواہ کسی اور کو اس سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو) خود اُس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہو گئی!!!

ان بشارتوں اور ضمانتوں پر بھی اگر کوئی 'داعی الی القرآن' فرطِ مسرت سے جھوم نہ اُٹھے تو یا تو اس کا وعظ و درس خالص ریاکاری پر مبنی ہے، اور اس کا ضمیر اسے متنبہ کرتا رہتا ہے کہ تم ساری دوڑ دھوپ خالصتًا لوجہ اللہ نہیں کر رہے، یا اس کی ساری تگ و تاز صرف عقل اور حواس کی وادیوں تک محدود ہے، اور ع "گزر اُن کا ہوا کب عالمِ اللہ اکبر میں!" کے مصداق قلب کی اُس وادی میں اس نے قدم ہی نہیں رکھا جہاں فطرت سلیمہ کی گہرائیوں سے شکر و حمد کے چشمے اُبلتے ہیں اور انشراح و انبساط کے پھول کھلتے ہیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ "يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا" (النحل: ۸۳) کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں ـــــ اعاذنا اللہ من ذٰلک!

معذرت خواہ ہوں کہ بات ع "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مطابق طویل ہو گئی۔ حاصلِ کلام یہ کہ عمر کے اعتبار سے "شامِ زندگی" کے اُس دَور میں قدم رکھتے ہوئے جس کے بعد "صبحِ دوامِ زندگی" ہی کے طلوع کا انتظار ہے، راقم بحمد اللہ اپنے ماضی کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہے کہ ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!" اور ع "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!" ـــــ اور ایک عربی مصرعے "وَاَرْجُوْهُ رَجَاءً لَا يَخِيْبُ" کے مصداق راقم کو اُمید واثق ہے کہ جس تعؐ نے توفیق عطا کی، اور تیسیر فرمائی، وہ شرفِ قبول بھی ضرور عطا فرمائے گا۔

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ[1]

راقم پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم یہ ہے کہ جس کام میں اُس نے اپنی متاعِ زیست صرف

---

[1] النمل: ۱۹۔ "اے میرے ربّ، مجھے ہمت عطا فرما کہ میں تیرے اس فضل کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا، اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں وہ کام کروں جو تجھے پسند ہوں، اور اپنی رحمت کے طفیل مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما لے!"

ترلیسٹھ[٩٣]، اور ۱۹۸۷ء کے ایک ایک گھنٹے کے تراسی[٨٣] کیسٹوں کے سیٹ سینکڑوں کی تعداد میں تو ہمارے اپنے اہتمام میں تیار ہو کر پھیل چکے ہیں۔ آگے یہ کہاں کہاں تک پہنچے اس کا حساب صرف اللہ کے پاس ہے۔

ان کے علاوہ بے شمار دینی موضوعات پر میری لاتعداد تقاریر آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں میں محفوظ ہیں، اور گاہے گاہے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے جو راقم سے اپنا ابتدائی تعارف ہی اس حوالے سے کراتے ہیں کہ "میرے پاس آپ کے تین صد، یا چار صد، یا پانچ صد کیسٹ موجود ہیں"!

بصری (ویڈیو) کیسٹوں کا سلسلہ دیر میں شروع ہوا تھا ——— اور میرے علم کی حد تک اس کا پہلی بار خصوصی اہتمام رفقائے ابوظبی نے دسمبر ۱۹۸۵ء میں کیا تھا۔ وہاں کے نو[٩] روزہ پروگرام کے جو ویڈیو تیار ہوئے ان کا فنی معیار بہت بلند تھا، ——— لہٰذا وہ بھی ٹورنٹو کے آڈیوز کی طرح بہت بڑی تعداد میں لوگوں تک پہنچے ——— چنانچہ اُن کے حوالے سے کبھی کوئی خط جنوبی ہند اور سیلون سے آجاتا ہے تو کبھی جنوبی افریقہ سے، اور کبھی آسٹریلیا سے آجاتا ہے تو کبھی یورپ کے کسی ملک سے! وقِس علیٰ ذٰلک!

اس کے بعد سے ویڈیو ریکارڈنگ کا سلسلہ بھی بڑے پیمانے پر چل نکلا۔ چنانچہ اس وقت صرف لاہور میں تیار ہونے والے تین تین گھنٹے کے ویڈیو کیسٹوں کے ایک[١٨٣] صد چار اسی نسخے (MASTER COPIES) دفتر انجمن میں موجود ہیں۔ جن میں اہم ترین سیٹ ۱۹۸۷ء کے مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن، سورۂ قٓ سے سورۂ مزمل تک کے مسلسل درسِ قرآن، اور مارچ ۸۹ء کے محاضراتِ قرآنی کے پروگرام میں ہونے والے 'اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی' کے خطبات پر مشتمل ہیں۔ ان پر ایک مستقل قسم (CATEGORY) کا اضافہ کر لیا جائے کہ اندرونِ ملک گزشتہ بیس سالوں کے دوران جن بے شمار شہروں اور قصبوں کے دورے میں نے کیے اُن کے دروس اور خطابات اور گزشتہ دس سالوں کے دوران امریکہ، یورپ، بھارت، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے جو بیسیوں دورے میں نے کیے اور ان کے دوران سینکڑوں شہروں میں درس دیئے یا تقاریر کیں اُن کے جو آڈیو اور ویڈیو کیسٹ مقامی حضرات نے تیار کیے اور اُن کی جو نقول وہاں گردش میں ہیں اُن کا حساب بھی صرف عالم الغیب والشہادہ کے علم میں ہے!

اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ " فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا۔ یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک !" راقم کو یقین ہے کہ قرآن کی وہ انقلابی دعوت جو ان لاکھوں کیسٹوں کے ذریعے پورے کرۂ ارضی پر گونج رہی ہے[1] ہرگز بے نتیجہ اور غیر مؤثر نہیں ہوسکتی، اور جس طرح ایران کے انقلاب کو دنیا نے " کیسٹ ریوولیوشن" قرار دیا تھا اسی طرح، انشاء اللہ العزیز مستقبل کے اسلامی انقلاب اور اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں راقم کے دروس و خطباتِ قرآنی کے یہ کیسٹ مؤثر اور فیصلہ کن رول ادا کریں گے —— اور اوّلاً تو، جیسے کہ میں نے اپنی تالیف 'استحکامِ پاکستان' میں دلائل و شواہد کی بنیاد پر عرض کیا ہے، اِس عالمی اسلامی انقلاب کا نقطۂ آغاز سلطنتِ خداداد پاکستان ہی بنے گا۔ لیکن اگر ہماری شامتِ اعمال سے پاکستان یہ سعادت حاصل نہ کرسکا تب بھی " فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ " (الانعام : ۸۹) کے مطابق اللہ تعالیٰ ان کیسٹوں کے ذریعے پھیلنے والی دعوتِ قرآنی کو کسی اور زمین میں بار آور فرمائے گا —— اس لیے کہ بحمد اللہ یہ وقت کے ذہنی و فکری تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے اور قلب و روح کے تغذیہ و تقویت کا بھی پورا سامان رکھتی ہے،

---

[1] ان کیسٹوں کے 'پھیلاؤ' کی وسعت کا کسی قدر اندازہ دو واقعات سے ہوسکتا ہے جو راقم کے حالیہ دورۂ امریکہ اور سفرِ بھارت کے دوران پیش آئے۔ (۱) سیراکیوز (امریکہ) میں جماعتِ اسلامی ہند کے قیّم جناب محمد افضل کے صاحبزادے ڈاکٹر عمر افضل سے ملاقات ہوئی تو اثنائے گفتگو میں ایک اسلامی تحریک کے سربراہ کا ذکر آگیا، میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ میں نے سُنا ہے کہ وہ میرے کیسٹ بہت سنتے ہیں تو عمر افضل صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے: " آپ کے کیسٹ کون نہیں سنتا ہے اور کس کے پاس نہیں ہیں"۔
(۲) حیدر آباد دکن میں اکتوبر ۱۹۸۹ء کی پندرہ، سولہ اور سترہ تاریخوں کو گاندھی بھون کے پرکاشم ہال میں جو خطبات راقم نے " امتِ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل" کے موضوع پر دیئے ان کے کیسٹ روز کے روز تیار ہو رہے تھے، اور پہلے دن کے کیسٹ اگلے روز بِک جاتے تھے۔ آخری روز معلوم ہوا کہ گزشتہ روز کے خطاب کے سات سو کیسٹ تیار ہوسکے تھے جو سب کے سب بِک گئے، اور مانگنے والے ابھی باقی تھے لہٰذا بہت سے حضرات محروم رہ گئے! فللہ الحمد والمنّۃ!

اگرچہ سب کچھ ہے محض اللہ کی دین، اور اس کا کرم ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

تعلّم و تعلیمِ قرآن کی جس تحریک میں راقم الحروف نے اپنی حیاتِ مستعار کے پچیس سال بفضلِ ایزدی بالکل اُسی کیفیت کے ساتھ لگائے ہیں جسے انگریزی ضرب المثل میں شمع کو دونوں طرف سے جلانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے مستقبل کے ضمن میں راقم کی 'رجائیت' کی دوسری اساس یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی عنایت و رحمت سے گزشتہ دس سال کی مساعی کے نتیجے میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہو چکی ہے جو بتوفیق و تیسیرِ خداوندی اس شمع کو روشن رکھنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کی صلاحیت سے قابلِ اطمینان حد تک بہرہ ور ہو چکے ہیں ــــــ لہٰذا اُمّید واثق ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس شمع کی روشنی کم نہیں ہوگی بلکہ اس کی آب و تاب اور ضیا پاشیوں میں یَوْمًا فَیَوْمًا اضافہ ہوتا چلا جائے گا ــــــ اور اگرچہ راقم ان سب نوجوانوں کو بیٹوں ہی کی طرح عزیز رکھتا ہے، تاہم "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" کے مصداق یہ راقم پر اللہ تعالےٰ کے 'فضل بر فضل' کا مظہر ہے کہ ان میں راقم کے اپنے تین صلبی بیٹے بھی شامل ہیں[1] "ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَیْنَا وَ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ" (یوسف: ۳۸)

---

[1] میرے فرزندِ اکبر ڈاکٹر عارف رشید سلمہٗ نے تو بحمد اللہ میرے 'اتباع' کا حق ادا کر دیا کہ بالکل میرے ہی مانند ایم بی بی ایس پاس کر کے میڈیسن کی لائن تج دی اور ہمہ تن و ہمہ وقت اسی تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن سے منسلک ہو گئے، اور اس وقت قرآن اکیڈمی کے جملہ انتظامی امور کی نگرانی کے علاوہ ہر ہفتے چار مقامات پر درسِ قرآن کے علاوہ ایک جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ بھی دے رہے ہیں۔ اور اس طرح گویا 'جوابِ شکوہ' کے اس شعر کا مصداق بن گئے ہیں کہ ؎ "باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو، پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیونکر ہو"؟ دوسرے بیٹے حافظ عاکف سعید سلمہٗ نے بھی ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد اسی تحریک سے ہمہ تن و ہمہ وقت وابستگی اختیار کر لی۔ چنانچہ بحمد اللہ درس بھی دے رہے ہیں اور 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن' کی ادارت کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

واضح رہے کہ یوں تو گزشتہ ربع صدی کے دوران جن لوگوں نے راقم کے دروس کے ذریعے اُس کے فکرِ قرآنی کو کماحقہٗ اخذ کیا، اور بالخصوص مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کے ذریعے دین کے ہمہ گیر تصوّر کے ساتھ ساتھ فرائض دینی کے جامع تصوّر کو بھی علیٰ وجہ البصیرت قبول کیا اُن کی تعداد ہزاروں میں ہے ـــــــ اور ان میں ایک خاصی قابلِ لحاظ تعداد ایسے حضرات کی بھی ہے جو بوجوہ راقم کے ساتھ کسی تنظیمی سلسلے میں منسلک نہیں ہوئے لیکن اپنے طور پر قرآنِ حکیم کے اس انقلابی فکر کو عام کر رہے ہیں۔ چنانچہ گاہے گاہے ایسے حضرات سے ملاقات ہوتی ہے تو ایک قلبی مسرّت اور روحانی سکون حاصل

(گزشتہ سے پیوستہ)

علاوہ طباعت واشاعت کے جملہ کاموں کی نگرانی بھی اُن کے فرائض میں شامل ہے۔ مزید برآں قرآن کالج میں فلسفہ کی تدریس بھی کر رہے ہیں۔ تیسرے بیٹے حافظ عاطف وحید اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی اکنامکس امتیازی حیثیت میں پاس کر کے قرآن کالج میں بحیثیت لیکچرر کام کر رہے ہیں چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے عزیزم آصف حمید ابھی ایف ایس سی میں زیرِ تعلیم ہیں اور اگرچہ فی الحال کھیل کود کی جانب زیادہ رجحان رکھتے ہیں تاہم اللہ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ وہ تعؔ مجھے ان کے بارے میں بھی محروم نہیں رکھے گا! (ویسے یہ عجیب اتفاق ہے کہ عزیزم آصف کی ولادت میری عین چالیسویں سالگرہ کے دن ہوئی یعنی ۲۶ اپریل ۷۲ء کو، اور اُن کی مزید 'خوش نصیبی' کی علامت یہ ہے کہ اُس روز ماہ ربیع الاوّل کی پاکستان کے حساب سے گیارہ اور عالمِ عرب کے حساب سے بارہ تاریخ تھی۔)

اپنی اولادِ نرینہ کے بارے میں ایک اور راز کی بات بھی عرض کر ہی دوں۔ راقم کو اللہ نے جب بھی حرم کی حاضری کا موقع عنایت فرمایا، طواف کی مستقل دعاؤں میں یہ دعا ہمیشہ شامل رہی کہ: "اے ربّ! تیرے علم میں مجھے جو بھی نسبت (خواہ ہزار میں ایک، خواہ لاکھ میں ایک) حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہے، وہی نسبت میرے بیٹوں کو حضرت مجدّدؒ کے عالی قدر صاحبزادوں اور شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں کے ساتھ عطا فرما دے ـــــــ وَلَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا!" اور مجھے اپنے رب کی بے پایاں رحمت سے امید واثق ہے کہ وہ مجھے مایوس ومحروم نہیں کرے گا!

ہوتا ہے[۱]۔ اسی طرح ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بھی کم از کم پچاس کی تعداد میں ہیں جنہوں نے قرآن اکیڈمی کی ڈو سالہ تدریسی سکیم سے منسلک ہو کر عربی گرامر اور ترجمۂ قرآن کے ساتھ ساتھ قرآن کے اس انقلابی فکر کی باضابطہ تحصیل کی ہے ——— تاہم ابھی ایسے نوجوان جنہوں نے اس تعلّم و تعلیمِ قرآن ہی کو ایک مشن کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہو بیس سے زیادہ نہیں ہے ——— اگرچہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے امیدِ قوی ہے کہ اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو گا اور اس طرح اس خواب کی عملی تعبیر بھی سامنے آجائے گی جو مولانا ابو الکلام آزاد نے ۱۹۱۵ء میں دیکھا تھا۔ یعنی :

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ صادقین کا فقدان اور علماءِ سوء و مفسدین دجالین کی کثرت ——— رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا"

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ

---

[۱] اس کی ایک دلچسپ مثال قارئین کے لیے مفید ہوگی۔ ایک روز میں اسلام آباد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں پرواز کی روانگی کے انتظار میں تھا کہ ایک عمدہ لباس میں ملبوس صاحب آ کر میری برابر والی نشست پر بیٹھ گئے، اور مجھ سے سوال کیا: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہے" میں نے عرض کیا کہ صورت تو کچھ شناسا سی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر انہوں نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں بہت اعلےٰ عہدے پر فائز ہیں اور بہت عرصہ قبل میرے مسجد خضرا سمن آباد کے درس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنا بریف کیس کھول کر مجھے منتخب نصاب کے ایک درس کے عربی متن کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں دکھائیں اور بتایا کہ "میرا معمول ہے کہ جب بھی کہیں سرکاری دورے پر جاتا ہوں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد لوگوں کو جمع کر کے آپ کے مرتّب کردہ نصاب کے اسباق کا درس دیتا ہوں اور یہ سلسلہ میں نے کئی سال سے شروع کر رکھا ہے!" ——— اب ظاہر ہے کہ یہ تو بقول "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں!" کے مصداق صرف ایک مثال ہے!

میں جواب ملنا چاہیے کہ "لَا یَصْلَحُ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا" یعنی امتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہوسکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآنِ حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔"

——— (ماخوذ از 'البلاغ' جلد اوّل، شمارہ اوّل مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

مولانا آزاد مرحوم نے اسی مقصد کے لیے ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں 'دارالارشاد' قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اُن کی دوسری سیاسی و ملّی سرگرمیوں نے انہیں اُس کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ دی اور 'دارالارشاد' جلد ہی ع "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند!" کی تصویر بن گیا۔ یادش بخیر، لگ بھگ بیس بائیس برس بعد 'قرآن اکیڈمی' کے دوسالہ تدریسی کورس سے ملتے جلتے پروگرام کے تحت علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق اُن کے ایک معتقد اور دین و ملت کے دردمند شخص چوہدری نیاز علی خاں نے پٹھانکوٹ کے قریب سرنا ریلوے سٹیشن سے متصل 'دارالاسلام' قائم کیا تھا۔ لیکن مشیّتِ الٰہی سے علامہ اقبال اس ادارے کے قیام کے فوراً بعد انتقال فرما گئے اور تعمیر شدہ عمارات اگرچہ بعض دوسرے مفید مقاصد میں استعمال ہوئیں لیکن علامہ مرحوم کے اصل تصوّر کے مطابق کام کا آغاز بھی نہ ہوسکا۔

راقم کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے ۱۹۶۷ء میں 'قرآن اکیڈمی' کا جو خواب دیکھا تھا، اُس کے لیے ۱۹۷۲ء میں ایک باضابطہ 'انجمن' قائم ہوگئی، ۱۹۷۶ء میں اُس کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، ۱۹۸۲ء میں 'قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم' کا آغاز ہوا، ۱۹۸۴ء میں 'دوسالہ تدریسی اسکیم' شروع ہوئی، اور ۱۹۸۷ء میں قرآن اکیڈمی کی کوکھ سے 'قرآن کالج' برآمد ہوگیا——— راقم کو تو اس میں بھی جھلک نظر آتی ہے اُس تمثیلِ قرآنی کی کہ:

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ط (الفتح: ۲۹)

ویسے راقم کے نزدیک یہ اصلاً علامہ اقبال اور مولانا آزاد ہی کے خوابوں کی تعبیر ہے جو اللہ نے اپنے اس بندۂ ناچیز کے ذریعے ظاہر فرمائی۔ لہٰذا "اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ" کے مطابق اجر و ثواب میں بڑا حصّہ انہی کا ہے!

اور اب کچھ باتیں پیشِ نظر تالیف کے شمولات کے بارے میں!

جیسے کہ 'انتساب' سے ظاہر ہے یہ تالیف میں نے اصلاً اُن نوجوانوں ہی کے لیے مرتّب کی ہے جو حدیثِ نبوی: "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا لیں۔ ان شاء اللہ العزیز ایسے نوجوانوں کو اِس کے ذریعے اُن موجود الوقت علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی ظروف و احوال کا فہم و شعور بھی حاصل ہو جائے گا جن میں انہیں 'دعوت اِلی القرآن' کا فریضہ سر انجام دینا ہے' اور ع "اپنی خودی پہچان!" کے مصداق اپنی اُس نسبتِ عالیہ کا ادراک بھی ہو جائے گا جو خدمتِ قرآن کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کے ناطے انہیں گزشتہ تین صدیوں کے اُن اعاظمِ رجال سے حاصل ہو گئی ہے جنہوں نے 'دعوت رجوع اِلی القرآن' کے شجرۂ طیبہ کی آبیاری کی ہے ــــــ مزید برآں اللہ کے ایک بندۂ حقیر کی سرگزشت کے حوالے سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اگر طلبِ صادق اور عزمِ راسخ ہو تو اللہ تعالیٰ ع "ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں!" کے مصداق کیسی کیسی عنایتیں فرماتے ہیں' اور اپنے اس حتمی وعدے کے مطابق کہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت: ۶۹) کیسے کیسے راستے کھولتے چلے جاتے ہیں۔ اور "وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ" (الحج: ۴۰) کی کیسی کیسی صورتیں سامنے آتی ہیں!

بنابریں یہ کتاب تین حصّوں پر مشتمل ہے جن میں متذکرہ بالا معنوی ترتیب کے علاوہ ایک تاریخی ترتیب بھی ہے' یعنی حصّہ اوّل میں میری وہ تحریر شامل ہے جو میں نے ۱۹۶۷ء میں سپردِ قلم کی تھی' حصّہ دوم میری اُن تحریروں پر مشتمل ہے جو ۷۶-۱۹۷۵ء کے دَوران مختلف اوقات میں ضبطِ تحریر میں آئیں[1]' جبکہ حصّہ سوم میں وہ تحریر شامل ہے جو اوائل ۱۹۸۹ء میں مرتب ہوئی۔

ان میں سے پہلی تحریر یعنی "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" میری پوری قرآنی تحریک اور جملہ دعوتی و تنظیمی مساعی کے لیے بمنزلہ اساس ہے۔ چنانچہ اسی کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور قرآن اکیڈمی کے منشور (MANIFESTO) کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اب تک ایک

---

[1] یہ مضامین چونکہ جوں کے توں شائع کیے جا رہے ہیں لہٰذا ان میں بعض اُن اشخاص کا ذکر جو اب مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں' زندہ شخصیتوں کے انداز میں کیا گیا ہے۔ قارئین اس معاملے کو نوٹ کر لیں تاکہ دورانِ مطالعہ الجھن نہ ہو!

کتابچے کی صورت میں اردو میں کم و بیش پچاس ہزار اور انگریزی میں لگ بھگ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ چونکہ راقم کے قلم کے رواں نہ ہونے کے باعث بہت مختصر بھی ہے اور کسی قدر مُغلق بھی، بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ یہ محض اشارات پر مشتمل ہے لہٰذا راقم نے بارہا خود اس کا درس متعدد قرآنی تربیت گاہوں اور قرآن اکیڈمی کی مختلف کلاسوں میں دیا ہے ——— الحمدللہ کہ حال ہی میں اس مختصر تحریر کی توضیح و تفصیل پر مشتمل راقم کے لیکچرز کا ویڈیو بھی تیار ہو گیا ہے جو تین تین گھنٹے کے تین کیسٹوں میں مکمل ہو سکا ہے!

حصّہ اوّل میں دوسری تحریر پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی ہے، جو موصوف نے میری تحریر کی تحسین، اور تائید و توثیق کے لیے لکھی تھی۔ جس سے میری تحریر مزید مبرہن بھی ہو جاتی ہے اور اس کے بعض خلا بھی پُر ہو جاتے ہیں! بالخصوص یورپ میں الحاد و مادّہ پرستی کے فروغ اور فی الجملہ مذہب دشمنی کے اسباب بالکل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں!

کتاب کا حصّہ دوم چار ابواب پر مشتمل ہے:

اِن میں سے پہلا باب نہایت مختصر ہے یعنی کُل چھ صفحات پر مشتمل، لیکن یہ میری محبوب ترین تحریروں میں سے ہے۔ اس لیے کہ راقم کا گمان ہے کہ غالباً آج تک کسی نے اس حقیقت کی جانب توجّہ نہیں کی کہ تاریخ اسلام کے قرنِ اوّل ہی میں بعض فطری اور منطقی اسباب کے نتیجے میں توجہات قرآنِ حکیم کی بجائے بعض دوسری چیزوں کی جانب منعطف ہو گئی تھیں اور یہی عمل ہے جو بعد کے ادوار میں تدریجاً بڑھ کر "مہجوریٔ قرآن" اور "قرآن کو چھوڑ دینے" کی اس کیفیت پر منتج ہوا جس کی نشاندہی علاّمہ اقبال اور حضرت شیخ الہندؒ نے کی! ——— لہٰذا اس کتاب کے ہر قاری سے میری یہ تاکیدی گزارش ہے کہ ان صفحات کو توجّہ سے پڑھیں اور ان میں قرآن، ایمان اور جہاد کے مابین جو منطقی ربط بیان ہوا ہے اس پر خصوصی غور کریں۔

دوسرا باب بھی غایتِ اختصار کے باوصف ہندوستان میں اسلام کی پوری تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کر دیتا ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کے بحرِ محیط میں چلنے والی مختلف علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی رَوؤں کی شناخت بھی ہو جاتی ہے اور ان کے تاریخی پس منظر سے آگاہی بھی کسی

بھی تجدیدی سعی وجہد کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ مزید برآں اس میں امّت مسلمہ کی تاریخ کے الفِ ثانی کی پہلی دو صدیوں کی تجدیدی مساعی کا مختصر جائزہ بھی آگیا ہے اور مجدد اللہ حضرت مجدّد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تجدیدی کارناموں کے ساتھ ساتھ اُن کی اپنی شخصیتوں اور رجحانات کا تقابلی مطالعہ بھی بہت خوبصورتی سے آگیا ہے۔ ان میں سے چونکہ 'دعوت رجوع الی القرآن' کا نقطۂ آغاز شاہ ولی اللہؒ کی ذاتِ بابرکات ہے لہٰذا اُن کی 'قرآنی خدمات' کے اجمالی تعارف کے لیے شیخ محمد اکرام صاحب کی 'رودِ کوثر' سے ایک طویل اقتباس بھی اس باب کی زینت ہے۔

تیسرا باب تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کے دوران 'دعوت رجوع الی القرآن' کی پیش قدمی کے جائزے کے علاوہ ہندوستان میں انگریزوں کے ورود کے بعد ملّتِ اسلامی کے لیے جو نئے مذہبی و اعتقادی اور ملّی و سیاسی مسائل پیدا ہوئے ان کے مختصر مگر جامع جائزے پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں جو نہایت قیمتی بلکہ 'نادر' معلومات اس باب میں درج ہیں اُن کے لیے راقم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا مرہونِ منّت ہے، چنانچہ راقم خود بھی اُن کے لیے دست بدعا ہے اور قارئین سے بھی گزارش ہے کہ اُن کے حق میں دعائے خیر کریں۔

چوتھا باب خود راقم الحروف کی 'خوش نصیبیوں' اور 'محرومیوں' کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ جس میں راقم نے ایک جانب اپنی اِس خوش بختی کی تفصیل بیان کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ اُسے علم و فہمِ قرآنی کے چار چشموں سے سیراب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ اس کے ضمن میں راقم نے اپنے 'فکرِ قرآنی' کے چار ابعاد (FOUR DIMENSIONS) کی تفصیل بیان کر دی ہے۔ اس لیے کہ راقم کے درسِ قرآن کی مقبولیت کا راز دراصل اسی میں مضمر ہے کہ اس میں ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوتِ حرکت و جہاد کی للکار بھی موجود ہے، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے تدبّر و تعمّق کا عنصر بھی شامل ہے، پھر ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے سائنسی اور فلسفیانہ فکرِ قرآنی کی خوشہ چینی بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے تمسّک بالاسلاف کا تحفّظ اور تصوّفِ قرآنی کی چاشنی بھی موجود ہے ــــــ (عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ میرے فکری اسلاف میں دو دو شیخین

ہیں، تو دُو ہی 'ابوین' ہیں، اسی طرح دُو ہی 'دکتورین' ہیں اور دُو ہی وہ ہیں جن کے ناموں کے لاحقے یائے نسبتی کی بنیاد پر مشابہ ہیں!)

اس باب کا ایک حصّہ بعض تلخ یادوں پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اُن کو حذف کر دینے سے کتاب کی افادیت میں کوئی کمی نہ ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس انجمن اور اکیڈمی کے تحت تحریک تعلّم و تعلیم قرآن کو آگے بڑھانا مقصود ہے اُس کے داعی اور مؤسّس کے بارے میں ممکنہ اشکالات کا حل، اور بعض بزرگوں کے ضمن میں "وصل و فصل" کی داستان کے حقائق واقعی کی صراحت و وضاحت خود تحریک کے مصالح کے اعتبار سے ناگزیر ہے! اور بحمد اللہ راقم اس پر مطمئن ہے کہ اس تذکرے میں اُس نے ان بزرگوں کے ادب کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور کہیں توہین آمیز انداز اختیار نہیں کیا!

کتاب کا حصّہ سوم حفیظ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎ "تکمیل اور تدوینِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں!" گزشتہ ربع صدی کے دوران تحریک تعلّم و تعلیم قرآن کے ضمن میں جو بھی کچھ راقم الحروف سے بن آیا ہے اُس کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ اس کا اکثر و بیشتر حصّہ لگ بھگ ایک سال قبل راقم الحروف نے خود مرتب کیا تھا جو 'حکمتِ قرآن' کی اشاعت بابت مارچ اپریل ۱۹۸۹ء میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اس میں راقم نے اپنی جدّوجہد اور مساعی کے ابتدائی مراحل کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ خدمتِ قرآن کی اس پاکیزہ وادی کے نَوواردوں کے لیے نشاناتِ راہ واضح ہو جائیں۔ اور ان پر یہ حقیقت کماحقّہٗ منکشف ہو جائے کہ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

اور ؎

طے می شود ایں رہ بدرخشیدنِ برقے ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم!

حصّہ سوم کا آخری جزو عزیزم ڈاکٹر عارف رشید سلمہٗ کا مرتب کردہ ہے جس میں اس تحریک تعلّم و تعلیم قرآن کے اہم ترین ادارے یعنی 'مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور' کی اٹھارہ سالہ کارکردگی کی ایک جھلک بنیادی طور پر اعداد و شمار کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔

آخر میں چند ضمیمے شاملِ کتاب ہیں۔ جن سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ گزشتہ بیس سالوں کے دوران، اللہ کی توفیق و نصرت سے، راقم نے اس دعوتِ قرآنی کے لیے کتنی تندہی اور جانفشانی سے کام کیا ہے اور اس کے لیے کتنی شدید مشقّت جھیلی ہے حالانکہ راقم کی صحت جسمانی کبھی قابلِ رشک نہیں رہی، ایف ایس سی کی تعلیم کے زمانے تک راقم نے نہ کبھی کسی کھیل میں حصّہ لیا تھا نہ کسی تقریری مقابلے یا مباحثے (DEBATE) میں۔ بلکہ راقم ایک منحنی جسم اور خاموش طبع کا حامل نوجوان تھا — لیکن پھر جیسے ہی دعوتِ اسلامی اور تحریکِ قرآنی کا داعیہ پیدا ہوا حیرت ہوتی ہے کہ قوّتِ کار اور تحمّل و برداشت کے کیسے کیسے سوتے اُسی منحنی اور کمزور جسم کے اندر سے اُبل پڑے —— میڈیکل کالج کے پانچ سالوں کے دوران راقم نے اسلامی جمعیتِ طلبہ میں جس محنت و مشقت کے ساتھ کام کیا اب اگر کبھی اُس کی یاد آتی ہے تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے —— اسی طرح وسط ۱۹۶۵ء میں لاہور منتقل ہونے کے بعد سے ۱۹۷۲ء میں قیامِ انجمن تک راقم نے " وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا " کے مصداق خالص 'فرد' کی حیثیت سے بالکل یکّہ و تنہا جو مشقّت جھیلی اس کی مختصر سی رُوداد راقم نے اپنے بعض ذاتی اور خاندانی کوائف کے ضمن میں سپردِ قلم کی تھی، جو تا حال نامکمّل ہے، تاہم جتنا حصّہ شائع ہو چکا ہے اُس سے بھی جو نقشہ سامنے آتا ہے اُس پر خود مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ع

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!"

قیامِ انجمن کے بعد سے اب تک کے اٹھارہ سالوں کے دوران راقم کی مصروفیت کا دھندلا سا نقشہ سامنے لانے کے لیے ان ضمیموں میں پانچ پانچ سال کے وقفوں سے شائع ہونے والی بعض رپورٹوں کے اقتباس دیئے جارہے ہیں۔ واضح رہے کہ ہمارے یہاں رپورٹوں کی تدوین کا کوئی مستقل اور باضابطہ نظام نہیں رہا کبھی اتفاق ہی سے کوئی روداد مرتّب ہو کر شائع ہو جاتی تھی۔ ان میں سے بعض جن پر اتفاقاً ہی نظر پڑ گئی "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہدیۂ قارئین ہیں:

چنانچہ پہلا ضمیمہ جنوری ۷۲ء تا جون ۷۲ء حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کراچی کی رُوداد پر مشتمل ہے جو رفیقِ مکرّم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے مرتب کی تھی اور 'میثاق' جولائی ۷۲ء میں شائع ہوئی تھی (واضح رہے کہ کراچی میں کام کا آغاز ۷۱ء ہی میں ہوا تھا)

دوسرا ضمیمہ 'میثاق' مارچ ۱۹۷۷ء میں شائع شدہ "رفتارِ کار" پر مشتمل ہے جس میں اواخر دسمبر ۷۶ء

یا اوائل فروری ۱۹۸۲ء کی کراچی کی رُوداد برادرم قاضی عبدالقادر صاحب کی مرتب کردہ ہے، اور لاہور، چنیوٹ اور سکھر کی سرگرمیوں کا جائزہ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب ہی کا تحریر کردہ ہے۔

تیسرا ضمیمہ 'میثاق' فروری ۱۹۸۲ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' سے ماخوذ ہے جو خود راقم ہی نے تحریر کیا تھا۔ یہ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء سے ۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء تک کے اسفار کی تاریخ وار رُوداد ہے جس کو اب تو پڑھنے ہی سے سر چکرانے لگتا ہے، اور حیرت ہوتی ہے کہ کبھی میرے شب و روز اس طرح کی "گردشِ مدام" کی صورت اختیار کر گئے تھے!

ان تینوں ضمیموں کی اشاعت سے اصل مقصود تحریکِ تعلّم و تعلیمِ قرآن سے وابستہ ہونے والے نوجوانوں کی ہمّت افزائی ہے کہ اگر مجھ ایسے کمزور اور مریض انسان کو اللہ اتنی ہمّت عطا فرما سکتا ہے تو اُن کو کیوں نہ عطا فرمائے گا۔ اُس کی جناب سے تو ہر دم یہ ندا آتی ہے۔

یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ ــــ وَ ــــ یَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَدْبِرْ!

گویا ؎ ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں!

آخری ضمیمہ قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تدریسی کورس کے پہلے گروپ کے سالِ اوّل کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ یہ رُوداد بھی خود راقم الحروف ہی نے تحریر کی تھی اور مئی ۱۹۸۵ء کے 'حکمتِ قرآن' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت سے مقصد یہ ہے کہ ؎ "نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!" کے مصداق تصویر کا یہ دوسرا رُخ بھی نگاہوں کے سامنے آجائے کہ اگر کام کرنے کے لیے کمرِ ہمّت کس لی جائے تو اِسی بگڑے ہوئے معاشرے اور ملحدانہ و مادّہ پرستانہ ماحول سے سعید رُوحیں نکل آتی ہیں۔ اور نہ مردانِ کار کی کمی رہتی ہے نہ وسائل و ذرائع کی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ؏ "شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!" کے مصداق انسان اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے دیوانہ وار کام شروع کر دے۔

آخر میں جوانوں کے حق میں علاّمہ اقبال کی اس دُعا اور تمنّا کے ساتھ کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے!

اور ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لُٹا دے اسے! لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!!

اور خود اپنے اور اُن تمام لوگوں کے حق میں جو اللہ کے دین کی نُصرت اور اس کی کتابِ عزیز کی خدمت میں مصروف ہوں اس دعا کے ساتھ کتاب ہدیۂ قارئین کرتا ہوں کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔
اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّ نُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً۔ اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَانَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَاجَهِلْنَا وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ اٰنَاۤءَ الَّيْلِ وَاٰنَاۤءَ النَّهَارِ

وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
۲۱ دسمبر ۸۹ء

حصّہ اوّل

دعوت
رجوع الی القرآن
موجودہ عالمی تہذیب کے تناظر میں

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام

فکرِ مغرب کی اساس اور اُس کا تاریخی پس منظر

باب اوّل

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

قرآنِ حکیم کی اساس پر تجدیدِ ایمان اور احیاءِ علم
کی نئی تحریک!

فرمانِ نبویؐ

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ
فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّينَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ

رواہُ الدارمیؒ عن الحسن مرسلاً ورواہُ ایضاً الطبرانیؒ
فی الاوسطِ عن ابن عباسؓ وکذا الخطیبُ عنہُ مرفوعاً
(لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح)

- فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء
- بنیادی نقطۂ نظر
- عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش
- مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل
- علومِ عمرانی کا ارتقاء
- اسلامی نظامِ حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی
- کی اسلامی تحریکیں
- تعبیر کی کوتاہی
- 'اُحیائے اسلام' کی شرطِ لازم: 'تجدیدِ ایمان'
- کرنے کا اصل کام
- عملی اقدامات

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالا دستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصّوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدّن کا سکّہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمّنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقّتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدّن کے خلاف صف آراء ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلّیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بُنیادی نقطۂ نظر

تہذیبِ جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور لبسیط شئے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دَوران فلسفے کے کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا —— لیکن اس پُورے ذہنی و فکری سفر کے دَوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پُورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیالی' اور 'ماورائی' تصوّرات کے بجائے 'ٹھوس' حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیّت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات' روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدم اقرار و انکار کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ یہ 'تصوّرات' رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسّس کا مرکز و محور کائنات' مادّہ اور حیات دنیوی بن کر رہ گئے

انسان کو اللہ تعالےٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہر حال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے —— پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے مہرِ درخشاں کی حیثیّت و وقعت ایک "ذرّۂ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک "ذرّہ فانی" کی حقیقت و ماہیّت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہرِ درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1]، اسی طرح حقیقتِ

---

[1] مہرِ درخشاں ذرّۂ فانی —— ذرّۂ فانی مہرِ درخشاں (کوثر)

ع "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں" اقبال

نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادّہ اور حیاتِ اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب 'کائنات' اور 'مادّہ' تحقیق و جستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سُراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ——— قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوّتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادّے کی یہ عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شئی مادّہ ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! ———!!

عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوتوں سے مسلّح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچّے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے' لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرنگیں ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دوگونہ تھا یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالمِ اسلام میں جو ردِّ عمل اس کے خلاف

پیدا ہوا اس میں بھی اوّلاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملّتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلّط اور قبضے اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، بارہا درد انگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی "عمرِ رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنّا اور "گردشِ ایّام" کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سیّد جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیّت کا روپ دھارا اور کبھی تحریک خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا۔ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلّط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ —— یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادّی ترقی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہی ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا۔ نتیجتہً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیّت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا —— خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور ردّ و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا لیکن سائنس چونکہ بالکل 'حتمی' اور 'قطعی' تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اور خدا کے بجائے کائنات، رُوح کے بجائے مادّے اور حیاتِ اُخروی کے بجائے حیاتِ دُنیوی کی اہمیّت پوری امّتِ مسلمہ حتیٰ کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے

نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل

مغربی فلسفہ و فکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اس دَوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین و مذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفّظ کی سعی کی۔ تحفظ و مدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جن میں محض تحفّظ پر قناعت کی گئی۔ اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر و انکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحابِ کہف کی سنّت کا اتّباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر نری فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالمِ اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھُلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے، اور ہر طرح کے طعن و استہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریقِ کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امّت کے ایک حصّے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادّہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ تعؔ و قال الرسول ؐ کی صداؤں میں دین و شریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ——— اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ———!

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ——— زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی عقلیت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہند و مصر کے کچھ نیم متکلم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً اسلامی عقائد کی کتر بیونت اور اس کے ماوراء الطبعیاتی اعتقادات کی خالص سائنٹیفک توجیہیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں سرسیّد احمد خاں مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمّد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ کی نیتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقّی کی اُس راہ پر گامزن ہو سکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا لیکن یہ بہرحال امر واقعہ ہے کہ اُن کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادّہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اُوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطور 'معذرت' پیش ہو گیا:

علومِ عمرانی کا ارتقاء

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات

بعد الممات کے عدمِ اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور رُوح کے بجائے مادہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا ــــــ اور دوسری طرف حیاتِ اُخروی سرے سے خارج از بحث ہو گئی، اور حیاتِ دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصورات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالمِ واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصۂ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریت اور جمہوریت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسرِکار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

اِسلامی نظامِ حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں

عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالالفاظِ صحیح افراط و تفریط کے دھکّوں کا اثر عالمِ اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطورِ نظامِ زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کی تالیف و ترتیب سے "اسلامی نظامِ حیات" کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصوّرِ دین ان کی پُشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے ہوئے ہے ــــــ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی

وجہ سے عالمِ اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عام مرعوبیت میں بحیثیتِ مجموعی کمی واقع ہوتی ہے۔

مغربی فلسفہ و فکر اور تہذیب و تمدّن سے مرعوبیت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلّط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رُک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رُخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے[1]۔ اور اگرچہ تحفّظ و حمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون و امداد کے پردے میں معاشی تفوّق و برتری کے بندھن ابھی باقی ہیں، تاہم تقریباً پُورا عالمِ اسلام مغربی طاقتوں کی براہِ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے! دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب و تمدّن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی 'ٹھوس' معاشی مسئلے کے بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیّت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ، نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیّت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ خود مادّہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوّتِ محض کی صُورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ماوراء الطبعیاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیتِ مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصُول کے لیے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیت کی اساس بہر حال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لیے

---

[1] دولتِ برطانیہ نے جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹی ہے وہ تو اِس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آمیز واقعہ ہے۔

لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا۔ جس سے احیائے اسلام کے تصوّر کو تقویت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب وعوامل سے تقویّت پاکر 'احیائے اسلام'، 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور 'نفاذِ نظامِ اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرِ کار ہوئیں۔ جن میں قوّت و وسعت اور جذبہ و امنگ کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' اہم ترتھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برِّصغیر پاک وہند کی 'جماعتِ اسلامی' کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی[1] سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِعمل ہیں اور ملّتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے۔ لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پُورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں 'اخوان المسلمون' کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے' اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برِّصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریّت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا[2]۔

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتدبہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور 'ترقّی پسند' عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصوّرِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے بیس سال قبل کی ہے۔ اب ان تحریکوں کی عمر نصف صدی سے متجاوز ہو چکی ہے۔ [2] یہ بات بھی آج سے دس سال قبل تک تھی گزشتہ دس سالوں کے دوران جماعت نے فوجی آمریت کے ساتھ 'شریفانہ سمجھوتہ' کر کے اپنی پوزیشن خراب کر لی ہے!

تعبیر کی کوتاہی!

ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اِسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلّیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن 'ایمان باللہ' کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفُس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثّرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب 'نظر' آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ "کُنْ فِی الدُّنیا کأنّکَ غریبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیلٍ"[1] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبّتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصوّر زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملّت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں[2] اور جو سنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنّتِ عادت اور سنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا 'ایمان' کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیّت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیّت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے!

---

[1] حدیثِ نبویؐ: ـــــ دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر!

[2] اس مکتب کی زوردار نمائندگی کا شرف ہمارے یہاں جناب غلام احمدؐ پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ مقصود ہے کہ واضح ہو جائے کہ یہ بھی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[1] ہے نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ "قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ"[2] کی کیفیت پیدا ہو سکے، ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے! زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیئے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں 'حجاب' محسوس ہوتا ہے کہ یہ رُوح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ"[3]، اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیثِ قدسی کہ "الصّوم لی وَاَنَا اجزی بِہٖ"[4] اوّل تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر[5]۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے "خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری" کی تنظیم ہوتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔!

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس

---

[1] حدیثِ نبویؐ ــــ "الصلوٰة معراجُ المؤمنین": نماز مومنوں کی معراج ہے! [2] حدیثِ نبویؐ: ــــ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے! [3] حدیثِ نبویؐ: ــــ "روزہ ڈھال کے مانند ہے" [4] حدیثِ قدسیؐ "روزہ میرے لیے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا" یا ایک دوسری قراءت کے مطابق! "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں"۔ [5] واقعہ یہ ہے کہ اس حدیثِ قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادیّت کے پردے پڑے ہوتے ہیں!

نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ و مادّہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجۃً روح اور اس کی حیاتِ باطنی خارج از بحث ہو گئی۔ اور مادّہ اور حیاتِ دُنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادّی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاحِ انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاحِ اخروی اور فلاحِ دنیوی دونوں شامل ہیں لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیاتِ دنیوی پر مرکوز ہیں لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" — (POLITICO -SOCIAL SYSTEM) بن کر رہ گیا — اور "الٰہیات" کی حیثیت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی[1]! چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبّت اور اس کے سامنے تضرّع و اِخبات جو 'عبادت' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی[2]۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریّت یا

---

[1] چنانچہ اس دَور کے ایک بہت بڑے متکلّم اور داعیٔ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا کہ "اسلام دراصل ایک سیاسی و عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے"۔ ع "چہ بے خبر زمقامِ محمدِؐ عربی است"!

[2] یہ صورتِ حال بھی خاصی قدامت پسند 'اسلامی تحریکوں' کے یہاں ہے — ورنہ زیادہ 'ترقی پسند' لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیرِ اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک 'معاشی' پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص "نظامِ ربوبیت" سے باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو اُن کے ضمن میں جہاں سر سیّد مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنّت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادّی تعبیر ہی کی 'منطقی انتہا ہے'، مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوعِ بحث نہیں اس لیے کہ چاہے اسے "قرآنی فکر" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادّی اور خلافِ قرآن ہونا اظہر من الشمس ہے اور ہم نے اس 'فکر' کی جانب کچھ اشارے کیئے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادّی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج ۔۔۔ تا ثریّا مے رود دیوار کج !!!

اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے ——— گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی   کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اُس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن   غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

احیائے اسلام کی شرطِ لازم
’تجدیدِ ایمان‘

اِسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا! مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے اسی طرح اسلامی نظامِ زندگی کا تصوّر اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابلِ قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیّت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر ’حال‘ کی صورت اختیار کرے۔

ایمان لامحالہ کچھ ماوراء الطبعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اَن دیکھی، حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سَر کے کانوں سے سُنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد اُن باتوں پر کرے جو صرف دِل کے کانوں سے سُنی جاسکتی ہیں۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرطِ اوّلین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطہ نظر اور طرز فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پُورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیّتِ ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس رُوحِ ربّانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ مسجودِ ملائک ہوا[1] ——— حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے!! اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مچھّر کے پَر سے زیادہ محسوس نہ ہو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصّے میں نقطہ نظر کی یہ تبدیلی واقعتہً پیدا نہ ہو جائے" احیائے اسلام" کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربّانی و نورِ ایمانی سے منوّر، سینے کبر، حسد، بُغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ

---

[1] آیۂ قرآنی: "فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ" ———
ترجمہ: جب میں اسے پُوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدے میں۔

کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادّہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان ویقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے "دلِ روشن" "نورِ یقین" اور "نفسِ گرم" حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان ویقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ یَّھْدِیَ بِكَ اللّٰہُ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ[1] خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد لائحۂ عمل قرار دے لیں۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنّا، آرزو یا حوصلہ و اُمنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی ہے جس کے زیرِ اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالقِ کائنات مادّے سے زیادہ رُوح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیّت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریکِ دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحابِ ایمان ویقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج ایک تہائی صدی[2] سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اور اس کے باوجود کہ اس کے طریقِ کار سے ہم کلّیتہً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیرِ اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعتہً پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیّت کائنات کی نہیں خالقِ کائنات کی ہے اور اصل اہمیّت اسباب کی نہیں مسبّب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے"۔

[2] اب اس تحریک کی عمر بھی نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے۔!

نہیں حکمِ خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالےٰ سے بجھتی ہے! دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام انہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزا یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنتیں بجائے خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں اور زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتدبہ حصہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اوّلیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔! لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اوّلین اہمیّت حاصل ہے ——— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا اور انہیں جہالت و جاہلیّت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام النّاس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کرنے کا اصل کام

بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اُٹھے

جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات یعنی معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے ——— اور انہیں مادیّت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلّل اثبات اور الحاد و مادّہ پرستی کے پُرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سَر ہونا محال ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجودہ دَور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوعِ انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لہٰذا علمی سطح کا تعیّن کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہو گا ——— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیشِ نظر علمی تحریک کے لیے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیّت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہو گا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو، جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (CAREERS) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اوّلاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمّل جائزہ لینا ہو گا، اور اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماوراء الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہو گی)، فکرِ انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ

وحیِ آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقتِ نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

> پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منوّر ہو جائیں، آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے، تو اسی کا نام ایمان ہے۔!

پھر یہی ہوں گے جنہیں "رسوخ فی العلم" حاصل ہوگا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیتِ الٰہی پر منتج ہو گا جن کی شخصیتیں "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ[1]" کی مجسم تفسیر اور ع "قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی عملی تصویر ہوں گے اس لیے کہ قرآن کا "مغز" دراصل یہی 'علمِ حقیقت' ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ قانون و شریعت کی اہمیت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیت واقعۃً "استخوان" کی ہے[2]! ——— اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیتِ ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانون و شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی رمز ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ[3]

مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدّن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو 'علمِ حقیقت' کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب

---

[1] آیت قرآنی: "اللہ کی خشیت اس کے اہلِ علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے۔"!

[2] ما ز قرآں مغز ہا برداشتیم ۔ استخواں پیشِ سگاں انداختیم (رومی)

[3] ترجمہ: "ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن"

ہوں جو قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات کی صورت میں رواں ہیں، ان ہی کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لیے ایک نئی "تہافت"[۱] تصنیف کرسکیں اور آج کے منطقیّین پر ازسرِ نو "رد"[۲] کرسکیں، اور فی الجملہ الحاد و مادّہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا 'مثبت' کام بھی کرنا ہو گا تاکہ ریاضی، طبعیات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے[۳] اور جو اسی حقیقتِ کلّی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہرِ اتم ّایمان ہے، انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر صحیح طور سے فِٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علّامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصّہ تو اگرچہ بہت محلِّ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علّامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علّامہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ——— "ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں، زیرِ نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں ......" اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمّت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع و قابلِ قدر کام ہو جاتا لیکن افسوس کہ خود علّامہ مرحوم کے حلقۂ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانئ طبع کے لیے منتخب نہیں کیا۔!

---

[۱] تہافت الفلاسفہ۔ تالیف امام غزالیؒ۔

[۲] الرّد علی المنطقیین۔ تالیف امام ابن تیمیہؒ۔

[۳] واضح رہے کہ اس ضمن میں "حقائق" اور "نظریات" کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر وقیمت رکھنے والا کام ایک قابلِ ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ امید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جاسکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے ——!

"الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دُنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو مدلّل و مفصّل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برِّصغیر ہند و پاک میں ہوا ہے خصوصاً جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون نے "اسلامی نظامِ حیات" اور "عدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتداء قرار دیا جاسکتا ہے اور اِدھر کچھ عرصہ سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کر دینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیت بھی ختم کر دی ہے جو بجائے خود خاصا قابل قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی "پڑھے کم لکھے زیادہ" لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے، دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے، آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلّمہ علمی قابلیت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کی جانب التفات کر سکیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیّت سے زیادہ کیفیّت پیشِ نظر رہے۔

اس کام کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے،

اور دوسری طرف قرآن و سنّت میں گہری مہارت لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دِقّتِ نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

عملی اقدامات

متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیّت کا بندوبست کرے[1] اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیّت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیشِ نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔ آج کے دَور میں، جبکہ مادیّت اور دنیا پرستی کا قلوب و اذہان پر مکمل تسلّط ہے اور کچھ تو فی الواقع طلبِ معاش کا مسئلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں، پھر معاشرے کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی اور اگر کچھ مخلص و صاحبِ عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھا لیں تو ان شاء اللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کو کہ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ[2] اپنا لائحہ عمل بنا کر علم قرآن کی تحصیل و اشاعت کے لیے زندگی وقف کر دیں — یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ و خیال کے تحت انسان

---

[1] الحمد للہ کہ ان مقاصد کے لیے ۱۹۷۵ء میں "تنظیم اسلامی" کا قیام عمل میں آ گیا۔

[2] حدیث نبویؐ: "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھلاتے ہیں"!

میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے، پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام موانع و مشکلات سے خود نبٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اُجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لیے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ——— جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علومِ جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہِ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجّہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہو گا، دلوں میں اس کی محبّت جاگزیں ہو گی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو گا۔ نتیجتہً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے 'متعارف' ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہو گا' اور اس کے لیے ضروری ہو گا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآنِ حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے' اور ساتھ ہی حدیثِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم' فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم دی جائے ——— پھر ان میں سے جو لوگ فلسفۂ الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے' ان کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلّل تنقید کریں اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف

شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی وہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرسکیں۔

پس نوشت

صفحاتِ گزشتہ میں "قرآن اکیڈمی" کا جو خاکہ سامنے آیا وہ راقم کے قلم سے جون ۱۹۶۷ء میں نکلا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بالکل اسی نظریے اور خیال کے تحت اوّلاً ۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "دارالارشاد" قائم کیا تھا۔ اور پھر ۱۹۳۷ء میں علاّمہ اقبال مرحوم کی تحریک پر "دارالاسلام" کی تاسیس ہوئی تھی۔

"دارالارشاد" کے بارے میں مولانا آزاد نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کے 'البلاغ' میں جو شذرہ لکھا تھا اور "دارالاسلام" کے ضمن میں علاّمہ اقبال نے جو خط شیخ الازہر علاّمہ مصطفےٰ المراغی کو تحریر کیا تھا۔ ان کے اقتباسات اس صفحہ کی پشت پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ جن سے اس حیرت انگیز مماثلت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے جو ان تینوں تجویزوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ پیش نظر مقاصد کے لیے کوئی عملی پیش قدمی نہ "دارالارشاد" کے ذریعے ہوسکی نہ "دارالاسلام" کے۔ ان میں سے مقدم الذکر کے بارے میں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کتنے عرصے قائم رہا اور کب ختم ہوا' اور اغلباً اس کے لیے کہیں کوئی اینٹ رکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی' البتہ "دارالاسلام" کے نام سے ایک ادارہ باقاعدہ قائم ہوا۔ اس کے لیے ایک ٹرسٹ وجود میں آیا اور کچھ عمارات بھی ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ کے قریب سرنا ریلوے سٹیشن سے متصل منصۂ شہود پر آگئیں۔ جہاں اگست ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک غیر منقسم ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کا مرکزی دفتر قائم رہا اور اس اعتبار سے یقیناً وہ عمارات ایک اعلیٰ مصرف میں آئیں۔ لیکن ان مقاصد کے لیے براہِ راست کوئی پیش قدمی وہاں بھی نہ ہوسکی' جن کے لیے وہ ادارہ اصلاً قائم ہوا تھا۔

"دارالارشاد کا مقصد"

"چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور الہلال نے قرآن حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سرِ نو بلند کی۔ لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوتِ عام تھی، جس کے ذریعے فہم و بصیرتِ قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں اور قرآن کریم کی عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقامِ سعی و تعب ہے یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔

'دارالارشاد' کا مقصد یہی ہے کہ دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سر و سامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرفِ علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ اُمّت کا فرض انجام دے سکے۔"

(البلاغ: ۱۲ / نومبر ۱۹۱۵ء)

"دارالاسلام" کا مقصد

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علومِ دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں ہوں اور ان کی رہنمائی کے لیے ہم ایک ایسا معلّم جو کامل اور صالح ہو اور قرآنِ حکیم میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کی رُوح سے واقف کرے اور تفکّرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اخلاق، سیاسیات اور اقتصادیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدّنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جہاد کر سکیں!"

(بحوالہ "اقبال، دارالاسلام اور مودودی" صفحہ ۸۲)

باب دوم

فکرِ مغرب کی اساس

اور اس کا تاریخی پس منظر

از

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مرحوم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے راقم الحروف کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لیے لکھا تھا جو جون ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کرلی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائے اختصار اور کمال جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر مصروفیات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفۂ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالتِ موجودہ بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریر فلسفۂ جدید کے بہت سے طالب علموں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

پروفیسر صاحب کی یہ تحریر بھی اولاً 'میثاق' کی دسمبر ۶۷ء اور جنوری ۶۸ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب وہ مقالہ 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے تحت "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے شائع ہوا تو پروفیسر صاحب کی اس تحریر کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم و مغفور نے 'صدقِ جدید' کی اشاعت بابت ۷ر فروری ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا تھا۔

"دونوں مقالے ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے، دونوں فکر انگیز ہیں۔ اور ایک طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔"

خاکسار

اسرار احمد

برادرم عزیزم السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میثاق ماہ جون ۶۷ء میں جو خیالات آپ نے تحت "تذکرہ وتبصرہ" سپردِ قلم کیے ہیں ان کو پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لیے تہِ دل سے دُعا بھی نکلی۔ آپ نے عصرِ حاضر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اہلِ مغرب کا ملحدانہ زاویۂ نگاہ، اس زاویۂ نگاہ کا اہلِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط، اس کے مُضر نتائج، اس ناگوار صورتِ حال سے رہائی کی تجویز اور اصلاحِ حال کی راہ۔ اِن مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلاشبہ آپ کی اصابتِ فکر ورائے، معاملہ فہمی، ژرف نگاہی اور حقائق رسی کا واضح ثبوت ہے۔ مَیں آپ کو صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جوانی میں بوڑھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کے لیے آپ کو منتخب کر لیا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے۔

مَیں نے بھی نصف صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ایندم) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے۔ یعنی مغرب میں الحاد اور مادّیت کے فروغ کے اسباب، ان مغربی افکار کا اقوامِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط اور اس تسلّط سے رہائی کی صورت۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرّت حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائجِ افکار اور آپ کے نتائجِ افکار میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ مَیں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلّل کر دوں، بعض حقائق کی وضاحت کر دوں، بعض صداقتوں کو مؤکّد کر دوں اور بعض تجاویز کو مشیّد کر دوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے:

"موجودہ دَور بجا طور پر مغربی فلسفہ وفکر اور علوم وفنون کی بالادستی کا دَور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار ونظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا۔

آج سے دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی"۔ نیز یہ کہ "مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط بہت شدید اور ہمہ گیر ہے"۔

آپ کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے چنانچہ میرے اور علّامہ اقبالؒ دونوں کے معنوی مرشد لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے آج سے پچاس سال پہلے انہی حقائق کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں یوں بیان کر دیا تھا:۔

مرزا غریب چُپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں "صاحب نے یہ کہا ہے"

اور:۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

۲۔ آپ نے لکھا ہے:۔

"لیکن اس پورے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصوّرات کے بجائے ٹھوس حقائق کو غور و فکر کا اصل مرکز ہونے کی حیثیّت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے"۔

یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے۔ آج مغرب شدید نوعیّت کے الحاد اور انکارِ خدا کی لعنت میں گرفتار ہے چنانچہ آج مغرب میں منطقی ایجابیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کے علاوہ جو مدارسِ فکر مقبول ہیں وہ بھی سب کے سب انکارِ خدا و روح و آخرت پر مبنی ہیں اور خالص مادّیت کے حامی اور مبلّغ ہیں۔ مثلاً:۔

(ا) THE PHILOSOPHY OF AS IF جسکا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل VAIHINGER ہے۔

(ب) PHENOMENALISM " " " " HUSSREL ہے

(ج) DIALECTICAL MATERIALISM جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل MARX ہے

(د)	NATURALISM جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل ہے	SANTAYANA
(ہ)	AGNOSTICISM AND SCEPTICISM 〃 〃 〃 〃	J. S. MILL
(و)	EMERGENT EVOLUTION 〃 〃 〃 〃	LOYD MORGAN
(ز)	ATHEISM 〃 〃 〃 〃	MORRIS COHEN
(ح)	HUMANISM 〃 〃 〃 〃	SCHILLER
(ط)	REALISM 〃 〃 〃 〃	MOORE
(ی)	PRAGMATISM 〃 〃 〃 〃	DEWY
(ک)	LOGICAL EMPIRICISM 〃 〃 〃 〃	CARNAP
(ل)	EXISTENTIALISM 〃 〃 〃 〃	JEAN P.SRTRE
(م)	FREUDISM 〃 〃 〃 〃	FREUD
(ن)	BEHAVIOURISM 〃 〃 〃 〃	ADLER
(س)	COMMUNISM 〃 〃 〃 〃	LENIN
(ع)	SOCIALISM 〃 〃 〃 〃	LASKI
(ف)	LOGICAL ATOMISM 〃 〃 〃 〃	RUSSELL
(ص)	PHYSICAL REALISM 〃 〃 〃 〃	SELLARS

اِن تمام مدارسِ فکر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جو شئے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، رُوح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں؛ اس لیے ان کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لامذہبیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے:۔

1. CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE
   By DR. DRAPER.

2. HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE By DR. DRAPER.
3. HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE AND THEOLOGY By WHITE
4. HISTORY OF EUROPEAN MORALS By DR. LECKY
5. HISTORY OF FREE THOUGHT IN EUROPE By ROBERTSON

تاہم قارئین کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کیے دیتا ہوں۔

(ا) جب JUSTINIAN قیصرِ روم نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلافِ عقل عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آکر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکماء کو جلاوطن کر دیا۔

(ب) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لیے کلیسائے روم کے اساقفِ اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پر اعتراض کرے گا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیتے جی اچھوت اور بعد وفات اس کا لاشہ بے گور و کفن!

(ج) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم کے خلافِ عقل عقائد[1] (DOGMAS) کے ساتھ حسب ذیل احکام واجب الاذعان بھی نافذ کر دیئے۔

۱۔ معیارِ حق و باطل بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے

---

[1] مثلاً (ا) تثلیث جس کی رُو سے خدا بیک وقت و بیک جہت (باقی اگلے صفحے کے نیچے)

ماتحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت۔

۲۔ ہر پوپ، معصوم عن الخطا اور مطاع ہے اس لیے اس کے احکام میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے۔

بجا کہے جسے پاپا، اسے بجا سمجھو
زبانِ پوپ کو نقّارۂ خدا سمجھو!

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے۔

۵۔ پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(د) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اندلس کے مشہور فلسفی ابنِ رشد (متوفّیٰ ۱۱۶۸ء) کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوگیا اور پندرھویں صدی میں اس کی تمام

وبیک حیثیت وبیک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے اور تثلیث بھی حقیقی ہے۔

(ب) تجسّم جس کی رُو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے، مجسّم ہو کر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ج) یسوع نے اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا، بوجہ غایت فروتنی (HUMILITTY) اپنے آپ کو الوہیت سے معرّیٰ کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کر لی اور صلیبی موت گوارا کر لی۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر قیامت تک پیدا ہونیوالے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

(ہ) جب پادری، عشاء ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لے کر دعا کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے متبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب، یسوع کا خون بن جاتی ہے۔ اس ناقابلِ فہم عمل کو اصطلاح میں (TRANSUBSTANTIATION) کہتے ہیں۔ اُردو میں اس کا ترجمہ ہوگا استحالۂ جوہری یا انقلابِ ذات۔

تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام "احیاء العلوم" اور "اصلاحِ کلیسا" ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کی معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متأثر ہوا تھا میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی؛ ERASMUS م ۱۵۳۶ء، ZIVINCLI م ۱۵۳۱ء، LUTHER م ۱۵۴۶ء، MCLANCTHON م ۱۵۶۱ء اور CALVIN م ۱۵۶۴ء۔ ان کا سربراہ لوتھر تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ بائبل کی صداقت کا دار و مدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی)، بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دار و مدار بائبل پر ہے یعنی معیارِ حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفۂ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سر نو زندہ ہوگیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترھویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آجکل بیسویں صدی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(۵) اہل سائنس اور اہل فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلافِ عقل عقائد پر اعتراضات وارد کیے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں۔ اس لیے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار

دے دیا مثلاً جب کاپرنکس اور گلیلیو نے یہ کہا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے تو کلیسا نے کہا یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں اور ان کے قائلین کافر ہیں۔

(و) کلیسا کی عقل دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور مذہب میں جنگ شروع ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکما۔ اور فلاسفہ نے مذہب کو خیر باد کہہ دیا اور اس طرح یورپ میں لامذہبیت کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصفِ اوّل میں (HUME) نے لاادریت کا فلسفہ پیش کیا اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ عقلِ انسانی، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ ہیوم کے اس فلسفے کو کانٹ (KANT) نے ۱۷۸۱ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقیدِ عقلِ خالص" میں خدا کی ہستی پر جو دلائل فلاسفہ نے مدوّن کیے تھے، ان سب کا ابطال کر دیا، اور اس طرح انکارِ خدا کی راہ ہموار کر دی۔

انیسویں صدی میں مشہور منطقی سر ولیم ہیملٹن اور مشہور عالمِ الٰہیات ڈاکٹر مینسل نے ہیوم اور کانٹ کے نظریات کی یہ کہہ کر مزید تائید کر دی کہ ذہنِ انسانی خدا کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ ان کے بعد مِل اور اسپنسر نے اپنے فلسفۂ لاادریت سے مذکورہ بالا حکما۔ کے نظریات کو تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکارِ خدا کا عقیدہ خواص اور عوام دونوں کے دماغوں میں جاگزیں ہو گیا۔

جب یورپ کو کلیسا اور پوپ کی غلامی سے نجات ملی تو حکما۔ اور فلاسفہ نے نفسِ مذہب کے ساتھ ساتھ نصرانیت اور کلیسائی عقائد کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور انیسویں صدی میں ان کی تنقید اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس صدی کے نصفِ اوّل میں مشہور جرمن فاضل اور محقق اسٹراس (STRAUSS-1808-1874) نے ۱۸۳۵ء میں حیاتِ یسوع (LEBA'N.JESU) لکھ کر کلیسا کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس غیر فانی کتاب میں اس نے اس بات کو مبرہن کیا کہ یسوع کی شخصیت تاریخی طور پر ثابت نہیں ہو سکتی نیز یہ کہ یسوع تو قدیم دیوتا متھرا کا مثنّٰی ہے اور جو مذہب اس کے نام سے منسوب ہے وہ متھرائیت کا چربہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیّت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر واکر پروفیسر تاریخِ کلیسا نے اپنی تصنیف تاریخِ کلیسا میں اس

کتاب کو THE MOST EPOCH MAKING BOOK (عظیم ترین عہد آفریں کتاب) قرار دیا ہے۔

۱۸۴۱ء میں ہیگل کے مشہور شاگرد فیورباخ (م ۱۸۷۲ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "THE ESSENCE OF CHRISTIANITY" شائع کی جس میں اس نے عیسائی مذہب اور اس کے تصورِ ذاتِ باری دونوں کا ابطال کر دیا۔

۱۸۶۳ء میں فرنچ فاضل ارنسٹ رینان (م ۱۸۹۲ء) نے حیاتِ یسوع (VIE DE JESUS) لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ یسوع محض ایک انسان تھا۔

پروفیسر بوَر (F. C. BAUR) نے بائبل کی کتابوں پر تنقید کی اور ثابت کیا کہ پولوس کے خطوط میں سے صرف تین اصلی ہیں باقی سب جعلی ہیں اس لیے بائبل بحیثیت مجموعی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

(ف) میں نے بخوفِ طوالت چند نقادوں کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے۔ میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے مذہب عیسوی اور اس کے بعد نفس مذہب بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو اس بات سے بھی بہت ضعف پہنچا، کہ یورپ میں جو فلسفہ —— اور اس سے میری مراد فلسفۂ تصوریت (IDEALISM) ہے، مذہب کا حامی تھا، انیسویں صدی میں اس پر چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے اور اس کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفے کے میدان میں مذہب کا کوئی مددگار باقی نہ رہا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:۔

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اپنے فلسفۂ اشتراکیت کو مسلکِ مادیت کی اساس پر قائم کیا جو خدا اور روح دونوں کا منکر ہے۔

ڈارون نے نظریۂ ارتقاء پیش کیا جس سے مسلکِ مادیت کو تقویت حاصل ہوئی، شوپن ہاور نے نظریۂ قنوطیت (PESSIMISM) کی اشاعت کی اور یہ نظریہ بھی خدا اور مذہب کا مخالف ہے۔

مِل اور اسپنسر نے مسلکِ لاادریت کی تبلیغ کی اور یہ مسلک بھی مذہب اور خدا کے بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے۔

نطشہ (NEITZCHE) نے بھی اپنے فلسفے میں خدا کا انکار کیا اور 'ANTI CHRIST' لکھ کر عیسائیت پر کاری ضرب لگائی۔

بیسویں صدی میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) نے مادیت کو تقویت پہنچائی اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں آج یورپ میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جس کی رُو سے خدا، رُوح اور آخرت تینوں الفاظ قطعاً مہمل اور بے معنی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بریڈلے (م ۱۹۲۴ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مظاہر اور حقیقت" "APPEARANCE & REALITY" میں مادیت کی پُورے طور سے تردید کر دی ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر لینڈل نے اپنی تصنیف "فلسفہ اور مذہب" میں میرے قول کی بایں الفاظ تائید کی ہے:

"مسٹر بریڈلے نے اپنی تصنیف کے ابتدائی ابواب میں مادیت کے مقابلے میں تصوریت کی جس انداز سے حمایت کی ہے اس کی تردید نہیں ہو سکتی۔" (ص۲۷) لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عصرِ حاضر میں الحاد پرور سائنس اور ملحدانہ مدارسِ فلسفہ کو جو قبولِ عام کی سند حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ سے فلسفۂ تصوریت جو مادے کے مقابلے میں رُوح کو اصلِ کائنات اور حقیقتِ اقصٰی قرار دیتا ہے، غیر مقبول ہو چکا ہے۔ آج کی دنیا میں حکماء اور فلاسفہ کی اکثریت کا میلان مادیت کی طرف ہے اور مذہب کی اپیل بہت کمزور ہو گئی ہے اور سائنٹیفک نظریات نے بہت سے مذاہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

عصرِ حاضر میں پانچ مدارسِ فکر بہت مقبول ہیں۔ اور سب کے سب الحاد پرور ہیں۔ اور انکارِ خدا و رُوح پر مبنی ہیں یعنی:۔

1. PLURALISTIC REALISM.
2. DIALECTICAL MATERIALISM.
3. EXISTENTIALISM.
4. NATURALISM.
5. LOGICAL POSITIVISM.

اور ان میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

خلاصۂ کلام یا رجحانِ عصرِ حاضر

قصہ مختصر خدا اور مذہب کے بارے میں جو شکوک اور شبہات جدید تعلیم یافتہ طبقے کے افراد میں پائے جاتے ہیں، ان کے اسباب یہ ہیں :۔

(ا) سائنٹیفک اسپرٹ (روح) کی روز افزوں نشو و نما اور آبیاری۔

(ب) ٹیکنولاجیکل تہذیب کی ترقی۔

(ج) مادّی علوم و فنون کا عروج۔

(د) ایجادات کی بدولت تسخیرِ عناصرِ کائنات کا سلسلہ۔

(ہ) لذّاتِ جسمانی اور ترغیباتِ جنسی کی روز افزوں فراوانی اور بوقلمی۔

ان عناصر سے انسان کا نقطۂ نظر سراسر مادّی ہو گیا ہے اور اس کا اثر حیات کے ہر شعبے پر مرتب ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فتوحات نے انسان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے[1] خدا سے بے نیازی کی ابتدا تو کاپرنیکس ہی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی اسی لیے لاپلاس (LAPLACE م ۱۸۲۷ء) نے نپولین کے سوال کے جواب میں یہ عہد آفریں جواب دیا تھا کہ "میں نے اپنی تصنیف 'توضیحِ نظامِ کائنات' میں خدا کا ذکر محض اس لیے نہیں کیا کہ عقل کی مدد سے کائنات کا نظام خدا کے بغیر بھی مدوّن ہو سکتا ہے"۔ اور اسی لیے بیسویں صدی میں اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ[2] (م ۱۹۲۵ء) نے جب اپنا فلسفۂ خودی "ONTOLOGICAL IDEALISM" کے عسیر الفہم عنوان سے مرتب کیا تو انسانی خودی کو حقیقت (REALITY) تسلیم کرنے کے بعد خدا کو اپنے نظامِ فکر سے بکلّی خارج کر دیا۔

فزیکل سائنس ہر لمحے ہماری حیاتِ اجتماعی و انفرادی کو متأثر کرتا ہے بخصوصاً ہمارے

---

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبال)

[2] اقبال نے ۱۹۳۵ء میں اپنے استاد کے سوانح حیات پڑھ کر اس کی یاد میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا اور اس کے آغاز میں اسے PHILOSOPHER SAINT "فلسفی ولی" کے لقب سے نوازا تھا۔

مدارسِ فلسفہ ہمارے مذاہب اور حیات و ممات سے متعلق ہمارے عمومی زاویۂ نگاہ پر تو نمایاں اور قابلِ تردید اثر مرتب ہوا ہے۔

جدید سائنس کی رُو سے حیاتِ عضوی کی توجیہہ محسوس فطری قوانین کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی فوق الفطرت طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا اور اس سائنٹیفک توجیہہ کی رُو سے انسان فاعلِ مختار (FREE MORAL AGENT) نہیں ہے۔

اسی طرح جدید نفسیات کی رُو سے انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ نفسِ انسانی کی باشعور زندگی پر اس کی حیوانی جبلّتوں کی حکومت ہے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ فرائڈ یہ بھی کہتا ہے کہ ارادہ و مشیّت کی آزادی در اصل ایک خود پسندانہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی شخصیّت کا تعین خارجی ماحول سے ہوتا ہے۔ جیسا ماحول مل گیا ویسا ہی انسان بن گیا۔

فلسفۂ اخلاق بھی سراسر مادّی بنیادوں پر استوار کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر ڈیوی لکھتا ہے کہ "اخلاقی اقدار بھی اُسی طرح غیر مستقل اور بے ثبات ہیں جس طرح بادل۔ مستقل (ازلی) اقدار کا تصوّر محض خوش فہمی ہے"۔ رہے مسائلِ مابعد الطبیعات تو ان کے متعلق منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔

کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں سائنس اور فلسفۂ مادّیت کا قولِ فیصل یہ ہے کہ یہ دونوں بے مقصد ہیں۔ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے، افزائشِ نسل کرے اور آخر کار مر کر ہمیشہ کے لیے فنا (معدوم) ہو جائے۔ الغرض جدید سائنس اور فلسفے کی روح، مذہب کے خلاف ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر آپ کے مضمون کے ابتدائی حصّے کی توضیح۔ میں نے اختصار کو مدِّ نظر رکھا ہے ورنہ یہ موضوع اس قدر وسیع الذّیل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتم برصغیر میں دار العلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیّت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی" نیز یہ کہ "یہ امر واقعی ہے کہ اُن (سر سیّد) کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل گئی اور مادّہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا"۔ میں آپ کے اخذ کردہ نتائج

سے بالکل متفق ہوں۔ سر سیّد نے مذہب کے درخت میں مغربی فلسفے کا جو پیوند لگایا ہے، اس کے اثمارِ تلخ سے پاکستانی مسلمانوں کے کام و دہن بقدرِ ذوق خوب لذّت اندوز ہو رہے ہیں۔ 'دقیانوسی' ٹائپ کے مسلمان ابھی سے اس تلخی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے کو اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیّت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ انفس اور آفاق میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثّرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب نظر آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔ . . رسالت کا اقرار تو موجود ہے لیکن محبتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں ہے۔

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کو اس حقائق رسی، ژرف نگاہی اور معرفت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ سچّی بات یہی ہے کہ جب تک ایک مسلمان، اللہ تعالیٰ کو فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی نہ سمجھے وہ قرآنی توحید کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوّف، جسے جاہل صوفیوں نے بدنام کر دیا، دراصل توحید ہی کو دل و دماغ میں جاگزیں کرنے اور اسے زندگی میں ایک عامل مؤثر بنانے اور اس کے تقاضوں پر عمل کے لیے آمادہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[1] اپنی تصنیف "فتوح الغیب" کے تیسرے مقالے میں فرماتے ہیں کہ "اے بیٹے اس بات کو حرزِ جاں بنا لے کہ لافاعلَ فی الحقیقۃِ ولا مؤثّر فی الحقیقۃِ الّا اللّٰہ" ——————

—————— واحسرتا! آج شیخ موصوفؒ کے نام پر گیارہویں کی

---

[1] شیخ موصوف ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں دینی علوم سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد بیس سال تک اپنے مرشد کے زیرِ تربیت رہ کر تزکیۂ نفس کرتے رہے۔ چالیس سال کی عمر میں مرشد کے حکم سے تلقین و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پچاس سال تک مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے رہے اور طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۵۶۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ع رحمتِ ایزدی بروحش باد!

نیاز کرنے والے تو لاکھوں ہیں مگر ان کی تعلیم پر عمل کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس بزرگ نے پچاس برس تک مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دستگیر نہیں۔ کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی حاجت روا نہیں، آج اس کے نام لیوا خود اسی کو دستگیر اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اللہ کے بجائے اسی کو پکارتے ہیں۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمّت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو تاکہ ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کر لے"۔

میں اس باب میں آپ سے بکلّی متفق ہوں۔ اقبالؔ نے اسی بات کو یوں ظاہر کیا ہے بالفاظِ دگر انہوں نے بھی یہی علاج تجویز کیا ہے:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں ہمیں یہی انقلاب نظر آتا ہے کہ عقیدۂ توحید ان کا حال بن گیا تھا اسی انقلاب کا یہ نتیجہ تھا کہ "انہیں یہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی اور خیالی نظر آتی تھی لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہوتی تھی"۔ وہ جس طرف کو منہ کرتے تھے انہیں اللہ ہی نظر آتا تھا اور وہ ہر واقعے میں اللہ ہی کو کارفرما دیکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے ذیل کے شعر میں یہی اندازِ نگاہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے:

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
مطلب یہ ہے کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ایمان بالغیب کے لیے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی لازمی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ ۔۔ حیاتِ دنیوی فانی ہی نہیں بالکل غیر حقیقی اور بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اُخروی حقیقی اور واقعی نظر آنے لگے جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی رونما نہ ہو احیائے اسلام کی آرزو ہرگز ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی"۔ میں آپ کی اس بات سے بکلّی اتفاق کرتا ہوں بلکہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس صداقتِ عظمیٰ کو پاکستان ہی نہیں

تمام دنیائے اسلام میں شائع کر سکیں اور ہر مسلمان تک پہنچا سکیں۔ میں پچاس برس کے غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا، اللہ نے آپ کو دس پندرہ سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اسے پیش کرنے کی سعادت بھی آپ کو عطا فرمائی۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تحریکیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوئیں وہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان تحریکوں کو ناکام ہوتے دیکھا ہے۔ سبب اس ناکامی کا وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے یہ تحریکیں برپا کیں ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق محض قال تک محدود تھا بالفاظ دگر وہ اسلام کا نام تو لیتے تھے، مگر اس کی روح سے بیگانہ تھے۔ اسلام کی رُوح، جیسا کہ میں سمجھا ہوں محض ارکانِ اسلام کی رسمی پابندی نہیں ہے بلکہ دل کی آنکھوں سے اللہ عزّ و جلّ کا مشاہدہ یا اُس ذاتِ پاک کے ساتھ ایسا شدید قلبی رابطہ ہے جو مسلمان کو اس مقام پر پہنچا دے جہاں پہنچ کر ہر وقت اللہ ہی پیشِ نظر رہتا ہے، غیر اللہ کی ہستی کالعدم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے "عوام کے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثّر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب اور اذہان معرفتِ ربّانی سے منوّر ہوں اور سینے کبر و حسد، بغض اور ریا، سے پاک ہوں اور زندگیاں حرص و طمع اور حُبِّ دنیا سے خالی ہوں۔"

میں اس معاملے میں بھی آپ سے بکلّی متفق ہوں، از راہِ تفاخر نہیں بلکہ بطور اظہارِ حقیقت یہ بات لکھ رہا ہوں کہ میں نے پچاس سال سے زائد عرصہ منطق، فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام کے مطالعے میں ضائع کیا لیکن خدا گواہ ہے کہ نہ تو ان علوم و فنون سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا اور نہ کتابوں سے کبر و حسد، بغض و ریا اور حرص و طمع کا ازالہ ہوا۔ ان امراض خبیثہ کا ازالہ تو کیا ہوتا الٹا میرا دماغ شکوک و شبہات کی جولانگاہ بن گیا اور اگر اس عالم پیری میں (سن ولادت ۱۳۱۳ھ) توفیق ایزدی تصوّف کے نخلستان میں نہ پہنچا دیتی تو آج تشکیک کے ریگستان میں العطش العطش پکارتا ہوتا۔ شکر ہے کہ وفات سے پہلے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ ؎

نہ کتابوں سے، نہ کالج سے، نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبرؒ)

سچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے :

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع ہست — جز حرفِ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

سعدی بشوئے نقشِ دوئی رازِ لوحِ دل — علمے کہ راہِ حق نہ نماید، جہالت است

نیز سچ کہا ہے مرشد رومیؒ نے :

علم چہ بود؟ آنکہ رہ بنمایدت — زنگِ گمراہی زدل بزدایدت

علم نبود غیرِ علمِ عاشقی — مابقی، تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ صحبت ہی کا تو ثمرہ تھا کہ ابن ابی قحافہ، صدّیق اکبرؓ کے مقام پر فائز ہو گئے اور یہ صحبت ہی کا تو کرشمہ تھا کہ ابن خطّاب کو فاروق اعظمؓ کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ رضی اللہ عنہما۔ اسی لیے اقبال نے یہ کہا :

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است

صحبتِ مردانِ حر، آدم گر است

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر

علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک اٹھے جو تعلیم یافتہ طبقات اور ذہین افراد میں انقلاب برپا کر دے یعنی انہیں خدا پرستی اور خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

مَیں آپ کی ان تجاویز سے بکلّی متفق ہوں اور اس دُعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو عصرِ حاضر میں دعوت و تبلیغِ اسلام کی توفیق ارزانی فرمائے اور یہ حقیقت آپ پر واضح کر دے کہ مقصدِ حیات استرضاءِ باری تعالیٰ ہے نہ کہ حصولِ حکومتِ ارضی۔ حکومت یا خلافت، ایمان و عملِ صالح کا ثمرہ ہے نہ کہ مقصود بالذّات شئے۔ اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس ننگِ خلائق کے خاتمہ بالخیر کی دُعا فرمائیں۔

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا

اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا (اکبرؒ)

والسّلام خیر الختام

مجمع عیوب و زشتی یوسف سلیم چشتی

حِصّہ دوم

دعوت
رجوع اِلیٰ القرآن
کا تاریخی پس منظر

قرآنِ حکیم قرنِ اوّل میں اور اُس کے بعد

اسلام برِعظیم پاک و ہِند میں

ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے مختلف مکاتبِ فکر

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کا مؤسّس

باب اوّل

قرآنِ حکیم

قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد

بدءُ الاسلام[۱] میں اسلام کی دو[۲] عظیم ترین حقیقتیں

قرآنِ حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

قرآن: منبع و سرچشمۂ ایمان و یقین، اور جہاد: ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اتم

واقعہ یہ ہے کہ بُدءُ الاسلام میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں —
ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدّوجہد کے ضمن میں 'آلۂ انقلاب' کی حیثیت
حاصل ہے بقول مولانا حالی ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع عنوان ہے آپؐ کی اس جدّوجہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔
واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور
خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ "وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ
خُسْرٍ ۝" اور "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝" کی چونکا دینے
والی صدائیں اور "اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝" اور "اَلْحَآقَّةُ ۝
مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝" کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے
عرب میں ہلچل مچادی اور "عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِیْ هُمْ فِيْهِ
مُخْتَلِفُوْنَ ۝" کی کیفیت پیدا کر دی۔ بقول مولانا حالی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر — اسی کی آیات بیّنات تھیں جنہوں نے هُوَ الَّذِیْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ
بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (الحدید: ۹) کے مصداق انسانوں
کو شرک، الحاد، مادہ پرستی، حُبِّ عاجلہ، اور حیوانیتِ محضہ کے "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ"
ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ
وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبّتِ خداوندی سے سرشار یعنی مستِ بادۂ الست ہو گئے اور دوسری
طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پَر سے بھی حقیر تر ہو گئے اور وہ کُلّیتہً طالبِ عقبیٰ بن گئے
مزید برآں — وہی تھا جو "مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" بھی بن کر آیا، اور "شِفَآءٌ
لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" بھی! چنانچہ اسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب و تجلیۂ روح بھی!

گویا انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، موعظت ہو یا نصیحت، تعلیم ہو یا تربیت، تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر ——— الغرض تطہیر ہو یا تعمیر محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا عمل دعوت واصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو[۲] پورے چار[۴] مقامات پر آنحضورؐ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل وآخر خود قرآن مجید ہی ہے۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ	سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ: ۲)	کتاب اور حکمت!

قرآن کا کارنامہ، ایک جملے میں بیان کیجئے، تو یہ ہے کہ اس نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت پیدا کر دی لیکن اِس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی اِس لیے کہ قرآن نے اُنؓ کا فکر بدلا، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا، اقدار بدلیں، عزائم بدلے، امنگیں بدلیں، شوق بدلے، دل چسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیت بدلی، اجتماعیت بدلی، دن بدلا، رات بدلی حتیٰ کہ "تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پوری کائنات بدل کر رکھ دی ——— اور اِس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیات بینات! بقول علامہ اقبالؒ:

بندۂ مومن زِ آیاتِ خداست ۔۔۔ ایں جہاں اندر برِ او چوں قباست!
چوں کہن گردد جہانے در برش ۔۔۔ می دہد قرآں جہانِ دیگرش!

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیت اور مقدار کی نسبت سے کم وبیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرامؓ میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج ومراحل کا جامع عنوان ہے "جہاد فی سبیل اللہ"!

اِس تصادُم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہُوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'مجاہدہ مع النفس' کو 'افضل الجہاد' قرار دیا گیا[1]۔ پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں، سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادُم کی صورت میں ہُوا جس کا مقصد قرار پایا 'تکبیرِ ربّ'[2] یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیت مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تاکہ "اُس کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو!"[3] ——— اور اس کی آخری منزل ہے "قتال فی سبیل اللہ" جس کا منتہائے مقصود معیّن ہُوا ان الفاظ میں کہ:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ	کہ "فتنہ" بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت
كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال: ۳۹)	کُلّیۃً اللہ ہی کی ہونے لگے!

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بیان کیا گیا قرآن حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ	مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	پر اور اُس کے رسُولؐ پر پھر شک میں
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ اُولٰٓئِكَ	اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحجرات: ۱۵)	اور اپنی جانیں۔ حقیقت میں یہی ہیں سچے!

---

[1] آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا: "اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ!"

[2] الفاظِ قرآنی کی رُو سے: "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝" (المدثّر: ۳) اور بقول علّامہ اقبالؒ

یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدامست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

[3] سیّدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ۔

واضح رہے کہ اِس آیۂ مبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں 'حقیقی ایمان' اور 'قانونی اسلام' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مومنِ صادق کی جامع و مانع تعریف قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں جہاد اور قتال ان میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں، چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (SYMBOLS) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیّل اور تصوّر میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابدی ہیں!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ اور خلافتِ راشدہ کے دَوران اسلام کی 'نشأۃِ اُولیٰ' یا غلبۂ دینِ حق کا دَورِ اوّل بلا شائبۂ ریب و شک نتیجہ تھا صحابۂ کرامؓ کے تعلّقِ قرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی اِن دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریّت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے 'ظاہر' سے ہوتی ہے 'باطن' سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علاّمہ اقبال ؒ "بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا!" ـــــ مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ مکارمِ اخلاق یا مواعظِ حَسَنہ کو۔ حتّٰی کہ اس اعتبار سے قصاص عفو پر مقدّم ہو جاتا ہے ـــــ اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو، خواہ وہ اصُولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے، اصُولوں اور نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دَور میں داخل ہوا تو اصل زور (EMPHASIS) ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجۃً قرآنِ حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی

چلی گئی اور کتاب قانون اور یکے از ادلۂ اربعہ[1] ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکز توجہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو 'چار میں کے ایک' کی حیثیت میں پس منظر میں گم[2] ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں[3]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجۃً پورا عالم اسلام ارسطو کی منطق اور نوافلاطونی تصوّف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[4]! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت —— بلکہ صرف ایک 'ایسی کتاب مقدس' بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آسکتے ہیں[5]۔ اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ:

لَا يَبْقَىٰ مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا	اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور کچھ
اِسْمُهٗ وَلَا يَبْقَىٰ مِنَ الْقُرْآنِ	باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے
إِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ: کتاب العلم)	صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔

بعینہٖ یہی معاملہ 'جہاد' کے ساتھ بھی ہوا، جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اور ساری توجہ ارکانِ

---

[1] اصولِ شریعت چار ہیں: قرآن[1]، سنتِ رسول[2]، قیاس[3]، اجماع[4] انہیں اَدِلَّۂ اَرْبَعَہ کہا جاتا ہے۔

[2] حضرت اکبر کا بہت پیارا شعر ہے۔

صوم ہے ایمان سے، ایمان غائب صوم گم ۔۔۔ قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم!

[3] چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں لیکن اصولِ تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کل دو رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا رسالہ 'اصولِ تفسیر' اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ 'الفوز الکبیر'

[4] اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے ان الفاظ میں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں ۔۔۔ حکمتِ قرآنیہ را ہم بخواں

[5] ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا: ؎

بآیاتش ترا کارے جزیں نیست ۔۔۔ کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری

اسلام پر مرتکز ہو گئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے، گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ چار میں کے ایک کی حیثیت ہی سے سہی بہر حال شریعت کے اصول اربعہ میں شامل تو ہے، جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصور بھی مسخ ہو گیا اور اس شجرۂ طیبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ لیبیر (SHORT CUT) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنیٰ قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راستبازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جدّ و جُہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ —— گویا فی الجملہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی منظم سعی جو ہر مومن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ! اللہ کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت! ع "ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!" کے مصداق کجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرامؓ جذبۂ جہاد سے سرشار، بیک زبان، رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں: نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا

عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

کجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک متنبّی اور اُس کی ذُرّیتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ع

"کہ رہوارِ یقین ما بصحرائے گماں گم شد!"

باب دوم

اسلام

برِّعظیم پاک و ہند میں

- ورودِ اوّل : سندھ میں
- ورودِ ثانی : شمال مغرب سے
- ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج لیکن اسلام کے زوال کی انتہا : اکبرِ اعظم علیہ ما علیہ
- الفِ ثانی کا تجدیدی کارنامہ :
  - شیخ احمد سرہندیؒ
  - شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ
  - امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ

برِصغیر پاک و ہند میں خورشیدِ اسلام اوّلاً عینِ غرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافتِ بنی اُمیّہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر اُسّی برس[1] بیت چکے تھے اور دَورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گذر چکا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر 'بابُ الاسلام' سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورودِ اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منوّر کر کے رہ گئیں اور اس مدّ میں بھی جذر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برِصغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمدِ اوّلین نہایت محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ ہند دَورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علیٰ النّاس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت[2] کا ذوق و شوق نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اسے اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتّع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار[3] ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار!

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشّح عرب تاجروں

---

[1] آنحضورؐ کا سنِ وفات ۶۳۲ء ہے اور سندھ پر محمّد بن قاسمؒ کا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔

[2] بقول علامہ اقبال ؎ شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

[3] رستم، سپہ سالار افواجِ ایران کو اس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات بتائے تھے ان میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یعنی "وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار!"

کی آمدورفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا اگرچہ اس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہود نہیں ہوتے ــــــ لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی دروں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید لگ بھگ دو سو برس تک اس کی نوعیّت واقعتہً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آناً فاناً گذر گیا۔ اور اگرچہ اس بار موجودہ پاکستان کے نصف شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیّت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو اِدھر آتا ہے اُدھر گذر جاتا ہے!

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو باقاعدہ تمکّن ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت عروج و زوال اور مدّ و جذر کے مختلف مدارج و مراحل سے گذرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے "غدر" پر ختم ہو گیا۔ ان ساڑھے چھ سو سالوں کے نصف اوّل کے دوران ۔یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النسل 'غلام[1]' بادشاہ تختِ دہلی کو زینت بخشتے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان 'خلجی' 'لودھی وغیرہ' حکمران رہے' اور نصف ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دَور ہے جس کے کُل سوا تین سو سالوں میں سے پہلے پَونے دو سو برس[2] اُن کی اصل عظمت و سطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو برس اصلاً ایک عظیم عمارت کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمین بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی"!)

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشأۃِ اُولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوّت کا تقریباً خاتمہ ہو

---

[1] تاریخ اسلام کا یہ دَور عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی کی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندانِ غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سریر آرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!۔

[2] یعنی ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمۃ کی وفات تک!

چکا تھا اور خلافتِ بنی عبّاس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا تھا[1] اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار تھی گویا بنی اسمٰعیلؑ کے حق میں وعیدِ خداوندی "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ـــــ اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دُوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلال و جمال کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف![2] ـــــ اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں مُلوک، احبار اور رُہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث[3] پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دُنیا کی تمام تہذیبوں اور تمدنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ اوّلین ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر میں[4] ؎

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُھْبَانُھَا

ـــــ اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دورِ زوال و انحطاط میں بھی بہت سی عظیم اور استثنائی

---

[1] چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتلِ عام ہوا کہ الامان والحفیظ ـــــ اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح سرِ عام ذبح کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو حلال کر دیا جاتا ہے۔ جس پر خون کے آنسو بہائے شیخ سعدیؒ نے :؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المومنیں!
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

[2] ؎ شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جُنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

[3] گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ظاہری طور پر بھی مطابقِ واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی۔ خصوصاً تاریخ اسلام کے اس دور میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے صلیبی جنگوں سے عالمِ اسلام کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث اسلام کی وحدانیت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی!

[4] حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں :؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتۂ مُلّائی و سلطانی و پیری

(EXEPTIONAL) شخصیتیں پیدا کیں جیسے صلاح الدّین ایوبیؒ اور ناصر الدّین محمودؒ ایسے درویش بادشاہ اور امام ابن تیمیہؒ ایسی جامع سیف وقلم شخصیّت، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور تک ایک جانب مسلمان حکمران وسلاطین اکثر وبیشتر "آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ"[1] کے مصداقِ کامل بن چکے تھے اور دوسری جانب علماء وصوفیاء کی عظیم اکثریت بھی آیاتِ قرآنی: "لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ ؕ" (المائدہ: ۶۳) اور "اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" (توبہ: ۳۴) کی مظہرِ اتم بن چکی تھی۔ فَوَاحَسْرَتَاہ وَیَا اَسَفَا!

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحابِ سیف وسناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاس وقلم جدا، اور زیبِ منبر ومحراب اور تھے اور زینتِ میدانِ جنگ وقتال اور، چنانچہ ابتداء میں ایک جانب محمود غزنوی اور محمّد غوری کی سرفروشانہ ترکتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ اسمٰعیل بخاری اور شیخ علی ہجویری رحمہما اللہ کی تبلیغ وتلقین اور تعلیم وتربیت کی انتھک کوششیں، اور بعد میں ایک طرف قطب الدّین ایبک اور بختیار خلجی کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو دوسری طرف خواجگانِ سلسلۂ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکیے، قلوب کے تصفیے اور سیرت وکردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز میں ان دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط وتعلّق موجود تھا جس کا عظیم ترین نشان (SYMBOL) ہے سلطان التمش کی جامع الصّفات شخصیّت کہ ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب الدّین بختیار کاکیؒ کا حلقہ بگوش اور حد درجہ عابد وزاہد انسان بھی، ——— یہاں تک کہ حضرتِ خواجہ کے انتقال پر جب لوگ نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہوتے

---

[1] علّامہ اقبالؒ مرحوم نے الفاظِ قرآنی "اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَھْلِھَآ اَذِلَّةً" (سورۃ النّمل: ۳۴) کے حوالے سے کس قدر عمدہ اشعار کہے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک	سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر	پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز	دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے	حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

اور وہاں خواجہؒ مرحوم کی اس وصیّت کا اعلان کیا گیا کہ میری نمازِ جنازہ صرف وہ شخص پڑھاتے جس نے عمر بھر کبھی زِنا نہ کیا ہو اور جس کی نہ کبھی تکبیرِ اُولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنّتیں چھوٹی ہوں، نتیجۃً مجمعے پر سکتہ ساطاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران و پریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پُوری موجُود ہوں تو قدرے تامّل و انتظار کے بعد جو شخص اگلی صف سے امامت کے لیئے نکلا وہ خود بادشاہِ وقت سلطان التمش تھا۔!

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کے مابین ایک بُعد اور فصل پیدا ہو گیا اور اُن کے شب و روز ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گذرا یہ خلیج عمیق سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

مزید برآں، ہندوستان میں اسلام علاقۂ ماوراء النّہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور اُن کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجونِ مرکّب علمِ کلام کا دوَر دوَرہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدت الوجُود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک[1] شدید حنفیّت اور دوسرے[2] وجودی تصوّف۔

قرآنِ حکیم یہاں ابتدا ہی سے صرف ایک کتابِ مقدّس کی حیثیّت سے متعارف ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلدِ محض رہی اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدُود رہی اور عام بول چال، تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور سرکار دربار سب پر فارسی کا قبضہ رہا لہٰذا قرآن و حدیث سے یہ بُعد اور دُوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ مرورِ ایّام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اس غُلُوّ فی الحنفیّت اور بُعد عن حدیثِ الرّسُول ﷺ کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب سُلطان غیاث الدّین تغلق کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت خواجہ نظام الدّین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدّین کے مابین مناظرہ ہوا اور اپنے موقف کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام الدّین نے ایک حدیث رسولؐ

کو تو بلا کسی جھجک اور تامل کے بھرے دربار میں ڈنکے کی چوٹ کہا شیخ الاسلام نے کہ:

"تو مقلدِ ابو حنیفہ ہستی، ترا با حدیثِ رسول ؐ چہ کار؟ قولِ ابی حنیفہ بیار!"	تم مقلدِ ابو حنیفہ ہو یعنی حنفی ہو تمہیں حدیثِ رسول ؐ سے کیا سروکار؟ اگر امام ابو حنیفہ کا کوئی قول پیش کر سکتے ہو تو کرو!

جس پر حضرتِ خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار سے اٹھ گئے کہ:

"سبحان اللہ! کہ با وجود قولِ مصطفوی ؐ از من قولِ ابی حنیفہ ؒ می خواہند!" (سیر العارفین)	سبحان اللہ! نبی اکرم ؐ کے فرمان کے ہوتے ہوئے مجھ سے امام ابو حنیفہ ؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر، اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور امراء و عمایدِ سلطنت کی تھی اور اُن کے ساتھ بطورِ تتمہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمہ و خطباء، مدرسین و معلمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کل دین کی حیثیت حاصل تھی! جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشددانہ ظاہر پرستی اور قانونی موشگافی کا دَور دورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف، تصوف کے خانوادوں میں سے ارضِ ہند پر سب سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم جمائے اور کم و بیش دو صدیوں تک خواجگانِ چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار پیدا ہوتے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطاریہ سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا۔ ان تمام سلاسل میں وحدت الوجود کو گویا اصولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے زیرِ اثر کیف و سرور، جذب و مستی اور وجد و رقص کا ذوق و شوق بڑھ رہا تھا اور فنا فی اللہ کو شغل و سلوک کے منتہائے مقصود کی حیثیت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قویٰ مضمحل ہو رہے تھے اور جذبۂ جہاد تو دور رہا جذبۂ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا!

مزید برآں ـــــ باطنی احوال و کوائف پر توجہ کے ارتکاز کے باعث ظاہر کی اہمیت

کم ہوتی جا رہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا، عشق و محبت کی سرمستی میں پابندیٔ شریعت اور اتباعِ سنت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر آنے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیر و کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا، اور ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" پر عمل عام ہو گیا تھا نتیجۃً ملّتِ اسلامی کا جداگانہ تشخص ہی شدید خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔

علمائے ظاہر یا "حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین" کی جانب سے اس طرزِ عمل کی مخالفت ایک فطری امر تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بغض اور عداوت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش اور علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے جس میں ایک 'بعدِ رابع' (FORTH-DIMENSION) کا اضافہ ہو گیا اوائل عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیت کی درآمد سے، جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور جس کے زیرِ اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات و رسومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آ گیا!

مسلم انڈیا کا سنہرا دور بلاشبہ اس کا صدرِ اوّل ہی تھا یعنی دورِ خاندانِ غلاماں، جس میں ملوک، احبار، رہبان کی تثلیث اگرچہ اصولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اس میں نہ تنزل و انحطاط کے آثار نمایاں ہوتے تھے نہ باہمی بغض و عناد کے بلکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق و تعاون موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آ جاتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرا زوال اور پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا چلا گیا بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اترتی چلی گئیں ـــــ تا آنکہ مغلِ اعظم شہنشاہ اکبر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عین اس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النہار پر چمک رہا تھا اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کس مپرسی کی حالت طاری ہو گئی! یہاں تک کہ نام نہاد 'دینِ الٰہی' نے دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اسے سرزمینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق کہ جذر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مدّ کے آثار جنم لیتے ہیں

ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دَور سرزمین پاک وہند میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی تمہید بن گیا! بقول علامہ اقبال ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں   توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغل اعظم علیہ ماعلیہ کے آفتابِ اقتدار نے ابتدائی موانع ومشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پُوری آب وتاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا تھا[1] اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال وانحطاط کے دَورِ سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے تحت سرزمینِ ہند میں دو خورشید ہدایت بھی طلوع ہوتے: ایک مجدّد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے: حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ (جن کا سنّ ولادت ۱۵۵۱ء ہے) جن کی مُصلحانہ ومجدّدانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رُخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چارسو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگزیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدّین ایوبیؒ اور سلطان ناصر الدّین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اوّل وآخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہوگئی!

ان میں سے مقدم الذکر یعنی شیخ مجدّد کی مساعی میں پُرجوش مجدّدانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخر الذکر یعنی شیخِ محدّث کی کوششوں پر خاموش مُصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رُخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرتِ مجدّد کی مساعی کو حاصل ہے جبکہ سرزمینِ ہند میں علمِ حدیث نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرتِ محدّث نے سَرانجام دی اس کے اثرات بہت دیرپا اور دُوررس ثابت ہوئے۔

حضرتِ مجدّدؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رُخ تصحیحِ عقائد، ردِّ بدعات، التزام شریعت اور اتّباعِ سُنّت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے رائج الوقت علمی ونظری اور اخلاقی وعملی ہرنوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی، چنانچہ تردیدِ شیعیّت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ "ردِّ روافض" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے

---

[1] اکبر کی حکومت کو استحکام ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد ہی حاصل ہوا تھا۔

تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی 'طریقت اور شریعت' کے بُعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفۂ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود کی تدوین و ترویج ہے جس نے ان تمام مفاسد کا سدِّباب کر دیا جو تصوّف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے، نتیجتہً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی، عشق و محبّت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتّباع کا جذبہ بھی از سرِ نو بیدار ہوا، فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ حاصل ہوا اور جذب و سُکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوتے ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملّتِ اسلامیہ کا جُداگانہ تشخّص از سرِ نو مستحکم ہو گیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں جسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیّت حاصل ہے دینِ محمدیؐ بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے بقول علّامہ اقبال مرحوم:

حاضر ہوا میں شیخ مجدّدؒ کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں،
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

سلسلۂ نقشبندیہ، جس کا پودا سرزمینِ ہند میں حضرتِ مجدّدؒ کے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسلِ طریقت میں سے 'اقرب الیٰ الشّریعت ہے' اور حضرتِ مجدّدؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشّان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرتِ مجدّدؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصّہ ہے اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ باقویہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا لیکن "ہند میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی" کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرتِ مجدّدؒ کے احفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش اور ردِّ بدعت و رفض کے جرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی از سرِ نو

تازہ کیا گویا ع "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!" (سرمد)

بایں ہمہ، حضرتِ مجددؒ کے یہاں بھی حنفیت میں غلو اُسی شدت کے ساتھ موجود ہے جو مسلم انڈیا کی پوری تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے۔ گویا حضرتِ مجددؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دورِ غلاماں میں) اس کا آغاز ہوا تھا لیکن ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!" کا عمل اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

البتہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی خدمات کو اس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدثؒ کی شخصیت بعض پہلوؤں سے تو حضرتِ مجددؒ ہی کی شخصیت کا ظل معلوم ہوتی ہے لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے اُن کی حیثیت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے آفتابِ رُشد و ہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیشرو یا مقدمۃ الجیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور خواجہ باقی باللہ ہی کے مرید بھی لیکن اس کے باوجود کہ انہیں بھی وحدت الوجود سے بُعد تھا وہ اس کی تردید میں اس درجہ سرگرم نظر نہیں آتے، اسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن متشدد نہیں بلکہ فقہ حنفی کا رشتہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اوّلاً انہی سے شروع ہوئی۔ ان دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخ مجددؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بین بین نظر آتے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصلِ ثابت، یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدثؒ نے دین کا تعلق اُس اصلِ ثابت، کی فرعِ اوّل، کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، اُن کی شخصیت حضرت امام الہندؒ کی شخصیت کا مقدمہ یا دیباچہ نظر آتی ہے —— اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرتِ محدث کی اصل خدمت (CONTRIBUTION) ہے کہ انہوں نے علمِ حدیث کا پودا سرزمینِ ہند میں لگایا۔ اور حدیثِ رسولؐ کی باقاعدہ درس و تدریس کا بھی آغاز کیا اور اس سے متعلق تصنیف و تالیف کا بھی! چنانچہ خود انہوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اُن کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحقؒ نے صحیح بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں انہوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصل شرح (لمعات التنقیح) عربی زبان میں اور اس سے بھی زیادہ طویل شرح (اشعۃ اللمعات) فارسی

میں تحریر کی، علاوہ ازیں اُسنادِ حدیث اور اسماء الرّجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور لمعات کے مقدمے کے ذریعے بھی عُلُومِ حدیث کا ایک جامع تعارف کرا دیا!

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ ان مختصر شذرات کی حدُود سے باہر ہے تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دَورِ صحابہؓ کے بعد کی پُوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیّتِ کُبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیّت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دَورِ جدید کے فاتح ہیں اور اس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ انہوں نے حضرتِ مجدّدؒ اور شیخِ محدّثؒ دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہندؒ ہی کی شخصیّت کی تمہید تھے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرت مجدّد نے ہند میں اُمّتِ مسلمہ کو از سرِ نو ایک مستحکم داخلی تشخُّص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر اُمّت کے خلاف اُٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا اور حضرتِ مجدّدؒ نے "ردِّ روافض" سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ" اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے "تحفۂ اثنا عشریہ" ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی ——— اور دوسری طرف شیخِ محدّثؒ نے علمِ حدیث کا جو پودا سرزمینِ ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانۂ ہند کو علمِ حدیثِ نبویؐ کا ایک عظیم الشّان چمن بنا دیا۔ عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں۔ اسی طرح امام الہندؒ نے مؤطا امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المسوّٰی) اور ایک فارسی میں لکھی (المصفّٰی)، واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک مؤطا امام مالکؒ کو علمِ حدیث کے ذیل میں اصلِ اوّل کی حیثیّت حاصل ہے۔

ان پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی

نشأۃِ ثانیہ کے طویل عمل کا اصل نقطۂ آغاز ان ہی کی ذاتِ گرامی ہے:

مثلاً ایک[1] یہ کہ علمِ فقہ کے میدان میں ایک طرف آپؒ نے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" تصنیف فرمائی جس سے تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین اعتدال کی راہ واضح ہوئی اور دوسری طرف "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" ایسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس نے فقہی اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے ضمن میں نہایت دور رس نتائج پیدا کیے۔

دوسرے[2] یہ کہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "حُجّۃ اللّٰہِ البالغہ" کے ذریعے آپ نے حکمتِ دین کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظامِ عقائد، نظامِ عبادات اور نظامِ معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصلِ ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا۔ چنانچہ ایک[1] طرف قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کے مطالب و مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ اس پر انہیں شدید مخالفت حتیٰ کہ عوامی یورش تک کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف "الفوز الکبیر فی اصُول التفسیر" کی تصنیف کے ذریعے علمِ تفسیر کو ایک چیستاں کے بجائے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور درمیانی استعداد تک کے حامل لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہیں آسان کر دیں۔

شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں میں سے دو یعنی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدّینؒ نے قرآن مجید کے بامحاورہ اور لفظی ترجمے کر کے گویا اپنے والدِ مرحوم کے شروع کیے ہوئے کام کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج برِّصغیر پاک و ہند میں علم و فہمِ قرآن کا جو غلغلہ اور ہمہمہ ہے وہ سب دہلی کے اسی عظیم خانوادے کی مساعی کا نتیجہ نہیں۔

الغرض ویسے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا علمی اصلاح و تجدید کا پورا کارنامہ ہی نہایت رفیع اور قابلِ قدر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی مساعی کو عالمِ اسلام میں یورپ کی پوری تحریکِ احیاء العلوم (RENAISSANCE) کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان کا عظیم ترین

کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سر نو قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا۔ اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کے تعلّق کو دوبارہ اُستوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے اس قول کے مطابق کہ "لَا یُصلِحُ اٰخِرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا" اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی۔۔۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ!!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی قرآنی خدمات پر جو جامع تبصرہ شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تالیف 'رودِ کوثر' میں کیا ہے وہ ہدیۂ قارئین کر دیا جائے۔ وَھُوَ ھٰذَا:

"آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور عُلوم قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی لیکن اس زبان میں قرآنِ مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا[1]۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے۔ پُرانے علماء اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اُس کی رُوح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلامِ مجید کے بعض حصّوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتہ چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا انہیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلامِ مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو

---

[1] شیخ سعدی کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے لیکن شیخ سعدیؒ سے اس کی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے پہلے مَلِک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطینِ جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحرِ مواج لکھی تھی، جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور اُسے کبھی بھی عام مقبولیت نصیب نہ ہوئی۔

قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلامِ مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۱۷۳۷-۳۸ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلامِ مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علماء کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ کلامِ مجید کی انتہائی بے اَدَبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جُزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرّکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اُردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کارِ خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دشواریاں دُور کر دیتے جو عام علماء کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطورِ خود بلند پایہ اور قابلِ قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور اُمورِ مذہب میں مغز کو چھوڑ کر اُستخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دِقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اُس کی اَدَبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج، جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علماء و اُدَباء نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے، ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں، جسے تسلی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زورِ بیان، فصاحت و بلاغت

اور رُوحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لیے علما۔ اور اہلِ قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اُردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے، وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا نذیر احمد کہتے ہیں: "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہؒ میں علیٰ وجہِ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحبؒ کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصّہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسّرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیشِ نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اُسے اختیار کرتے ہیں۔"

شاہ صاحبؒ نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن المجید میں قرآن مجید کے ترجموں کی رہنمائی کے لیے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحبؒ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: "اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی کتنی بے شمار نعمتیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ عظیم الشّان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین اُمت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی، بلکہ علمِ تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں الفوز الکبیر فی اُصُول التفسیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں عُلوم قرآنی اور مطالعۂ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیاتِ منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سَو کے قریب تھی اور جن کی

تعداد علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی بیسؔ مقرر کی تھی، چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

فوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسبابِ نزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلامِ مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اوّل میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی، ایک قصّے کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصّے کو اس آیت کے لیے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے اس لیے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقایدِ باطلہ کا وجود اور آیاتِ احکام کے لیے ان میں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے اسبابِ نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔"

فوز الکبیر کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے مثلاً عام طور پر مسلمان زمانۂ جاہلیت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی "انصاف بالائے طاعت" کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتاب کو بدل ڈالا ہے لیکن شاہ ولی اللہؒ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں "یہودی تحریفِ لفظی، تورات کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابنِ عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔"

بعض مفسرین نے اہل کتاب سے قصّے لے کر انہیں قرآنی تفاسیر اور علومِ اسلامی

کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جابجا آواز بلند کی ہے مثلاً فوز الکبیر میں لکھا ہے "یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاءِ سابقین کے قصّے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسّرین بیان کرتے ہیں وہ سب اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ علماءِ اہلِ کتاب سے منقول ہیں" اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں "اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگئی ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ اُن کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب" مفسّرین کے بعض قصّے جنہیں عوام اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے "اور محمد بن اسحاق واقدی کلبی نے قصّہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصّہ لائے ہیں) محدّثین کے نزدیک اُن کا اکثر حصّہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علمِ تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی اور اس کے حفظ پر فہمِ کتاب اللہ کو موقوف کرنا دراصل کتابُ اللہ سے اپنا حصّہ کھونا ہے۔"

مفسّرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیّت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر، اور وہ بھی تفسیرِ جلالین (بقدرِ درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں "قرآنِ عظیم اس طرح پڑھاویں کہ صرف قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھا جائے مگر جہاں شانِ نزول یا قاعدۂ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں بعد اس کے تفسیرِ جلالین بقدرِ درس پڑھاویں۔" (ترجمہ)

باب سوم

انگریزی دور کے نئے فتنوں کا سدِباب،

تحریکِ

رجوع الی القرآن

اور

ترجمہ و تفسیر قرآن کے مختلف مکاتبِ فکر

- خانوادۂ ولی اللّٰہیؒ اور تحریکِ شہیدینؒ
- عیسائیوں اور ہندوؤں کی جانب سے تبلیغی یلغار
- سرسید احمد خاں مرحوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی
- شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ڈاکٹر سر محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین
- مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی
- امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ہم اپنا یہ تاثر بھی بیان کر چکے ہیں کہ "دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دورِ جدید کے فاتح ہیں۔ ۔ ۔" اور ساتھ ہی تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے اُن کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مختلف النّوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے "اسلام کا رشتہ اس کی 'اصلِ ثابت' یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا" ـــــ اور یہ کہ "ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سرِ نو قرآنِ حکیم کے علم وحکمت کی جانب منعطف کر دیا ـــــ اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کے تعلّق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ 'لا یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الّا بما صلح بہ اولھا' اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی سعی وجہد کی راہ کھول دی"!

اس سے پہلے ہم یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ صدرِ اوّل میں اسلام کی عظیم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں: ایک ایمان ـــــ وہ ظاہری اور قانونی وفقہی ایمان نہیں جس کا تعلّق "اِقرارٌ بِاللِّسانِ" سے ہے بلکہ وہ حقیقی اور قلبی ایمان جو یقین بن کر انسان کے رگ وپے میں سرایت کر جائے ـــــ اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جس کا مقصد ہو 'شہادت علی النّاس' ـــــ 'اعلاءِ کلمۃ اللہ' اور 'اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ' ـــــ اور چونکہ ایمانِ حقیقی کا منبع وسرچشمہ ہے قرآنِ حکیم اور جہاد وقتال کی علامت ہے تلوار' لہٰذا 'مردِ مومن' کی شخصیت کا جو ہیولیٰ چشمِ تصوّر کے سامنے اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں بالکل بجا طور پر قرآن ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار!

یہ صحیح ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اپنی زندگی میں سرِ بکف، سیف بدست اور کفن بر دوش میدانِ جہاد و قتال میں نکلنے کا مرحلہ نہیں آیا لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے نصف صدی کے اندر اندر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جو غلغلہ سرزمینِ ہند میں بلند ہوا وہ تمام تر اُن ہی کی تجدیدی دعوت کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے کہ خود حضرت سیّد احمد بریلویؒ بھی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے تربیت یافتہ تھے اور اُن کے دستِ راست تو تھے ہی شاہ اسمٰعیلؒ ابن شاہ عبدالغنیؒ ابن شاہ ولی اللہؒ۔ اور اگرچہ انجام کار کے اعتبار سے ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تحریک "شعلۂ مستعجل" کا مصداق بن گئی لیکن اس کی خوش درخشیدگی، یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریکِ جہاد کے وابستگان کے ایمان و یقین، ذوق و شوق اور جوش و خروش کے تذکرے سے بے اختیار صحابہ کرامؓ یاد آجاتے ہیں اور سخت حیرت ہوتی ہے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!" اور یہ ایک بیّن ثبوت ہے اس کا کہ اگر دعوت کی اساس اور منہجِ عمل وہی اختیار کیا جائے جو اسلام کے صدرِ اوّل میں کیا گیا تھا تو سیرت و کردار کے وہی نمونے آج بھی تیار ہو سکتے ہیں جو دورِ صحابہؓ کا طُرّۂ امتیاز ہیں، گویا بقول جگر مراد آبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلّط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے نتیجے میں گویا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی ہی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہو گیا تھا تاہم اسے ایک باضابطہ کُل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے غدر یا بغاوت کی صورت میں آخری ہچکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دَور ختم ہو گیا۔ اور تاریخِ ہند کے برطانوی دَور کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصفِ آخر اور انیسویں صدی کا نصفِ اوّل ہند میں سخت اضطراب و انتشار اور شکست و ریخت کا زمانہ ہے جس میں مسلمان بالخصوص حد درجہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار

رہے۔ مایوسی کے اس غلبے میں جب کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

ظاہر ہے کہ تحریکِ شہیدینؒ ایسی پُرعزیمت دعوت کا پنپنا اور کامیاب ہونا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۸۳۱ء میں شہیدینؒ نے "بخاک وخون غلطیدن" کی روش اختیار کرلی اور اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر لیا اور اس طرح بالاکوٹ کی فضاؤں میں دعوتِ ولی اللّٰہی کی یہ پہلی صدائے بازگشت دم توڑ گئی ـــــــ اور بعد میں اگرچہ مجاہدین مسلسل ؏

"من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!"

پر عمل پیرا رہے اور ان کی مساعی کا سلسلہ بالآخر 'ریشمی رُومالوں کی تحریک' تک ممتد ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اُن کا نتیجہ کوئی برآمد نہ ہو سکا ـــــ اور ہندوستان میں انگریز کا اقتدار اور قبضہ دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا

برطانوی دَور میں مسلمانانِ ہند زندگی اور موت کی جس کشمکش سے مسلسل دوچار رہے اس کے متعدّد پہلو تھے، خالص دینی و مذہبی بھی، علمی و فکری بھی، سماجی و مجلسی بھی، اور قومی و سیاسی بھی، ـــــــ ان میں سے اس وقت ہماری گفتگو خالص دینی و مذہبی کشمکش تک محدود ہے (قومی و سیاسی کشمکش کے بارے میں ہم نے ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں تفصیل کے ساتھ اظہارِ رائے کیا تھا۔ یہ مضامین 'اسلام اور پاکستان' کے زیرِ عنوان کتابی صورت میں شائع کیے جا چکے ہیں) ـــــــ مزید برآں یہ جو مکھی جنگ مسلمانوں کو بیک وقت دو دشمنوں سے لڑنی پڑی، انگریزوں سے بھی اور ہندوؤں سے بھی! اور جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے اس میں اولاً مسلمانوں کو مدافعت ہی پر اکتفا کرتے بنی اور ایک طویل عرصے بعد ہی یہ صورت پیدا ہو سکی کہ قدم جما کر کسی مثبت اساس پر تعمیرِ جدید کی کوشش شروع کر سکیں۔

خالص مذہبی میدان میں مسلمانوں کو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں کی یلغار سے سابقہ پیش آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہیبر (HABER) لارڈ بشپ آف کلکتہ نے براستہ دہلی بمبئی تک پورے

ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں نہ کوئی مذہبی جذبہ باقی رہا ہے نہ سیاسی قوّت۔ لہٰذا عیسائیوں کو کھل کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ چنانچہ عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور نوبت بانیجا رسید کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھی عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ تب وہی سُنّتِ الٰہی ظاہر ہوئی کہ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں،

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری!!

اور یہ سعادت اُسی خطّے کے حصّے میں آئی جس میں علم و حکمتِ ولی اللّٰہی کے چشمے بہہ رہے تھے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبے کیرانہ سے مولانا رحمت اللّٰہ نامی شخصیّت اُبھری جس نے پادری فینڈر (FANDER) کی کتاب "میزان الحق" کا دندان شکن اور مُسکت جواب "اظہار الحق" کے نام سے تحریر کیا۔ نتیجتہً پادری صاحب موصوف کو ہندوستان سے دُم دبا کر بھاگتے ہی بنی ——— اور پھر جب اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ترکی کو بنایا اور وہاں کے علماء کا ناک میں دم کر دیا اور وہاں سے طلبی پر مولانا رحمت اللّٰہ کیرانوی ترکی پہنچے تو وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہو گیا۔ مباحثے اور مناظرے میں اِس شکستِ فاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کھلے میدان میں خم ٹھونک کر کبھی نہ کی جا سکی۔ اور اس کی واحد ممکن صورت صرف یہ رہ گئی کہ پسماندہ طبقات کی تالیفِ قلب کے ذریعے کچھ لوگوں کے ناموں کے آگے چُپکے سے 'مسیح' کا لاحقہ چسپاں کرا دو اور بس!

دوسری طرف عیسائی پادریوں کے دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی اُبال آ گیا اور مسلمانوں پر اُن کا تبلیغی حملہ دو صورتوں میں ہوا: ایک خالص رجعتی اور تنگ نظرانہ انداز میں، دوسرے قدرے وسیع المشربی کے رنگ اور ترقی پسندانہ انداز میں ——— ان میں سے پہلے کا حشر تو اگرچہ عیسائی مشنریوں کے انجام جیسا ہی ہوا لیکن جس طرح کوئی بخار جاتے جاتے مریض کے لیے کوئی اذیت بخش چیز چھوڑ جاتا ہے جسے عام گھریلو زبان میں بخار کا "موتنا" کہتے ہیں اِسی طرح یہ فتنہ بھی جاتے جاتے جسدِ ملّت میں ایک سرطان کی جڑیں جما گیا ——— رہا دوسرے انداز کا حملہ تو اُس نے میٹھی چھری والا کام کیا اور مسلمانانِ ہند کے اچھے بھلے حصّے کو متأثر کیا یہاں تک کہ بعض انتہائی اہم شخصیتیں بھی اس کی زُلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئیں۔

اوّل الذکر حملہ ——— آریہ سماجیوں کی جانب سے تھا جنہوں نے ۱۸۶۵ء ہی کے لگ بھگ مسلمانوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا اور ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف "ستھیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے تو گویا یہ فتنہ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اِن کے جواب کے لیے علماءِ حق بھی میدان میں آئے لیکن بدقسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیت آنجہانی غلام احمد قادیانی کو حاصل ہو گئی جس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی تالیف "سُرمۂ چشمِ آریہ" ہی کے ذریعے وہ ہردلعزیزی حاصل کی تھی جو اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہونے کے باعث چھلک پڑی۔ نتیجۃً وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں کو بھی گمراہ کر گیا۔

مؤخّر الذکر حملہ ——— برہمو سماج کی صورت میں سامنے آیا جس کی تاسیس ۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے (ولادت ۱۷۷۰ء، وفات ۱۸۳۳ء) نے کی تھی۔ عجیب بات ہے کہ یہ انتہائی ذہین وفطین اور عالم وفاضل شخص بھی پہلے اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے ہی سامنے آیا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانے کے لیے "تحفۃ الموحّدین" تصنیف کی اور اس طرح مسلمانوں میں ہردلعزیزی حاصل کر لی۔ بعد میں یہ شخص اپنشدوں کا پرچارک، ہندوستان کی عظمت وسطوتِ پارینہ کا نقیب اور ہندی نیشنلزم کا علمبردار بن کر سامنے آیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے اس نے اکبرِ اعظم علیہ ما علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے 'دینِ الٰہی' کے چربے کے طور پر 'وحدتِ ادیان' کا فلسفہ ایجاد کیا۔ جس کے ناوک نے اچھوں کو زخمی کیا اور بڑے بڑوں کے دلوں کو چھید ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی پوری تحریک اسی ایک شخص کے ظلّ اور بروز کی حیثیت رکھتی ہے اور گاندھی جی کی شخصیّت پر سب سے گہری چھاپ اسی کی نظر آتی ہے۔ عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ جی نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں "تحفۃ الموحّدین" تالیف کی اسی طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے تحریکِ خلافت میں شمولیّت اختیار کی اور وحدتِ ادیان کے فلسفے کو اتنا اچھالا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی عظیم اور نابغہ شخصیّت بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئی ؏

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!"

مسلمانانِ ہند کی مثبت احیائی مساعی کا آغاز دراصل بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء سے ہوا۔

یہ مساعی قومی و ملّی سطح پر اور خالص سیاسی میدان میں بھی ہوئیں اور علمی و فکری سطح پر بھی۔ ہم مختلف مواقع پر اس احیائی عمل کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ رائے کر چکے ہیں۔ آج ہمیں اس ہمہ جہتی عمل کے اُس پہلو پر روشنی ڈالنی ہے جو ہمارے نزدیک خالص تجدید و احیائے دین اور ٹھیٹھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اعتبار سے اہم ترین ہے ـــــــ اور وہ یہ کہ بحمداللہ نگاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پر ہوتا جا رہا ہے اور اُمّتِ مسلمہ جو کلام اللہ سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔

اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور "الفوز الکبیر فی اُصُول التّفسیر" کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اُن کے دو صاحبزادوں، شاہ رفیع الدّینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے علی الترتیب لفظی و بامحاورہ اُردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدّینؒ کا ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادرؒ کا ۱۸۱۰ء میں) ـــــــ انیسویں صدی کا اکثر حصّہ اگرچہ سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں بیت گیا تاہم اس کے اواخر ہی میں "رُجُوع اِلیٰ القرآن" کا وہ عمل پھر شروع ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں پوری شدّت کو پہنچا۔

رُجُوع اِلیٰ القرآن کے اِس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ آغازِ کار میں اِس میں اُن گروہوں نے بھی حِصّہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور ضَلُّوا وَاَضَلُّوا کا مصداقِ کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو "ضَلُّوا ضَلاَلاً بَعِیْدًا" کی اُس حد کو پہنچ گئے کہ اُمّت کو مجبوراً ان کا تعلّق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی، اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیّت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جیسے چکڑالوی و پرویزی ـــــــ تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآنِ حکیم کی جانب ارتکازِ توجّہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حِصّہ لیا ہے لہٰذا اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے ـــــــ اِسے کسی بھی درجے میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے۔

سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہیے کہ گزشتہ صدی کے ربعِ آخر اور موجودہ صدی کے ربعِ اوّل میں ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ذیل میں برِّصغیر پاک و ہند میں کس قدر کام ہوا:

(۱) سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیب الاخلاق' میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رُک گیا۔

(۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمد جالندھری کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی تفسیر شائع ہوئی۔

(۶) ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بلگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا۔ لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ لہٰذا یہ نامکمل رہ گیا اور شائع نہ ہو سکا۔

(۷) ۱۹۰۶ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔

(۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع مختصر حواشی شائع ہوا (حواشی سورۃ النساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے)

(۹) ۱۹۱۷ء میں محمّد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا ا سے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کُل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہو گئے!)

(۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمّد علی لاہوری ہی کی اُردو تفسیر شائع ہوئی، اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمّل نہیں کہلا سکتی، تاہم اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اعتناء و التفات کا ایک سلسلہ گذشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہو گیا تھا اور اس صدی کے رُبعِ اوّل کے ختم ہونے تک خاصی دلچسپی مسلمانانِ ہند کو قرآنِ حکیم اور اس کے عُلُوم و معارف کے ساتھ پیدا ہو چکی تھی۔

ہم اس سے قبل ایک موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ برِ صغیر پاک و ہند میں ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کے عمل کے دوران دو متضاد نقطۂ نظر اور طرز ہائے فکر پروان چڑھتے گئے۔ ایک وہ جس کا منبع و سرچشمہ علی گڑھ بنا اور دوسرے وہ جس کے مرکز و محور کی حیثیت دیوبند کو حاصل ہوئی۔ ابتدا میں راسخ العقیدہ علماء کی گرفت مسلم معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ علی گڑھی طرزِ فکر کو اپنے لیئے راستہ بنانے میں شدید مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے تحت اُس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور علماء کا حلقۂ اثر سکڑتا چلا گیا تاہم اب بھی ہمارے جسدِ ملّی کے بحرِ محیط میں یہ دونوں رَو میں بالکل "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ٥" کی سی شان کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ اور اگرچہ قومی و سیاسی میدان میں علی گڑھی مکتبِ فکر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تاہم مذہبی میدان میں اب بھی غلبہ و اقتدار راسخ العقیدہ علماء ہی کو حاصل ہے!

اس تفرقہ و اختلاف کے جو اثرات ہماری قومی و سیاسی جِدّ و جُہد پر مترتّب ہوئے وہ ہماری اِس وقت کی گفتگو کے موضوع سے خارج ہیں۔ اِس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآنِ حکیم کی جانب توجّہ و التفات کا جو رُجحان پیدا ہوا اُس میں بھی یہ دونوں رنگ بالکل علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور پر دو گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک متجدّدانہ رنگ کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سر سیّد احمد خاں مرحوم کی تفسیر کو اصل الاصُول کی حیثیّت حاصل ہے اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیّت کی حامل ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر "فکرِ قرآنی" کے میدان میں خواہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کی چکڑالویّت ہو خواہ محمّد علی لاہوری کی لاہوریّت، اور خواہ علّامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیّت ہو خواہ چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیّت، یہ سب فکرِ سرسیّد ہی کی شاخیں ہیں اور دوسری طرف مولانا تھانویؒ کی "بیان القرآن" پر مبنی تین مزید تفسیریں منصّۂ شہود پر آچکی ہیں۔ ایک مولانا عبد الماجد دریابادی کی تفسیر جس میں تقابلِ ادیان اور خصوصاً بائبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں، دوسری مولانا محمّد ادریسؒ کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ

توجہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔

جہاں تک مقدم الذکر مکاتبِ فکر کا تعلق ہے، ہمیں ان سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ہم انہیں ضلالت و گمراہی ہی کے مختلف رنگ (SHADES) سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ اس جائزے میں اُن کا ذکر دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اُن کی مساعی سے بھی اُمّت کے بعض عناصر میں قرآن مجید سے ایک دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اگرچہ اُن کے زیرِ اثر یہ دلچسپی غلط رُخ پر پڑ گئی، تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر قرآنِ حکیم کے حقیقی اور اصلی عُلوم و معارف پیش کیے جائیں تو ان مکاتبِ فکر سے منسلک لوگوں کو بآسانی راغب کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اِن مکاتبِ فکر نے گویا ایک دعویٰ (THESIS) کی شکل اختیار کر لی جس کے جوابِ دعویٰ (ANTI-THESIS) کے طور پر راسخ العقیدہ علماء کو ترجمہ و تفسیرِ قرآن کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور اس طرح ایک بڑا ذخیرہ اُردو تراجم و تفاسیر کا تیار ہو گیا۔ جس سے قرآنِ مجید کی جانب عوام کی توجہات کے انعطاف کا عمل تیز تر ہو گیا۔

ویسے یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہو گا کہ خود علماء کے حلقوں میں تا حال قرآنِ حکیم پر توجہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سیّد محمد یوسف بنوری مدّظلہٗ سے دریافت کیا کہ اِس کا کیا سبب ہے کہ اصُولِ حدیث اور اصُولِ فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اصُولِ تفسیر پر کل دو مختصر رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ہے ——— اس کا جواب تو مولانا نے قدرے توقف کے بعد یہ دیا کہ اصل میں اصُولِ فقہ کی کتابوں میں اصُولِ تفسیر بھی زیرِ بحث آ جاتے ہیں لہٰذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب میں نے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ کے دار العلوم میں تخصّص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصّص فی الفقہ کا بھی لیکن تخصّص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں ہے؟ تو اس پر مولانا نے پوری فراخدلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ یہ ہماری کوتاہی ہے! اسی طرح حیرت ہوتی ہے کہ حلقۂ دیوبند کے علماء کرام کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا جو مقام و مرتبہ ہونا چاہیے اور فی الواقع ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن اُن کی آخری نصیحتوں میں سے اہم ترین نصیحت جسے نقل فرمایا مفتی محمد شفیعؒ نے، اس پر عمل کہیں نظر نہیں آتا۔ اِلّا ماشاءاللہ

بہرحال علی گڑھ اور دیوبند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملّتِ اسلامیۂ ہند کے محیط میں 'فکرِ قرآنی' کے تین سوتے اور پھوٹے جنہیں مجموعی طور پر (SYNTHESIS) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علاّمہ اقبالؒ مرحوم جو معروف و متداول معنوں میں تو نہ مترجمِ قرآن تھے نہ مفسّرِ قرآن۔ بلکہ اُن کی تعلیم بھی نہ کسی دارالعلوم میں ہوئی تھی، نہ جامعہ اسلامیہ میں۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے۔ بایں ہمہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومیٔ ثانی' کا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پُورے اعتماد کے ساتھ مناجات بحضور سیّد المرسلینؐ میں یہ تک کہہ دیا کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن   ایں خیاباں رازِ خارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رُسوا کُن مرا   بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

چنانچہ اُن کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سُرور، محبّتِ الٰہی اور عشقِ رسُولؐ کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ ملّی سے مملُو ہیں ہی، اُن کے 'خطبات' بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر مطالعۂ قرآنِ حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علاّمہ مرحوم نے جدید ریاضیات و طبعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآنِ حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اِس کے بغیر دَورِ حاضر میں دین و مذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے۔

علاّمہ مرحوم کی اس فکری کاوش کے ضمن میں اُن کے معروف ہم نشینوں نے تو کوئی مزید کام نہیں کیا —— البتہ ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم نے اس سلسلے میں خاصی وقیع خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف 'قرآن اور علمِ جدید' نامی تالیف کے ذریعے بعض جدید اور اہم نظریوں اور فلسفوں جیسے ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، فرائڈ کا نظریۂ جنس، مارکس کا نظریۂ جدلی مادّیت وغیرہ کا جائزہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں لیا اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی کوشش کی اور دوسری طرف "IDEOLOGY OF THE FUTURE" نامی تصنیف کے ذریعے علاّمہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کو ایک مرتّب اور منظّم نظامِ فکر کی حیثیت سے واضح کیا اور ثابت کیا کہ نوعِ انسانی

کا مستقبل اسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۲) برِّصغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی شخصیّت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مُفسّرِ قرآن کی حیثیّت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لیے کہ 'ترجمان القرآن' کی جلد اوّل ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوئی، تاہم اُن کی قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے لیے دعوتِ جہاد کا ڈنکا برِّصغیر کے طول و عرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے بج چکا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ افسوس ہے کہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء میں جب بعض علماء کی مخالفت کے باعث مولانا مرحوم 'امام الہند' کے منصب پر فائز ہوتے ہوتے رہ گئے تو ایک شدید ردِّ عمل اُن کی طبیعت میں پیدا ہوا اور وہ ع

"یہ صُور پھونک کر تم سو گئے کہاں آخر؟"

کے مصداق اس راہ ہی کو تج کر انڈین نیشنل کانگرس کی بھول بُھلیّوں میں گم ہو کر رہ گئے اور اس طرح کم از کم عارضی طور پر برِّصغیر میں قرآنی فکر کے اس دھارے کے سوتے خشک ہو گئے! (مزید افسوسناک امر یہ کہ گاندھی جی کی شخصیّت کے زیرِ اثر مولانا مرحوم 'وحدتِ ادیان' کے بھی پرچارک بن گئے۔ اور اس طرح گویا 'برہمو سماج' کی تقویّت کا ذریعہ بن گئے!)

تاہم 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوت اتنی بودی اور بے جان نہ تھی کہ اس طرح ختم ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ایک دوسری فعّال شخصیّت کی صورت میں ظہور کر لیا جس نے اوّلاً مولانا آزاد مرحوم کے نعرۂ جہاد کو ایک مبسوط تصنیف کا موضوع بنایا اور 'الجہاد فی الاسلام' ایسی معرکۃ الآرا کتاب بالکل نوعمری میں لکھ ڈالی اور پھر ۱۹۳۲ء سے مولانا آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' کے ہم نام ماہنامے کے ذریعے قرآن حکیم کی ترجمانی اور خاص طور پر اس کی انقلابی دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ یہ ہیں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی جنہوں نے ایک طرف 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' کے نصب العین کے پیشِ نظر ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' قائم کی اور دوسری طرف 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قرآن مجید کی تعلیمات اور خصوصاً اُس کی انقلابی دعوت کا تعارف برِّصغیر کے طول و عرض میں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نسل کے ایک بہت بڑے حلقے میں کرا دیا ——— اور اگرچہ

اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ اپنے پیشرو کی طرح جو ایک وقتی سی رکاوٹ سے بددل ہو کر کانٹا ہی بدل گیا تھا، مولانا مودودی بھی قیامِ پاکستان کے وقت کچھ فوری سی توقعات اور وقتی سے امکانات سے دھوکہ کھا کر پاکستانی سیاست کے گرداب میں کود پڑے۔ اور پورے تیس برس ہونے کو آئے کہ وہ پوری جماعت سمیت اسی صحرائے تیہہ میں سرگرداں ہیں (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چالیس سال پورے کر کے بھی انہیں یا اُن کی جماعت کو اس صحرا نوردی سے نجات ملے گی یا نہیں ؟) ——— اور اس پر بھی جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ عمر کے آخری مرحلے میں 'خلافت اور ملوکیت' نامی تالیف کے ذریعے مولانا مودودی رفض اور تشیّع کی تقویت کا موجب بن گئے، تاہم اُن کی خدمات بالکل رائیگاں جانے والی نہیں ہیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کے غلبے کی آرزو پیدا کی ہے اور ہزاروں کو اس جدوجہد میں عملاً مبتلا کیا ہے۔ اور اگرچہ ایک غلط فیصلے اور اس پر بیجا اصرار نے اُن کی چالیس سالہ مساعی کو غلط رُخ پر ڈال کر رکھ دیا ہے تاہم قرآن کی انقلابی دعوت کا جو صور اُنہوں نے پھونکا ہے وہ یقیناً بہت سے دلوں کو گرماتا رہے گا اور کیا عجب کہ ابوالکلام آزاد مرحوم ثُمَّ ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ دعوتِ جہاد پھر کسی گوشے سے نئی آب و تاب اور تازہ جوش و خروش کے ساتھ اُبھرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

(۳) وہ عظیم شخصیت جس سے برِّ صغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا سوتا پھوٹتا، مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کا حسین ترین امتزاج اُن ہی کی ذات میں ہوا۔ انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اُس دَور کے چوٹی کے علماء سے فارسی، عربی اور دینی علوم کی تحصیل مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور فکرِ جدید کا مطالعہ براہِ راست کیا۔ اور پھر اُن کی نگاہیں قرآنِ حکیم پر مرتکز ہو گئیں۔ اور انہوں نے باقی پوری زندگی 'حکمتِ قرآنی' کی گہرائیوں میں غوطے لگانے

---

[۱] چنانچہ امام فراہیؒ کی وفات پر جو تعزیتی مضمون مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف شمارہ ۱، ۲ جلد ۲۷ بابت جنوری و فروری ۱۹۳۱ء میں مولانا فراہیؒ ہی کے اس شعر کو عنوان بنا کر لکھا تھا کہ

فغاں کہ گشت نیوشندۂ سخن خاموش   دگر چگونہ تسلّی کنم من ایں لب و گوش

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بسر کر دی۔ اور اگرچہ اُن کا مزاج "کاتا اور لے دوڑی" کے بالکل برعکس "نیکی کر دریا میں ڈال" والا تھا۔ چنانچہ اپنی زندگی میں مفسّر یا مصنّف و مؤلف کی حیثیت سے شہرت پانے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی بلکہ جو کچھ لکھا اُسے حوالۂ صندوق کرتے چلے گئے۔ تاہم اُن کی جو چند مختصر چیزیں اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوئیں، انہوں نے اُن کے 'تدبّرِ قرآن' کا لوہا وقت کے چوٹی کے علماء و فضلاء سے منوا لیا۔ اور اُن کی مساعی کا اصل حاصل یہ برآمد ہوا کہ 'تدبّرِ قرآن' کا صحیح نہج واضح ہو گیا اور قرآنِ حکیم کے معدنِ علم و حکمت سے معرفت کے ہیرے جواہرات نکالنے کا صحیح طریق معیّن ہو گیا۔

مولانا فراہیؒ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان یہ ہوا کہ انہیں ایسے شاگرد بھی میسّر آ گئے جنہیں اُنہوں نے اپنے طرز پر غور و فکر کی تربیت خود دے کر تیار کر دیا تا کہ وہ اُن کے بعد ان کی روشن کی ہوئی راہ پر آگے بڑھ سکیں۔ اُن کے اِن تلامذہ میں سب سے نمایاں مقام تو حاصل ہے مولانا امین احسن اصلاحی کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ 'حقیقتِ شرک'، 'حقیقتِ توحید'، 'حقیقتِ تقویٰ' اور 'حقیقتِ نماز' ایسی گرانمایہ تصانیف کے ذریعے خالص قرآنی علم کلام کی تدوین کی راہ کھول

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس کے مندرجہ ذیل ابتدائی الفاظ قابلِ توجہ ہیں: "اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کل وہ تھے جن کی ولادت اور نشو و نما انقلابِ زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم و فہم میں عہدِ حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علمِ کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سُنی سنائی باتیں تھیں لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی شروع کی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ ؏
"جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا" نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا چھپا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا حال یہ تھا کہ اس نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے مگر وہ وہ تھے جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں

دی (مولانا کی یہ چاروں تصانیف اب یکجا 'حقیقتِ دین' کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں) بلکہ خواہ عمر کے آخری حصے میں سہی، اپنے استاذ کے اصول پر باقاعدہ تفسیر 'تدبرِ قرآن' بھی تحریر کردی (جو اب بحمد اللہ تکمیل کو پہنچنے ہی والی ہے) اور دوسرے نمبر پر ہیں مولانا صدر الدین اصلاحی جو بھارت ہی میں مقیم ہیں۔

بے لگام اور مادر پدر آزاد متجددین اور روایت پرست و قدامت پسند علماء کے بین بین 'فکرِ قرآنی' کے یہ تین دھارے جو برِ صغیر پاک و ہند کے محیطِ علمی میں بہہ رہے ہیں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں۔

اِن میں سے مؤخر الذکر دو دھارے تو درحقیقت پھوٹے ہی ایک عظیم اور گھمبیر شخصیت سے ہیں جس نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض ہی سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا تھا۔ ہماری مراد علامہ شبلی نعمانی مرحوم سے ہے جنہیں مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم دونوں کے مُربّی کی حیثیت حاصل ہے ——— ہم نے اب سے لگ بھگ آٹھ سال قبل ایک مفصّل مضمون ان ہی صفحات میں تحریر کیا تھا جس میں علامہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے ذاتی میلانات اور علمی و فکری رُجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا جس کی تصویب مولانا عبد الماجد دریابادی نے، جنہیں بلاشبہ اس قافلے کے آخری مسافر کی حیثیت حاصل ہے' ان الفاظ میں کی تھی:۔

> "۔۔۔۔ حیرت ہوگئی، شبلی، فراہی، ابوالکلام تینوں کی یہ نبّاضی بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کرلی! ؏ درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شُنید!"

اس تحریر کا حسبِ ذیل اقتباس طوالت کے باوصف، ان شاء اللہ، قارئین پر گراں نہ گذرے گا۔

> "مولانا شبلیؒ اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصّفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملّی و قومی سیاست حتّٰی کہ رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ اُن کے اصل جانشین

سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیرِ اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو اُن کی بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلیؒ کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اُجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدّین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؔ سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہِ راست تو ندوی نہیں لیکن ان کی تربیّت میں مولانا کا بڑا حصّہ ہے ——— اور چونکہ برّصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے اِن ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدّد اُمور بطورِ قدرِ مشترک بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ دونوں کی تربیّت میں مولانا شبلی کا حصّہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآنِ حکیم سے خاص شغف تھا تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلیؒ کے بالکل برعکس ——— جنہوں نے اپنی 'حنفیّت' کی شدّت کے اظہار کے لیے 'نُعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصلی ذہنی و علمی مناسبت امام ابنِ تیمیہؒ سے تھی لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جب کہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہدِ خشک تھے۔ مولانا آزاد کی وضع داری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی، جبکہ مولانا فراہیؒ پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزاد 'ابوالکلام' تھے اور اُن کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اُگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور عربیّت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلّل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی اُن کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکّر کا رہا ——— چنانچہ مولانا آزاد طوطیٔ ہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امامُ الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے اُن کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ——— لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اُٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی اُن کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرزِ فکر، اور

مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرۂ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقّع ہے۔ پھر سورۂ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ بایں ہمہ قرآنِ حکیم کا کوئی مرتّب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآنِ حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبرِ قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سرِ نَو مرتّب و مدّون کیے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تاحال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتہً قرآنِ حکیم کی روشنی میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھ دی۔"

قصہ مختصر ــــــــ علامہ شبلی نعمانیؒ، امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مابین قربت و یگانگت کا یہی رشتہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" کے نصب العین کے پیشِ نظر 'جماعتِ اسلامی' کی تاسیس کی تو ان کی دعوت پر نہ صرف یہ کہ مولانا فراہیؒ کے تمام نمایاں شاگرد بشمول مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، اور مولانا صدر الدّین اصلاحی لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے بلکہ مولانا شبلیؒ کے تلمیذِ رشید مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے دو ارشد تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ بھی ــــــ "من نیز حاضر می شوم۔۔" کے مصداق بن گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس 'قران السّعدین' سے بہت سی برکتیں ظہور میں آئیں جن کا نمایاں ترین مظہر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تالیف 'دعوتِ دین اور اس کا طریق کار' ہے جس میں ایک جانب مولانا فراہیؒ کے قرآنی غور و فکر کا تعمّق موجود ہے تو دوسری جانب مولانا آزاد مرحوم کا داعیانہ جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اور اسی کے ذیل میں آتی ہیں مولانا صدر الدّین اصلاحی کی بعض تصانیف جیسے 'فریضۂ اقامتِ دین' ـــــ 'حقیقتِ نفاق' ـــــ اور 'اساسِ دین کی تعمیر' وغیرہ۔

رہا 'فکرِ قرآنی' کا اوّل الذکر دھارا جس میں علامہ اقبال مرحوم کو تن تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا بقیہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلق اِس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و شاداب خطّے میں اقامت گزیں ہونے کی دعوت علامہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علامہ مرحوم کے سب سے بڑے بلکہ غالباً صحیح تر الفاظ میں واحد شیدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں۔

مزید برآں، پنجاب میں مولانا مودودی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی دعوت اور جماعت دونوں کو جو فروغ نصیب ہوا بعض دوسرے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ اس کا اہم ترین سبب یہی ہے کہ یہاں علامہ اقبال مرحوم اپنے اشعار کے ذریعے گویا قلوب کی دنیا میں ہل چلا چکے تھے اور اب زمین منتظر تھی کہ کوئی آئے اور بیج ڈالے اور یہ اپنے خزانے اُگل کر رکھ دے! بخصوصاً پنجاب کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو گویا اس "دگر دانائے راز" کے لیے چشم براہ تھا جس کا ذکر بہ شدید حسرت و یاس علامہ مرحوم نے مرتے دَم کیا تھا!

باب چہارم

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کا مؤسّس

اور

اس کے فکر کے عناصرِ اربعہ

- فکرِ قرآنی کے چار سلسلوں کا قِران
- چاروں سلسلوں کی بعض اہم شخصیّتوں سے ذاتی روابط ——— اور
- دو اہم شخصیتوں سے وصل و فصل کی داستان۔

اِن سطوُر کے ناکارہ وناچیز راقم کو اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نوجوانی ہی کے دَور میں ایسے مواقع پیدا فرما دیئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بساط کے مطابق "فکرِ قرآنی" کے متذکرہ بالا تینوں درمیانی دھاروں سے متعارف و مستفید ہوا بلکہ حضرت شیخ الہند رح کے ترجمے اور مولانا شبّیر احمد عثمانی رح کے حواشی کی وساطت سے اس کا ذہنی رشتہ کم از کم تفسیرِ قرآن کی حد تک ان علماءِ ربّانیین کے حلقے سے بھی قائم ہو گیا۔ جو بلاشبہ "اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کہلانے کے مستحق ہیں ——— نتیجۃً بفضل اللّٰہ وعونہٗ اس کی ذات میں بقدرِ وسعتِ ظرف ان "انہارِ ثلٰثہ"، کے ساتھ ساتھ یہ چوتھا "چشمۂ صافی" بھی رَواں دَواں ہے ——— فللّٰہ الحمد والمنّۃ ۔

جذباتی سطح پر راقم کی شخصیّت پر سب سے پہلی اور سب سے گہری چھاپ علاّمہ اقبال مرحوم کے اردو کلام کی ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا پُورا زمانۂ طالب علمی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) احقر نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے اشعار پڑھتے اور گنگناتے ہوئے بسر کیا جس سے ایک جذبۂ ملّی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور چونکہ اس وقت اس جذبے کے مظہرِ اتّم کی حیثیّت تحریکِ پاکستان کو حاصل تھی لہٰذا اس دَور میں اپنی بساط کے مطابق عملی وابستگی تحریکِ مسلم لیگ کی تنظیمِ طلبہ یعنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ رہی۔ تاہم اِسی دَور کے اواخر میں راقم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور "الہلال اور البلاغ" والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی ——— مولانا مودودی کی تحریریں میں سے یُوں تو جو کچھ بھی اس وقت پڑھنے میں آیا بھلا ہی لگا لیکن الحمدللہ کہ ان کے ساتھ راقم کا اصل ذہنی و قلبی رشتہ "تفہیم القرآن" کے ذریعے قائم ہوا جس کے ضمن میں تقسیمِ ہند

کے قریب کے زمانے میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' میں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی۔ اِس ذہنی و قلبی تعلّق کی گہرائی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ملک کے ہنگاموں اور آگ اور خون کی وادیوں سے گزر کر جیسے ہی پاکستان پہنچنا نصیب ہوا، راقم ان کی تحریک سے وابستہ ہو گیا اور ایک جانب تو اس نے چند ماہ کے اندر اندر ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس طور سے پڑھ ڈالا کہ مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالویؒ کے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ ان کی تصانیف کا "فارغ التحصیل" ہو گیا بلکہ ان کا "مُدرّس" بھی بن گیا۔ اور دوسری طرف زمانہ طالب علمی کے بقیہ سات سال (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء) ان کی تحریکِ اسلامی کے نذر کر دیئے اور اپنی بیشتر قوتیں اور توانائیاں اسلامی جمعیّتِ طلبہ کے ساتھ عملی وابستگی میں کھپا دیں — اس دَور کے تقریباً وسط میں (۵۰-۱۹۵۱ء کے لگ بھگ) راقم کا ذہنی رابطہ مولانا امین احسن اصلاحی سے قائم ہوا۔ مولانا کی تحریروں کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے حلقوں میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ ثقیل بھی ہوتی ہیں اور خشک بھی، لیکن اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے جو قلبی اُنس راقم کو اس وقت تک قرآن مجید کے ساتھ حاصل ہو چکا تھا اس کی بناء پر اسے ان تحریروں میں نہ ثقل کا احساس ہوا نہ خشکی کا۔ مولانا کی تحریریں بھی یوں تو راقم نے سب ہی پڑھ ڈالیں لیکن ان کی دو تصانیف سے تو اسے عشق کی حد تک لگاؤ ہو گیا۔ ایک 'دعوتِ دین اور اُس کا طریقِ کار' اور دوسری 'تدبّرِ قرآن' (جواب 'مبادیٔ تدبّرِ قرآن' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے) مولانا کی ان تصانیف کے مطالعے سے بلاشائبہ ریب و شک راقم کے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی تعلّق میں ایک نئے بُعد و عرض (DIMENSION) کا اضافہ ہوا اور پھر جب ۱۹۵۴ء کے لگ بھگ مولانا کا ترجمہ کردہ 'مجموعۂ تفاسیرِ فراہی' شائع ہوا تب تو راقم کو تفسیرِ قرآن کے اس مکتبِ فکر کے اصل منبع و سرچشمہ تک رسائی حاصل ہو گئی فللّٰہ الحمد ——— اسی زمانۂ طالبِ علمی کے دَوران احقر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبّیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سے متعارف ہوا (یاد ہو گا، اس کا ایک نہایت اعلیٰ اور حسین و جمیل ایڈیشن کراچی کے بعض اہلِ خیر نے ہانگ کانگ سے طبع کرا کے مفت تقسیم کیا تھا جو بعد میں فی نسخہ پانچ روپے سے لے کر تیس ۳۰ روپے تک میں فروخت بھی ہوتا رہا!) مولانا عثمانیؒ کے بظاہر حد درجہ سادہ و سلیس حواشی

میں راقم کو فکر و نظر کی جو گہرائی اور گیرائی نظر آئی اور خصوصاً احوالِ باطنی کی جو چاشنی یا بالفاظِ دیگر تصوّف کی جو حلاوت محسوس ہوئی اس سے اس کی "نسبتِ قرآنی" کو بفضل اللہ تعالیٰ و عونہٖ عرضِ ثالث (THIRD DIMENSION) عطا ہو گیا ــــــ اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانۂ طالب علمی ہی میں اس عاجز و ناکارہ کو نہ صرف یہ کہ قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک اُنسِ قلبی عطا ہو گیا اور مناسبتِ ذہنی حاصل ہو گئی بلکہ ایک نسبتِ روحانی بھی نصیب ہو گئی اور اس کے پڑھنے اور پڑھانے (تعلیم و تعلّم) کا ایک شدید داعیہ بھی اس کے باطن میں پیدا ہو گیا چنانچہ اولاً جمعیّتِ طلبہ کے حلقوں میں اور پھر جماعتِ اسلامی کے ساہیوال اور اوکاڑہ کے حلقے میں اس کے 'درسِ قرآن' کا چرچا ہو گیا۔ اور اس کے بارے میں بالعموم ایک خوشگوار حیرت (PLEASANT SURPRISE) کا سا تأثر ظاہر کیا جانے لگا ــــــ دورِ طالب علمی کے اختتام کے تقریباً معاً بعد راقم کا تعارف ایک تو ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم سے ان کی تالیف 'قرآن اور علمِ جدید' کی وساطت سے ہوا اور دوسرے ایک بالکل 'دوسرے' علّامہ اقبال سے ان کے خطبات 'RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM' کے حوالے سے اور راقم کو اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ اس سے اس کے مطالعۂ قرآن کو وہ بُعدِ رابع (FOURTH DIMENSION) ملا، جس کی اہمیّت زمانۂ حال کے اعتبار سے پہلے تینوں ابعاض و ابعاد سے کسی طرح کم نہیں ــــــ اب خواہ اسے کوئی بانداز تحقیر راقم کے مطالعۂ قرآن کا 'حدودِ اربعہ' کہہ لے خواہ بطرزِ استہزاء اسے اس کا 'مبلغِ علم' قرار دے لے، بہرحال واقعہ یہی ہے کہ راقم کی قرآنی 'سوچ' کا اصل تانا بانا ان ہی 'ابعادِ اربعہ' سے تیار ہوا ہے جن کی محکم اور پختہ اساسات ۶۱-۱۹۶۲ء کے آس پاس قائم ہو چکی تھیں جبکہ راقم کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ بعد کے چودہ پندرہ سالوں کے دَوران اللہ کا فضل و کرم ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان اساسات میں سے کوئی بھی منہدم تو کجا مضمحل یا شکستہ تک نہیں ہوئی بلکہ بحمد اللہ چاروں ہی کو مسلسل تقویّت ملتی رہی اور استحکام حاصل ہوتا رہا۔ اور بجائے اس کے کہ: ع

"جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا!"

کے مصداق کسی نئے زاویۂ فکر سے متعارف ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پچھلی سوچ اور اس سے حاصل

شدہ نتائج بالکل زائل ہو جاتے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر نیا اندازِ فکر سابق فکر میں ایک ارتقائی شان پیدا کرتا چلا گیا۔ اور یہ عمارت اپنے اطراف و جوانب سمیت بلند ہوتی گئی ـــــــ اس ہمہ جہتی استحکام و ارتقاء کے ضمن میں واقعہ یہ ہے راقم سب سے بڑھ کر مرہونِ منّت ہے علامّہ اقبال مرحوم کے فارسی کلام کا۔ جس کے اعتبار سے علامّہ موصوف یقیناً 'رومیٔ ثانی' بھی ہیں اور مجسّم 'ترجمان القرآن' بھی۔ اور اس سلسلے میں شدید ناانصافی ہو گی اگر ذکر نہ کر دیا جائے کہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران راقم کو فائدہ پہنچا مولانا برکات احمد خاں مرحوم (ٹونکی ثمّ ساہیوالی) کی ہمنشینی سے اور بعد کے دس سالوں کے دوران فیض حاصل ہوا پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی صحبت سے

الغرض ـــــ راقم کے فکر و نظر پر "ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ" کے مصداق ابتدائی اور تکمیلی چھاپ تو ہے علامّہ اقبال مرحوم کی ـــ ان میں سے ابتدائی تأثر زیادہ تر جذباتی ہے جس کا حاصل ہے 'جذبۂ ملّی' اور تکمیلی رنگ خالص فکری ہے جس کا موضوع ہے فکرِ جدید کے پس منظر میں قرآنِ حکیم کا مطالعہ یا قرآنِ حکیم کی روشنی میں فکرِ جدید کا جائزہ و تجزیہ ـــ اور ان کے مابین رواں ہیں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی 'قرآنی دعوتِ جہاد و انقلاب' اور امام حمید الدّین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے 'طریقِ تدبّرِ قرآن' اور حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا شبّیر احمد عثمانیؒ کے 'علمِ راسخ' کے کوثر و تسنیم ایسے چشمے ـــــ

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔

راقم حیران ہے کہ کس منہ سے اور کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے۔ ایک اَن پڑھ یا نیم خواندہ انسان پر جسے اپنی نسبتِ 'امّیّت' پر فخر ہے انعامات و اکرامات کی یہ بارش! بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم ع

"اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!"

برِّصغیر پاک و ہند کے بیسویں صدی عیسوی کے 'فکرِ قرآنی' کے متذکرہ بالا "سلاسلِ اربعہ" کے اعاظمِ رجال اور "السابقون الاوّلون" کی اکثریّت کا انتقال تو راقم الحروف کی پیدائش یا شعور کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہو چکا تھا لہٰذا ان کی زیارت سے تو محرومی ہی رہی۔ البتہ ان کے "مُتّبِعینَ بِاِحْسَان" کی اکثریّت کے ساتھ قریبی تعلّق بلکہ ذاتی و نجی روابط کی سعادت اس عاجز کو حاصل رہی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال راقم کی پیدائش سے لگ بھگ بارہ ۱۲ سال قبل ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ راقم کا ذہنی و قلبی رشتہ کُل کا کُل 'غائبانہ' ہے۔ بایں ہمہ ان کی عظمت کے جو نقوش اس عاجز کے قلب پر کندہ ہیں اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ راقم کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیتِ کبریٰ کا عکسِ کامل اُن کی شخصیّت میں نظر آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امام الہند کی جامعیّت کا مظہر ان کی تصانیف ہیں اور شیخ الہندؒ کی جامعیّت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔ اگر یہ اُصول درست ہے اور لازماً درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ذرا پہچاننے کی کوشش کیجئے اس شخص کی عظمت کو جس کا جانشین جہادِ حریّت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں ہوا مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسا مجاہدِ اعظم۔ اور حدیث، فقہ، اُصول اور کلام کے میدان میں ہوا مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ ایسا نابغۂ روزگار انسان۔ اور جس کے فہمِ قرآن اور جذبۂ ملّی کا ظہور ہوا مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ ایسی عظیم شخصیّت میں اور جس کے انقلابی کردار نے رُوپ دھارا مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ایسے سیماب وش انسان کا۔ راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیّت کو ان کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی کما حقّہٗ نہیں پہچانا ——— ورنہ ذرا غور کیا جائے تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدّد وہ ہیں! ——— واللہ اعلم!

مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ کا انتقال تو اگرچہ راقم کے سنِّ شعور کو پہنچنے کے بعد ہوا لیکن افسوس کہ ان کی زیارت سے بھی محرومی ہی رہی۔ تاہم ایک خیال اطمینانِ قلب کا موجب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ذرّے کو آفتاب سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو اس عاجز کو بھی ان کے ساتھ ایک نسبتِ معنوی حاصل ہے۔ بایں طور کہ جب وہ تحریکِ پاکستان کے صفِ اوّل کے قائد کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض کا دَورہ کر رہے تھے تو یہ خاکسار بھی خواہ ایک طفلِ مکتب کی

حیثیت ہی سے سہی مشرقی پنجاب کے ایک ضلع (حصار) کے مختلف قصبات (سرسہ، ہانسی وغیرہ) کے ہائی اسکول کے طلبہ کے مابین ایک رابطہ استوار کرنے کی سعی میں مشغول تھا ـــــ بعدازاں ان کے تفسیری حواشی کی بدولت ان کی جو معنوی صحبت حاصل رہی اس کا ذکر اُوپر ہو ہی چکا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کے رفیقِ کار اور معتمدِ خاص مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ملاقات کا شرف البتہ راقم کو حاصل رہا اور ان کی شفقت و محبت سے بھی اس عاجز نے حصہ پایا۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگردِ رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی نیاز مندی کی سعادت بھی راقم کو حاصل رہی اور اُن کی شفقت اور نظرِ کرم بھی اس ناچیز کا سرمایۂ افتخار رہی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض کے دوسرے دو چشموں سے بھی راقم بحمداللہ بیگانہ و نابلد نہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مولانا سیّد حامد میاں مدظلّہ، اور مولانا سندھی مرحوم کے شاگردِ رشید مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلفُ الرّشید مولانا عبیداللہ انورؔ کی نیاز مندی، اور گاہے گاہے اُن کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی راقم کو حاصل رہا گویا:

"الرّاسخون فی العلم" کے اس سلسلے کے ساتھ راقم کا معاملہ اس عربی شعر کے مصداق رہا کہ؎

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحاً

علامہ اقبال کے انتقال کے وقت بھی راقم کی عمر چھ برس تھی لیکن اب یہ بات خود اس عاجز کو نہایت عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے انتقال کو راقم نے ایک ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں کہ اِس عالمِ فانی میں آنے سے قبل عالمِ ارواح میں جن ارواح کے مابین اُنس پیدا ہو جاتا ہے اُن کے مابین مودّت کا رشتہ اِس عالمِ اجساد میں بھی برقرار رہتا ہے ـــــ بہر حال علامہ مرحوم کے ساتھ راقم کا قلبی تعلق کم و بیش "مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ" والا ہے۔ اور اُوپر عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ راقم کے شعور کی تحتانی سطحوں میں سے سب سے نچلی تہہ پر نقوش ثبت ہیں علامہ مرحوم کے اُردو اشعار کے اور اس کے فکر کی بلند ترین سطح پر کندہ ہیں نقوش اُن کے فارسی کلام کے۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کی ملاقات فلسفۂ اقبال کے مدوّن و شارح، اور 'حکمتِ اقبال' کے مصنف ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم سے ہوئی تو دونوں ہی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دُوسرے سے

بہت پہلے سے واقف ہیں۔ اور جب بھی گفتگو ہوئی یہی محسوس ہوا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ڈھائی سال نہایت قریبی تعلّق راقم کو ڈاکٹر صاحب مرحوم سے حاصل رہا۔ (’میثاق‘ کے اس دَور کے فائل اس پر شاہدِ عادل ہیں!) اُس زمانے میں ”اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام“ راقم کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی حرف بحرف تصویب ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اور ’میثاق‘ کے لیے اپنی تصنیف 'MANIFESTO OF ISLAM' کا ترجمہ اُردو میں خود ہی کرنا شروع کر دیا۔ جس کی چند ہی قسطیں چھپنے پائی تھیں کہ ع

”آں قدح بشکست و آں ساقی نماند“

والا معاملہ ہو گیا۔ یغفر اللہ لنا ولہٗ ویدخلہ فی رحمتہٖ۔

اسی طرح کلامِ اقبالؔ کے شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور سے جو ذاتی ربط و تعلّق ۱۹۶۶ء میں استوار ہوا تھا وہ بحمد اللہ ان کی وفات تک قائم رہا (یہاں تک کہ بعض واقفینِ حال تو واقعۃً حیرت کا اظہار کرتے رہے کہ پروفیسر صاحب ایسے نازک طبع اور تنک مزاج بزرگ سے راقم کا تعلّق کیسے نبھ رہا ہے) پروفیسر صاحب نے راقم کی تحریر ”نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام“ کی جو مفصّل تائید و تحسین تحریر کی تھی وہ تو بہت سے لوگوں کے علم میں ہے‘ زبانی جو کچھ فرمایا تھا اسے اس خوف سے نقل نہیں کر سکتا کہ اسے خود ستائی پر محمول کیا جائے گا۔

مولانا ابو الکلام آزادؔ مرحوم کا انتقال ویسے تو ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ لیکن راقم کو جس ابو الکلام سے دلچسپی تھی یا ہے یعنی ’الہلال‘ اور ’البلاغ‘ والا ابو الکلام جس کے بارے میں کمالِ وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے کہ ”اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا!“ وہ واقعۃً ۲۱-۱۹۲۲ء کے لگ بھگ ہی وفات پا چکا تھا اور اس کے معنوی خلیفہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے جب اس کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کا بیڑا اُٹھایا تو اُسے بجا طور پر اس کی زندگی ہی میں ”مرحوم“ قرار دے دیا تھا ـــــ تاہم مولانا مرحوم کو دیکھنے کی تمنا راقم کے دل میں مستقل طور پر رہی جسے دو ملکوں کے فاصلے نے بالآخر ۱۹۵۸ء میں حسرت میں تبدیل کر دیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولانا مودودی نے مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر کے ہم نام ماہنامے 'ترجمان القرآن' کی ادارت سنبھالی وہی راقم کا سنّ پیدائش ہے اور مولانا آزاد کے انتقال کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جب کم وبیش دس سال کی ہم سفری کے بعد راقم کی راہ مولانا مودودی کے راستے سے جُدا ہوئی۔

مولانا مودودی مرحوم ومغفور کے ساتھ راقم کے وصل وفصل کی داستان نہایت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک نہایت قریبی تعلق راقم کو مولانا کے ساتھ حاصل رہا۔ ان میں سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دو سالوں کے دَوران جبکہ راقم اسلامی جمعیتِ طلبہ کے صفِ اوّل کے کارکنوں میں سے تھا، مولانا سے قُرب کا یہ عالم تھا کہ راقم جب چاہتا تھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر فوری مشورے کے لیے راقم الحروف نے مولانا سے نصف شب کے لگ بھگ اُن کی خوابگاہ میں بھی ملاقات کی ۔ ۵۵ءمیں راقم جماعتِ اسلامی کا رکن بنا اور بدقسمتی سے اس کے فوراً بعد ہی اس نے شدّت کے ساتھ محسوس کر لیا کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک اپنی اصل اساسات سے منحرف ہو چکی ہے۔ اواخر ۱۹۵۶ء میں راقم نے اپنا وہ مفصّل بیان سپردِ قلم کیا جو اب 'تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے' فروری ۱۹۵۷ء میں اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں راقم نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اور حالات کی ستم ظریفی نے اس وقت صورت کچھ ایسی پیدا کر دی کہ گویا مولانا 'لیڈر آف دی ہاؤس' تھے اور یہ خاکسار 'لیڈر آف دی اپوزیشن'! چنانچہ راؤ خورشید علی خان مرحوم نے جو اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کی صفِ اوّل کے قائدین میں سے تھے، بھرے اجلاس میں باقاعدہ یہ الفاظ کہے بھی تھے کہ "ڈاکٹر اسرار کو لیڈر آف دی اپوزیشن کی حیثیت حاصل ہے' انہیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے پُورا وقت ملنا چاہیئے!" بہرنوع اپریل ۱۹۵۷ء میں راقم نے جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس طرح وہ دس سالہ تعلّق ختم ہو گیا ——— اب اس 'فصل' کو بھی بیس[۲۰] برس ہونے کو آئے ہیں' اور اس دَوران میں بھی اُونچ نیچ کے بہت سے ادوار آئے لیکن ان سب کا حاصل یہ ہے کہ :

بس اتنا سا تعلّق اب اُن سے رہ گیا ہے ——— وہ مجھ کو جانتے ہیں' مَیں اُن کو جانتا ہوں

آج سے تقریباً دس سال قبل جب رحیم یار خاں میں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے

چند حضرات کے اجتماع میں "ایک نئی اسلامی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ راقم نے بعض معروضات 'میثاق' کے صفحات میں مولانا مودودی کی خدمت میں پیش کی تھیں ——— راقم کے احساسات اب بھی بالکل وہی ہیں اور اب جبکہ "تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ دوبارہ تشکیل پا کر سفر کا آغاز کر چکا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان معروضات کو من و عن دہرا دیا جائے ——— وَھُوَ ھٰذَا:

"اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گذارش راقم الحروف جماعتِ اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران راقم الحروف کے بعض اقدامات اور اس کی بعض تحریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہو گی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دل آزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہارِ دینِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمرِ عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جدوجہد کی نذر کیے۔ پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رُخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں اپنے خیالات کو قلم بند کیا اور آپ سے درخواست کی کہ: "ابھی تو کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس کا واسطہ دے سکوں، آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو پڑھ ضرور لیں"۔ ——— ماچھی گوٹھ کے بھرے اجتماع میں سٹیج پر اعلان کیا کہ: "اگرچہ مجھے اپنے موقف کی صحت کا یقین ہے اور امیر جماعت کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ تاہم میں جماعت میں شامل رہوں گا اس لیے کہ اس کے بغیر میں اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔ لیکن پھر جب کچھ آپ کی 'عنایتوں' میں مزید اضافہ ہوا اور آپ نے اہلِ اختلاف پر ضعفِ ارادہ بسیط اور ضعفِ ارادہ مرکب کی پھبتیاں چست کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہوا کہ جماعت میں عضوِ معطل کی حیثیت سے رہنا آخر چہ سود؟ تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی کہ: "میں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا"! علیحدہ ہونے کے بعد بھی کم و بیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس قلبی کیفیت کا اظہار بھی کیا تھا۔ افسوس کہ اس کے فوراً بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک غلافِ کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط و تعلق کی بدولت دل کی یہ کیفیت برقرار نہ رہ سکی اور ذہنی دوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُعد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصے کی بھی آمیزش تھی۔ اب

"خلافت وملوکیت" لکھ کر عمر کے آخری حصّے میں جو کمائی آپ نے کی ہے اُس کی وجہ سے غصّے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کانپنے لگتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ:۔۔۔۔۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۔ بایں ہمہ! اب جب کہ ہم آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیاز مند دین کی چھوٹی بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے۔ اگرچہ فرمانِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم کہ "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" کی رُو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں اُن پر لامحالہ تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا"

مولانا حمید الدّین فراہیؒ کا انتقال بھی راقم کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہوگیا تھا۔ اور غالباً ۱۹۵۳ء/۱۹۵۴ء تک راقم مولانا کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ بعد میں جب مولانا امین احسن اصلاحی کی وساطت سے ان سے تعارف ہوا اور ان کی تحریریں بھی دیکھنے میں آئیں اور اُن کے حالاتِ زندگی بھی معلوم ہوئے تو اندازہ ہوا کہ واقعۃً ایک نہایت عظیم ہستی تھی جو نہایت خاموشی کے ساتھ قرآنِ حکیم پر غور وفکر اور تدبّر وتفکّر کی ایک بالکل نئی طرح ڈال کر رخصت ہوگئی۔ اُن کی شخصیّت کا جو ہیولیٰ راقم الحروف کے تصوّر میں اُبھرتا ہے وہ سقراط سے بہت مشابہ ہے۔ ایک حکیم ودانا اور نیک وپارسا انسان جو لوگوں کی تعریف وتحسین اور تنقید وملامت دونوں سے یکساں بے نیاز ہوا اور یا تو خاموش تعقّل وتفکّر میں غرق ہو یا اپنے چند شاگردوں کو نہایت دھیمے طریق پر اور مکالمے کے سے انداز میں اس طرح درس دے رہا ہو جیسے کوئی بزرگ کسی بچّے کی اُنگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا ہے اور راقم اسے اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اسے حکیمِ فراہیؒ کا نہ سہی اُن کے شاگردِ رشید کا قُرب تقریباً رُبع صدی تک حاصل رہا۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعلّق کا آغاز تو مولانا مودودی کی طرح ۱۹۴۷ء ہی میں ہوگیا تھا۔ (بلکہ راقم نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کو پہلی بار ۱۹۴۶ء میں دارالاسلام پٹھانکوٹ میں دیکھا تھا! جہاں وہ اپنے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیّت میں حاضر ہوا تھا) لیکن ۱۹۵۱ء تک یہ تعلّق کُلّیۃً یک طرفہ تھا یعنی صرف ان کی تقریریں اور درس سُن لینے تک محدود تھا۔ تاآنکہ نومبر

۱۹۵۱ء کی ایک شام کو وائی، ایم سی، اے ہال لاہور میں راقم نے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر مولانا کے زیرِ صدارت اپنی وہ پہلی عوامی تقریر کی جو اب تک جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا اہم جزو ہے اور "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے طبع ہوتی ہے۔ راقم کی اس تقریر کی تعریف و تحسین مولانا نے دل کھول کر فرمائی ——— اور یہیں سے وہ 'یک طرفہ تعلق' باقاعدہ 'دو طرفہ تعلقات' میں تبدیل ہو گیا ——— دسمبر ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۲ء میں جمعیت طلباء کی دو تربیت گاہوں میں راقم ناظم کی حیثیت سے شریک رہا اور مولانا معلّم و مربّی کی حیثیت سے، اس سے ان تعلقات کی گہرائی و گیرائی میں نمایاں اضافہ ہوا ——— بعد کے چار سالوں کے دوران بے تکلف ملاقاتوں سے یہ تعلق مزید اُستوار ہوا ——— ۱۹۵۶ء میں جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نے راقم کے متذکرہ بالا اختلافی بیان کی نہایت شاندار الفاظ میں تصویب و تائید کی۔ اس طرح جماعت میں پالیسی کے بارے میں جو اختلافِ رائے ہوا اس کے ضمن میں بھی ع "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" کے مصداق مولانا اور راقم ایک ہی صف میں شامل ہو گئے ——— ۱۹۵۸ء میں جب مولانا نے بھی جماعت کو خیر باد کہہ دیا اور کسی نئی تعمیر کی فکر میں 'مشاورتوں' کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی مسلسل ساتھ رہا۔ اور اس سلسلے کا اہم ترین اجتماع عزیز ٹینیریز ہڑپہ میں راقم ہی کے زیرِ اہتمام غالباً چار روز تک جاری رہا لیکن افسوس کہ کوئی متفق علیہ نقشہ نہ بن سکا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں راقم ان مشاورتوں کی مسلسل ناکامی سے بددل سا ہو کر ڈاکٹر مسعود الدین حسن عثمانی کی دعوت پر بغیر مولانا کو اطلاع دیئے کراچی منتقل ہو گیا تو ایک حد درجہ محبت بھرا شکوہ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں کیا:

لہ ان 'مشاورتوں' پر ایک نہایت دلچسپ پھبتی اس زمانے میں ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم نے چست کی تھی۔ ہوا یوں کہ ملک صاحب علیل تھے، راقم اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف ان کی عیادت کے لیے ان کے پارک لین، ٹمپل روڈ والے مکان میں حاضر ہوئے تو باتوں باتوں میں ان 'مشاورتوں' کا ذکر بھی آ گیا۔ اس پر ملک صاحب نے یہ لطیفہ سنایا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب نے اپنے خلفاً مجاز کی ایک مشاورت طلب فرمائی اور مشورہ طلب بات یہ پیش کی کہ ع "عمر لیست کہ آوازۂ منصور کہن شد!" آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کیا ہم اس کا اعادہ نہ کر دیں؟ ——— سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ کسی نے اثبات میں کسی نے نفی میں۔ ایک صاحب خاموش رہے۔ حضرت نے ان سے براہِ راست استفسار کیا تو انہوں نے مؤدبانہ گذارش کی کہ "حضرت میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا منصور نے بھی وہ اقدام کسی سے مشورہ لے کر کیا تھا!"

"آپ کے اس خفیہ اقدام کی اطلاع سیال صاحب سے مجھے ہو چکی تھی۔ بہرحال جو کچھ آپ نے کیا اچھا کیا۔ خدا کرے آپ کے مقاصد وہاں پورے ہوں اور آپ کو وہاں دلجمعی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کی فرصت ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ان شاء اللہ آپ کے لیے موجب خیر و برکت ہوگی۔ فرزانوں کے ساتھ نباہ مشکل ہوتا ہے، دیوانے گذارے جاتے ہیں۔ آپ دونوں دیوانے ہیں۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ مجھے جو احساس ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھ سے دُور ہو گئے۔ آپ سے ایک قلبی لگاؤ سا ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے اس بات سے تھوڑی سی تکلیف ہے کہ میں نے جتنا ہی کھینچنا چاہا اتنے ہی آپ کھنچتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کھنچتے کھنچتے کراچی پہنچ گئے۔ خیر صاحب جہاں رہو سلامت رہو اور دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھو۔۔۔!"

۱۹۵۹ء میں اس خیال سے کہ محض ایک سابقہ تعلق کی بنیاد پر نئی تعمیر ممکن نہیں ——— اس کی فکری اساسات کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا جانا چاہیئے۔ مولانا نے ماہنامہ 'میثاق' جاری فرمایا تو راقم اس کے اوّلین معاونین میں بھی شامل تھا اور بعد میں بھی مقدور بھر اعانت کرتا رہا اور دوسری طرف کراچی سے والد صاحب مرحوم کی علالت کے باعث واپسی پر ۱۹۶۰ء میں راقم نے منٹگمری (حال ساہیوال) میں ایک اسلامی ہاسٹل قائم کیا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن کی داغ بیل ڈالی تو مولانا نے راقم کے ان کاموں میں بھرپور تعاون فرمایا۔ ہاسٹل کی تجویز پر ایک مفصّل تائیدی شذرہ 'میثاق' میں تحریر فرمایا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن منٹگمری کی دعوت پر تقریر کے لیے دوبار ساہیوال کے سفر کی زحمت برداشت کی!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک تقریباً چار سال راقم نے دوبارہ ایک دوسرے سلسلے میں کراچی میں بسر کیے۔ اور اس عرصے میں راقم کا رابطہ مولانا سے بہت کم رہا۔ مولانا نے اس دَوران میں بعض دوسرے احباب کے ساتھ مل کر 'مجلس دعوت و اصلاح' کی داغ بیل ڈالی لیکن نہ تو یہ بیل ہی منڈھے چڑھی نہ ہی اجتماعی کام کا کوئی اور نقشہ تیار ہو سکا۔ اس سے بددل ہو کر مولانا نے ذاتی طور پر 'حلقۂ تدبّر قرآن' قائم فرمایا اور اپنی ساری توجہات چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دیں۔ دوسرے احباب سے ان دنوں مولانا کا رابطہ کمزور پڑتے پڑتے معدوم کے حکم میں آ گیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ 'میثاق' نے پہلے تو کچھ عرصے تک ہچکیاں لیں اور بالآخر بالکل دم توڑ دیا ——— یہ حالات تھے جب راقم ۱۹۶۶ء میں دوبارہ وارد لاہور ہوا۔ میثاق بند پڑا تھا، تفسیر کی جلد اوّل تیار تھی لیکن اس کی طباعت و اشاعت کی کوئی سبیل دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی۔ 'حلقۂ تدبّرِ قرآن' میں جن نوجوانوں پر مولانا نے شدید محنت کی تھی وہ سب بسلسلۂ روزگار تتّر بتّر ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کسی ٹریننگ کے سلسلے میں انگلستان جا

چکے تھے دوسرے صاحب کا تبادلہ ڈھاکہ ہو گیا بعض دوسرے لوگ بددل ہو گئے تھے۔ الغرض بالکل؏
"دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"

والا سماں تھا ـــــــــ خود راقم کے سامنے لاہور نقلِ مکانی میں دو مقصد تھے: ایک 'حلقۂ تدبر قرآن' میں شرکت اور مولانا کے سامنے باضابطہ زانوئے تلمّذ تہ کر کے ان سے استفادہ اور دوسرے اس اصل تحریکِ اسلامی کے احیاء کی سعی جو راقم کے خیال کے مطابق جماعتِ اسلامی کے انتقالِ موقف کے باعث مردہ ہو چکی تھی ـــــــــ لاہور آ کر اندازہ ہوا کہ مولانا 'حلقۂ تدبرِ قرآن' سے بھی بد دل ہو چکے ہیں اور اس نہج پر از سرِ نو محنت کی ہمّت اپنے اندر نہیں پاتے ـــــــــ اور اب سارا وقت اور ساری محنت تفسیر کی تسوید پر صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا راقم کا پہلا مقصد تو فوت ہو گیا لیکن ہمّت کر کے 'تدبرِ قرآن' کی جلد اوّل اس نے شائع کر دی اور مولانا نے از راہِ شفقت اس زمانے میں برملا نہ صرف راقم سے کہا بلکہ دوسرے بہت سے احباب و رفقاء کے سامنے فرمایا "کہ اس کا مجھ پر ذاتی احسان ہے"۔ راقم کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر جلد اوّل شائع نہ ہوئی تو آگے لکھنے پر مولانا کی طبیعت مائل نہیں ہوگی اور یہ کام ادھورا رہ جائے گا ـــــــــ

دوسرے مقصد کے ضمن میں راقم نے اوّلاً مولوی محی الدین سلفی مرحوم کی تحریک پر اور ان کے تعاون سے اپنا اختلافی بیان "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور بعد ازاں ایک باضابطہ دعوت کے آغاز کے لیے 'الرسالہ' کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ مولانا کو جب اس کی اطّلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی نیا رسالہ جاری کرنے کی بجائے 'میثاق' ہی کو سنبھال لو، میں تو اسے جاری نہیں رکھ سکتا۔ تم شائع کرتے رہو گے تو کم از کم اس کا نام تو رہے گا۔ 'اِمتثالاً لِلاَمر' راقم نے بہت دوڑ دھوپ سے حاصل کیا ہوا ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور اگست ۱۹۶۶ء سے "زیرِ سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" میثاق کی ادارت سنبھال لی۔

۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے دوران 'میثاق' کے ذریعے راقم نے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ ۱۹۵۶ء ۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی میں جو اختلافِ رائے واقع ہوا تھا اس کی اصل نوعیت کیا تھی اور علیحدہ ہونے والے علیحدگی اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کر دیئے گئے تھے ـــــــــ اور دوسری طرف علیحدہ ہونے والوں کو للکارا کہ اگر وہ جماعتِ اسلامی میں کسی شخصی عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ 'فریضۂ

اقامتِ دین کی ادائیگی کے لیے شامل ہوئے تھے تو جماعت سے علیحدگی سے وہ فرض تو ساقط نہیں ہو گیا۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے مجتمع ہو کر جدّوجہد کریں۔ اس کا بحمد اللہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اواخر ۱۹۶۷ء میں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے بعض احباب کا ایک اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا جس میں "ایک نئی دینی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس اجتماع میں مولانا بھی شریک تھے اور انہوں نے اس موقع پر بھی حسبِ عادت نہایت فراخدلی سے ان لوگوں کو خراجِ تحسین اور ہدیۂ تشکر پیش کیا تھا جنہوں نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مندرجۂ ذیل الفاظ راقم نے ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' کے کور پر نمایاں حیثیت سے شائع کیے تھے:

"عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ مَیں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمّت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔ مَیں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت، اور اہمیّت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی کسی ذمّہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے آخری دَور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام مَیں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اسی پر صَرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود مَیں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمّت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیّت کی طرف توجّہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ مَیں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہرحال اب میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیّت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔" امین احسن اصلاحی۔

لیکن افسوس کہ سابقہ تمام مساعی کی طرح یہ کوشش بھی بالکل ع "اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار

ہم ہوئے"، کے سے انداز میں ناکام ہو کر رہ گئی۔

یہ دَور راقم کی زندگی میں ایک اہم موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس وقت راقم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کسی 'بڑے' کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اور کوئی چلے نہ چلے اور ساتھ دے نہ دے تن تنہا چلنا پڑا تب بھی سفر کا آغاز بہر حال کرنا ہے۔ گویا ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء دس سال مولانا مودودی کے ساتھ اور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء دس سال مولانا اصلاحی کے ساتھ راقم کلّیتہً وکاملۃً وابستہ رہا لیکن ۱۹۶۸ء سے (لگ بھگ چھتیس برس کی عمر میں) اس نے آزادی کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم بحمد اللہ، راقم اپنے ماضی سے منقطع نہیں ہوا اور اس نے ایک جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن پر اپنی تمام تر مساعی صَرف کر دیں اور ان کے ذریعے اصلاً قرآن کی اس انقلابی دعوت کا پرچار کیا جس کے برِّصغیر میں موجودہ صدی کے داعیٔ اوّل تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور جس کے تسلسل کو برقرار رکھا تھا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسری جانب 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے ذریعے اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو کھپا دیا مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کی تصانیف کی اشاعت کے ذریعے تدبّرِ قرآن کے اس اسلوب کی ترویج و اشاعت میں جس کے بانی ہیں مولانا حمید الدّین فراہیؒ اور شارح ہیں مولانا امین احسن اصلاحی ——— لیکن اب چونکہ راقم کسی ایک لکیر کا فقیر نہیں رہا تھا لہٰذا اس کی 'سوچ' کے دوسرے اجزائے ترکیبی بھی سامنے آنے لگے۔ اور ۱۹۶۸ء سے 'میثاق' میں 'افاداتِ فراہیؒ' اور 'تدبّرِ قرآن' کے ساتھ ساتھ نہ صرف مولانا سندھی مرحوم کے تذکرے اور ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم کے 'منشورِ اسلام' بلکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے "ربّانیہ لا رھبانیہ" اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے "حقیقتِ تصوّف" اور "تاریخِ تصوّفِ اسلامی" ایسے مضامین کو بھی جگہ ملنے لگی۔ اور یہی مولانا اصلاحی کی راقم الحروف کی جانب سے گرانیٔ طبع کا سببِ اوّل بن گئی۔ اس لیے کہ مولانا برملا فرمایا کرتے ہیں کہ "میں تصوّف کو کُل کا کُل ضلالت و گمراہی سمجھتا ہوں"! چنانچہ مولانا نے راقم سے مشفقانہ انداز میں فرمانا شروع کیا کہ "عزیزم! تمہارے بارے میں مجھے دو اندیشے لاحق ہیں۔ ایک یہ کہ تم انتہائی ذہین ہو اور دوسرے یہ کہ تمہارے اندر تصوّف کی لٹک موجود ہے"! راقم اسے ہنس کر ٹال دیتا رہا اور مولانا کی مروّت و شرافت کہ وہ تعلّقات کو اپنے بعض شاگردوں اور احباب کی شدید سرگرانی کے علی الرّغم، نباہتے رہے!

۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران اُدھر تو مولانا علیل ہوگئے اور ان کی علالت تشویشناک صورت اختیار کرگئی اور اِدھر راقم کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن وسعت اختیار کرگئے اور اُس کے اعوان وانصار کا ایک خاصا بڑا حلقہ وجود میں آگیا اور بالکل فطری طور پر کسی باقاعدہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے تحت کم ازکم مالی اُمور منضبط کیے جاسکیں۔ یہی ضرورت تھی جس کے تحت مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ راقم اس سے بہت پہلے گہرے غوروخوض کے بعد اس حتمی نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ کسی دینی تنظیم میں شورائیت اُس جمہوری طرز کی نہیں ہونی چاہیے جس میں بقول علاّمہ اقبال مرحوم ع "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" بلکہ اُس طرز کی ہونی چاہیے جو اسلام کے نظام امارت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو جس میں امیر صرف دستوری صدر نہیں بلکہ صاحبِ امر ہوتا ہے۔ چنانچہ بلاخوفِ لومۃ لائم راقم نے اپنے اس خیال کو تحریر وتقریر دونوں صورتوں میں بیان بھی کیا اور انجمن کا مجوّزہ دستوری خاکہ بھی اسی نہج پر تیار کیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جیسے ہی یہ ڈھانچہ 'میثاق' میں شائع ہوا، مولانا بھی بفضلہٖ تعالےٰ صحت یاب ہوگئے۔ اب جو اُن کے علم میں یہ خاکہ آیا تو وہ سخت برہم ہوئے اس لیے کہ اس معاملے میں بھی راقم کی اور ان کی رائے کے مابین بُعدالمشرقین پایا جاتا ہے۔ نتیجۃً وہ دوطرفہ تعلّقات جو بیس سال سے نہایت خوشگوار چلے آرہے تھے ایک شدید بحران (CRISIS) سے دوچار ہوگئے۔ بعض احباب نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن راقم نے صاف عرض کر دیا کہ اُس کی بھی یہ سوچی سمجھی رائے ہے اور اب اس میں تبدیلی صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اسے دلیل سے قائل کر دیا جائے۔ محض پاسِ ادب اور لحاظِ بزرگی کی بنا پر وہ اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ "ھٰذا فراق بینی وبینک" کا آغاز ہوگیا اور اس کے پہلے قدم کے طور پر طے پایا کہ 'میثاق' کے سرورق پر سے "زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" کے الفاظ حذف کر دیئے جائیں۔ تاہم یہ مولانا کی عالی ظرفی ہے کہ اس کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ذاتی تعلّقات برقرار رہے بلکہ جزوی تعاون بھی جاری رہا۔

مارچ ۱۹۷۳ء سے انجمن خدّام القرآن کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اس میں راقم نے تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو صدارت یا خطاب کے لیے دعوت دی جسے ان کی اکثریت نے ازراہِ شفقت وعنایت منظور فرمالیا۔ یہ چیز راقم کے اور مولانا کے مابین مزید بُعد وفصل کا سبب بن گئی۔

ان کا فرمانا یہ تھا کہ "ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے ؟ ان ہی کے خیالات و تصوّرات کی تو ہمیں تردید کرنی ہے!" راقم نے اسے بھی خاموشی سے سنا اَن سنا کر دیا اس لیے کہ اُس کی طبیعت کا رُخ جیسا کہ اُوپر تفصیل سے بیان ہو چکا، بالکل دُوسرا ہے۔ تاہم اُس نے محسُوس کر لیا کہ اب مولانا کے مزاج میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے۔

جولائی ۷۴ء میں راقم نے اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ یہ چھوٹی سی تحریکِ اسلامی جس کا آغاز 'دعوتِ رجوع الی القرآن' سے ہوا تھا اور جس نے پہلی تنظیمی ہیئت 'انجمن خدام القرآن' کی صورت میں اختیار کی تھی اگلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھے اور ٹھیٹھ دینی اصُولوں پر جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس کا ہیولیٰ راقم کے پیشِ نظر وہی تھا جو ۶۷ء میں اجتماع رحیم یار خاں میں طے پایا تھا۔ چنانچہ 'میثاق' کی ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۷۴ء کی اشاعتوں میں راقم نے اپنی جولائی ۷۴ء والی تقریر اور تنظیم اسلامی کا ۶۷ء والا خاکہ ایک طویل اداریے سمیت شائع کر دیا۔

اس موقع پر راقم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ــــــ 'پرچہ کل ہی ملا تھا، میں نے رات ہی پورا پڑھ ڈالا۔ اور رات کے دو بجے تک لالٹین کی روشنی میں اسے پڑھتا رہا۔ تم نے خلا کی نشاندہی بالکل صحیح کر دی ہے۔ اور کرنے کا کام بھی ٹھیک متعیّن کر دیا ہے البتہ تم نے بہت بھاری بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک بڑی ذمّہ داری اپنے سَر لے لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمّت نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ تم نے یہ بوجھ اُٹھا ہی لیا ہے تو مَیں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے ــــــ اس لیے کہ میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اگر خود کوئی کام نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو کرتا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ . . . '

مولانا کا یہی وہ حوصلہ افزا طرزِ عمل تھا جس سے راقم کو جرأت ہوئی کہ مارچ ۷۵ء میں جب تنظیم اسلامی کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا دستور طے پایا تو اس میں ایک 'حلقۂ مستشارین' بھی رکھا گیا۔ جس کی زبانی اطلاع پر تو مولانا نے شیخ جمیل الرّحمان صاحب اور کراچی کے بعض دوسرے رفقاء سے یہ فرمایا کہ "آپ لوگوں نے یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے یہ خدمت میں بخوشی سرانجام دونگا" لیکن جب باقاعدہ تحریری صوُرت میں وہ خاکہ اُن کے سامنے آیا تو انہوں نے اس میں شمولیّت سے

انکار فرما دیا۔

اس کے بعد بھی لگ بھگ ایک سال تک مولانا کی خدمت میں راقم کی حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ جنوری ۷۶ء میں 'قرآن اکیڈمی' کی تعمیر کے آغاز کا مرحلہ آیا اور ساتھیوں نے اس موقع پر ایک اجتماعی دعا کا پروگرام بنایا تو اُس میں شرکت کی دعوت راقم نے مولانا کو بھی دی۔ جسے انہوں نے کمال شفقت و مروّت سے منظور فرما لیا۔ اور وہ اپنے خویش کلاں نعمان علی صاحب کی معیّت میں تشریف لائے۔ لیکن بعد میں بعض حضرات سے سننے میں آیا کہ مولانا نے فرمایا کہ "میری طبیعت بالکل آمادہ نہ تھی لیکن جب اُس نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا اور مجبوراً شریک ہو گیا"۔ راقم کی اصل مشکل یہ تھی کہ مولانا سے ملنا جلنا بھی ہو اور پھر انہیں اپنے کاموں میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رہے سہے تعلّق کو خود راقم نے ختم کر دیا۔

اسی پس منظر میں راقم نے مارچ ۷۶ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت مولانا کو دی اور حسبِ سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرما لیا لیکن بعد میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اِصرار پر شرکت سے انکار کر دیا ——— یہ گویا ان دوطرفہ تعلّقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور راقم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار نہ ہوں۔ اور اس طرح ربع صدی پر پھیلے ہوئے وہ تعلّقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال نہایت گرم جوشی کے ساتھ قائم رہے اور بعد ازاں ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی" کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ وہی صورت پیدا ہو گئی کہ ؎

بس اتنا سا تعلّق اب ان سے رہ گیا ہے ۔۔۔۔ وہ مجھ کو جانتے ہیں، مَیں ان کو جانتا ہوں!

پس نوشت

کتاب کے حصّہ دوم کے آخری دُو۲ باب یعنی باب سوم وچہارم، اوّلاً 'میثاق' دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک مسلسل تحریر کی صُورت میں شائع ہوئے تھے۔ اس پر جو حوصلہ افزا تائید وتحسین بے شمار حضرات کی جانب سے موصول ہوئی اُن میں سے دُو۲ بزرگوں کی قدر افزائی راقم کے لیے سرمایۂ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔

چنانچہ مولانا سیّد محمّد یوسف بنّوری ؒ نے ایک ملاقات میں نہ صرف یہ کہ اس تحریر کی کامل تصویب فرمائی بلکہ اپنی دُو۲ عربی تصانیف بھی ہدیہ فرمائیں جن میں سے ایک بعض جدید تفاسیر پر نقد و جرح ہی پر مشتمل تھی۔

دوسری تحریری تائید وتحسین مولانا عبدالملک جامعی مدّظلّہ، 'مہاجر مدینہ' کی جانب سے ایک خط کی صورت میں موصول ہوئی تھی جو مارچ ۱۹۷۷ء کے 'میثاق' میں کور کے اندرونی صفحے پر "بریدِحرم" کے عنوان سے شائع کر دیا گیا تھا۔ (جس کا عکس اگلے صفحے پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔) اس میں انہوں نے جو ذاتی تاثّرات بیان فرمائے اُن پر مستزاد میرے لیے نہایت مسرّت انگیز بات یہ تھی کہ ع "ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے!" کے مصداق اس تحریر کا ذکر مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شیخ الحدیث مولانا محمّد زکریا ؒ کی محفل میں ہوا۔ جیسے کہ مولانا جامعی کے خط سے ظاہر ہے اس سے قبل میرا اُن سے کوئی تعارف نہ تھا۔ البتہ بعد میں اُن سے جو دو ایک ملاقاتیں ہوئیں اُن میں یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ جب مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدّظلّہ، ملاقات کے لیے حضرت شیخ الحدیث ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت فرمایا کہ یہ تحریر اُن کی نظر سے گزری ہے یا نہیں ؟ اور جب جواب نفی میں ملا تو ارشاد فرمایا: "یہ 'میثاق' لے جاؤ اور اسے ضرور پڑھو لیکن پڑھنے کے بعد پرچہ مجھے واپس کرنا نہ بھولنا!" میرے لیے مولانا بنّوری ؒ اور شیخ الحدیث ؒ کی یہ قدر افزائی اس اعتبار سے بہت وقیع اور اہم ہے کہ ؎

اُحِبُّ الصالحینَ و لَستُ مِنهم

لعلّ اللہَ یَرزقُنی صَلاحًا

برید حرم

"المدینۃ المنورہ

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب وفقکم اللہ لمایحب ویرضی،

السلام علیکم و رحمۃاللہ ________ (بلا تعارف و تمہید!)

'میثاق، بابت دسمبر ۷۶ء نظر پڑا بحث دلچسپ تھی ساری پڑھ گیا۔ صفحہ ۳۶ تک تو مجھے اپنی ہی داستان معلوم ہوئی۔ فضل خدا وندی یہ ہے کہ مودودی صاحب کی تحریک پہلی ملاقات کے پہلے گھنٹے (۱۹۳۷ء) ہی میں سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے وہ پہلی ملاقات ہی آخری بن گئی رسالہ دیکھ کر اور مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی ملت ابھی عقیم نہیں ہوئی اور اردو ادب ابھی یتیم نہیں ہوا ہے(اگر چہ دو ستارے، عظیم ستارے ابھی جنوری میں ڈوب گئے(ماجد , رشید رحمہما اللہ !)مولانا اصلاحی میرے اولین اور عظیم ترین اساتذہ میں ہیں (۱۹۲۳ء) بچپن کی تعلیم و تربیت بہت کچھ ان ہی کی مرہون منت ہے ، اختلاف آپ کو بھی ہو سکتا ہے اور مجھے بھی - - - یہ تو جملہ معترضہ تھا بہر حال مجھے رسالہ دیکھ کر خوشی بہت ہوئی ، انداز پسند آیا تجزیہ نگاری میں آپ کو اپنا مگر کامیاب تر حریف پایا - - - آپ کی دلچسپی کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ جناب کا یہ "مجلہ اسرار، مجھے مولانا علی میاں کی قیام گاہ پر اتفاقاً ملا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے مولانا علی میاں کو واپسی کی شرط پر مطالعہ کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ مولانا موتمر کی شرکت کے لیے تشریف لے گئے اس عرصہ میں میں نے اس کو پڑھ ڈالا کیا یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ مولانا علی میاں آج کل مدینہ منورہ جامعہ اسلامیہ کی دعوت پر "موتمر الدعوۃ" میں آئے ہوئے ہیں ، حضرت شیخ الحدیث تو یہاں قیام فرما ہیں ہی اور اس بندہ کو اللہ تعالیٰ پاکستان کی ولادت سے پہلے ہی لے آئے تھے۔ سن وہی تھا بلکہ مہینہ بھی ' بس اللہ کو میری نیت ھجرت کی لاج رکھنی تھی - - - میں نے 'میثاق، بہت عرصہ بعد آج ہی دیکھا ، پہلے کبھی جب دیکھا تھا جب مولانا کی ادارت میں نکلا تھا۔

آپ کا ایک نیا نیاز مند : محمد عبدالملک

مراقب و مفتش مدارس القرآن مدینہ منورہ
و خادم محمد علی اکادمی و خادم بزم اردو مدینہ منورہ"

حصّہ سوم

تحریکِ تعلّم و تعلیمِ قرآن

کے رُوح پرور منظر، اور
حیرت انگیز پیش رفت کا

اجمالی خاکہ

وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ

■ تحریکِ تعلّم و تعلیمِ قرآن کے دَورِ اوّل کے اہم سنگ ہائے میل

- مطالعہ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب۔
- لاہور کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن' اور اتوار کی صبح کا مرکزی درس۔
- 'دارالاشاعت الاسلامیہ' اور 'سلسلۂ مطبوعات قرآن اکیڈمی'۔

■ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کا قیام' ——— اور تحریکِ تعلّم و تعلیمِ قرآن کے دَورِ ثانی کے اہم نشاناتِ راہ:

- دعوتِ قرآنی کی اندرونِ ملک توسیع' اور کراچی کا ماہانہ سفر۔
- لاہور میں دعوت کی توسیع، اور نوجوان میدانِ عمل میں۔
- تنظیمِ اسلامی کا قیام ——— اور انجمن اور تنظیم کا باہمی ربط۔

■ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی اٹھارہ سالہ کارگزاری کا اجمالی خاکہ' اعداد و شمار کے حوالے سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

(تحریر فروری ۱۹۸۹ء)

ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرے کم ہے کہ اس تعؑ نے کمالِ فضل و کرم سے اوّلاً اپنے اس بندۂ حقیر کو اوائلِ عمر ہی سے اپنے کلامِ پاک سے ذہنی مناسبت اور قلبی اُنس عطا فرما دیا ——— اور ثانیاً تعلیم و تعلّم قرآن کے ضمن میں اُس کی حقیر مساعی کو اس درجہ بار آور اور مشکور و مقبول بنا دیا کہ اُس کے نام کو دنیا بھر میں کم از کم اردو بولنے والوں کی حد تک 'دعوت رجوع الیٰ القرآن' کے جلی عنوان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

یہ دعوتِ رجوع الیٰ القرآن اور تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن گزشتہ تیئیس چوبیس سالوں کے دوران جن جن مراحل سے گزری، اور اس اثنا میں اُس نے جو نشاناتِ راہ نصب کیے اُن کا متفرق تذکرہ وقتاً فوقتاً 'حکمتِ قرآن'، اور 'میثاق' میں ہوتا رہا ہے، تاہم اس موقع پر جب کہ یہ دعوت و تحریک ربع صدی مکمّل کیا چاہتی ہے، اور 'مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور' بھی اپنا سترھواں سالانہ اجلاس منعقد کر رہی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک مختصر مگر جامع رُوداد بھی مرتّب کر دی جائے، اور اس کے اب تک کے ثمرات و نتائج کا ایک سرسری جائزہ بھی لے لیا جائے تاکہ ایک جانب حکمِ خداوندی: "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کی تعمیل ہو جائے، اور دوسری جانب نہ صرف یہ کہ موجودہ رفقاء و احباب اور اعوان و انصار کی ہمّت افزائی ہو، بلکہ اس راہ کے آئندہ مسافروں کو بھی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا سامان ملے۔

لاہور سے گیارہ سال باہر رہنے کے بعد، جب راقم اواخر ۱۹۶۵ء میں دوبارہ واردِ لاہور ہوا تو اس کے پیشِ نظر اصل مقصد تجدید و احیائے دین کی اسی اصولی انقلابی (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تحریک کا اِحیاء تھا جس کے بیسویں صدی عیسوی کے داعیٔ اوّل تھے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور داعیٔ ثانی تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم۔ مولانا آزاد نے ۱۹۲۰ء میں وقتی حالات اور مشکلات سے بددل ہونے کے باعث اپنا رُخ تبدیل کر کے جو خلاء پیدا کیا تھا، اسے تو لگ بھگ بیس سال کے وقفے کے بعد پُر کر دیا تھا مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعتِ اسلامی نے، لیکن خود جماعتِ اسلامی نے ۱۹۴۷ء میں ایک وقتی ترغیب سے متأثر ہو کر اصولی اسلامی انقلابی تحریک کی بجائے اسلام پسند قومی، سیاسی جماعت کا رول اختیار کر کے جو خلا پیدا کیا تھا اسے پُر کرنے کی کوشش ایک بہت بڑا چیلنج بھی تھی اور دین و مِلّت کی اہم ترین ضرورت بھی! ــــــــ چنانچہ راقم نے لاہور منتقل ہو کر اپنی اصل توجّہ اور سعی و جہد کو تو مرتکز رکھا اس مقصد پر، لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ اُسے اپنے زمانۂ تعلیم اور اس کے بعد کے گیارہ سالوں کے دوران اللہ کے فضل و کرم سے ایک خصوصی اُنس پیدا ہو گیا تھا قرآن حکیم کے ساتھ اور خصوصی مناسبت حاصل ہو گئی تھی درسِ قرآن سے لہٰذا اپنی ذاتی حیثیت میں دعوت و تبلیغ دین کی ایک حقیر سی کوشش کے طور پر آغاز کر دیا حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کا۔ جن کے ذریعے مطالعۂ قرآنِ حکیم کے ایک منتخب نصاب کے دروس کی صورت میں

ل ہمارا خاندان نومبر ۱۹۴۷ء میں حصار (مشرقی پنجاب، حال ہریانہ) سے آگ اور خون کے دریا عبور کر کے وارِدِ لاہور ہوا تھا۔ بعد میں والد صاحب مرحوم تو بسلسلۂ ملازمت کچھ عرصہ لاہور، اور پھر قصور اور چونیاں مقیم رہ کر بالآخر منٹگمری (حال ساہیوال) میں اقامت گزیں ہو گئے، لیکن میں بسلسلۂ تعلیم سات سال لاہور ہی میں مقیم رہا۔ (دو سال گورنمنٹ کالج لاہور برائے ایف ایس سی، اور پانچ سال کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج برائے ایم بی بی ایس)۔ اور اس عرصے کے دوران میری وابستگی اسلامی جمعیت طلبہ سے رہی۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد میں بھی ساہیوال منتقل ہو گیا۔ چنانچہ وہیں جماعتِ اسلامی میں شمولیت بھی ہوئی، اور اس سے علیحدگی بھی ــــــ بعد ازاں کچھ عرصہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے بزرگوں کی جانب سے کسی نئی اجتماعی جدّوجہد کے آغاز کا انتظار کرنے ــــــــ اور بالآخر اس سے مایوس ہونے پر، اپنی ذاتی حیثیت ہی میں اقامتِ دین کی کسی نئی جدّوجہد کے آغاز کے ارادے سے اواخر ۱۹۶۵ء میں لاہور مراجعت ہوئی۔

قرآن کے انقلابی فکر کی اشاعت اور اقامتِ دین یا اسلامی انقلاب کی جدّوجہد کے لیے مؤثّر دعوت کا آغاز ہو گیا۔

جماعتِ اسلامی سے وابستہ لوگوں کو بالعموم، اور اُس کی بعد از تقسیم پالیسی سے اختلاف کے باعث علیحدگی اختیار کرنے والوں کو بالخصوص، بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے اوّلاً راقم نے اپنا وہ بیان جو دس قبل جماعت کی شوریٰ کی مقرّر کردہ جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ماہنامہ 'میثاق' جس کی اشاعت کچھ عرصے سے مالی بحران کے باعث بند تھی، از سرِ نو جاری کر دیا۔ اور اس کے ذریعے ایک جانب "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کی اشاعت پر جو ردِّعمل ظاہر ہوا اور اس پر جو تنقیدی تبصرے شائع ہوئے اُن کے ضمن میں ضروری وضاحتیں پیش کیں، اور دوسری جانب ۵۷-۱۹۵۶ء کے بحران کے بعد، دس سال میں جماعتِ اسلامی "از کجا تا بہ کجا" پہنچ گئی تھی اُس کے جائزے کے لیے "تحریکِ جماعتِ اسلامی، حصّہ دوم" کی تصنیف کے اعلان کے ساتھ اُس کے بابِ اوّل "نقضِ غزل" کی سلسلہ وار اشاعت شروع کر دی۔

"تحریکِ جماعتِ اسلامی" پر جو تبصرے اخبارات وجرائد میں شائع ہوئے، ان میں بجا طور پر جماعت سے علیحدہ ہونے والوں پر یہ گرفت کی گئی کہ انہوں نے علیحدگی کے بعد خود کوئی مثبت اجتماعی جدّوجہد کیوں شروع نہ کی۔ چنانچہ روزنامہ نوائے وقت لاہور نے لکھا:

> "تدارک کی مؤثّر ترین بلکہ اظہر من الشمس صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان جس بات کو سچ اور درست سمجھے اس کے صرف انفرادی اظہار پہ اکتفا نہ کرے بلکہ اپنے ہم رائے وہم خیال اصحاب سے مل کر اپنے نزدیک سچ اور درست کو بروئے کار بھی لائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں نے اپنے اس اقدام کے بارے میں لکھا تو بہت کچھ ہے لیکن اب تک کوئی مثبت اقدام نہیں کیا۔"

اسی طرح روزنامہ کوہستان لاہور نے لکھا:

> "اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک سوال قاری کے ذہن میں بڑی شدّت کے

ساتھ اُبھرتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بارے میں جن لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ صحیح نہج پر کام نہیں کر رہی ہے اور اسی بنا پر وہ اس سے الگ ہوتے کیا انہوں نے علیٰحدگی کے بعد سے آج تک نو دس سال کے طویل مرحلہ میں اپنے اندازِ فکر کے مطابق کوئی کام بھی کیا۔ کیونکہ جہاں تک تحریکِ اسلامی کے نصب العین کا تعلق ہے ان حضرات کو پہلے بھی اس سے اتفاق تھا اور اسی بنا پر یہ اس میں شامل ہوتے تھے اور آج بھی جب یہ کتاب طبع ہو کر سامنے آئی ہے انہوں نے اس نصب العین سے اختلاف نہیں کیا۔ ایسی صورت میں علیٰحدگی کے بعد بھی اس نصب العین کے لیے اپنے اندازِ فکر اور طریق کار کے مطابق کام کرنے کی ذمّہ داری سے بری الذّمّہ نہیں ہو جاتے۔"

اور جماعتِ اسلامی ہند کے ترجمان ماہنامہ 'زندگی' رام پور نے تو نہایت واضح انداز میں مشورہ دیا کہ:

"اس کتاب پر اپنا مختصر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بات پھر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کو اپنی توجہ اس پر مرکوز کرنی چاہیے کہ جو لوگ انحراف کو سمجھ کر باہر آ چکے ہیں وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک جماعت بن جائیں اور اعلائے کلمۃ اللہ کا وہ کام انجام دیں جس کی محبّت میں انہوں نے جماعتِ اسلامی پاکستان سے قطع تعلق کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہو گا۔"

ان تبصروں کے جواب میں ضروری وضاحتوں کے ساتھ ساتھ راقم نے اس گرفت اور مشورہ کو صحیح قرار دیتے ہوئے جماعتِ اسلامی سے علیٰحدگی اختیار کرنے والوں سے درخواست کی کہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں۔ چنانچہ 'میثاق' اگست ۶۶ء میں تحریر کیا:

"ہمیں اس کوتاہی اور تقصیر کا صاف اعتراف ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علیٰحدہ ہونے والوں پر جماعتِ اسلامی اور اس کے ہم خیال حضرات کا یہ الزام بالکل درست ہے کہ انہیں مجتمع ہو کر اس نہج پر عملی جدّوجہد کا آغاز کر دینا چاہیے تھا جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔"

مزید برآں:

"یہ دوسرے رفقاء کے احساسات کی ترجمانی ہو نہ ہو، ہماری دیانت دارانہ رائے یہی ہے

کہ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، بہرحال اس معاملے میں ہم سب سے مجموعی طور پر کوتاہی ہوئی ہے اور اس 'الزام' کا اصل 'جواب' ہماری جانب سے یہی ہونا چاہیے کہ جماعتِ اسلامی کے طریقِ کار میں جن غلطیوں کی نشاندہی کر کے علیحدہ ہوئے تھے، ان سے پہلو بچا کر اس مقصد کے لیے اجتماعی جدّوجہد شروع کی جاتے جس کے لیے جماعتِ اسلامی قائم ہوئی تھی — اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں — آمین"

(تذکرہ وتبصرہ 'میثاق' لاہور بابت اگست ۱۹۶۶ء)

میرے اس واضح اعترافِ تقصیر اور مخلصانہ تذکیر و تنبیہ کا نتیجہ تو فوری طور پر برآمد ہو گیا کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات کے حلقے میں کسی نئی تعمیر و تنظیم کی خواہش نے ازسرِنو انگڑائی لی۔ چنانچہ اوّلاً جون ۶۷ء میں ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کے لیے قرار دادِ تاسیس پر میرا اور سردار محمد اجمل خاں لغاری مرحوم کا اتفاق ہوا، پھر اس پر مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، اور شیخ سلطان احمد (کراچی) نے بھی صاد فرمایا۔ بعدازاں مؤخر الذکر دو بزرگوں کی مساعی سے اسی کی اساس پر ستمبر ۶۷ء میں اجتماعِ رحیم یار خاں منعقد ہوا جس میں اچھی خاصی تعداد میں پرانے رفقاء و احباب جمع ہوئے ——— اور متذکرہ بالا قراردادِ تاسیس کی توثیق کے علاوہ سات حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی جسے مجوزہ تنظیم کے دستور اور لائحہ عمل کی تدوین کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ لیکن افسوس کہ اس کے فوراً بعد چند حوادث ایسے پیش آ گئے کہ اس نئی تنظیم کا شیرازہ بندھنے سے پہلے ہی بکھر گیا۔ اور دوبارہ ؎ "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!" والی صورت پیدا ہو گئی۔ اور اس طرح صِرف جماعتِ اسلامی کے ساتھ سابقہ تعلّق کی قدرِ مشترک کی اساس پر کسی نئی اجتماعیت کے قیام کی یہ آخری اور نہایت بھرپور کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ اور صاف محسوس ہوا کہ مسلسل دس سال تک کسی تنظیم یا تحریک سے عدم وابستگی کی بنا پر نہ صرف یہ کہ ولولے سرد اور جذبے ٹھنڈے پڑ چکے ہیں اور وہ صورت بتمام و کمال پیدا ہو چکی ہے کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے!

بلکہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ کہ تصوّرات اور نظریات کی گاڑی ریورس گیئر (REVERSE GEAR) میں پڑ کر رجعتِ قہقری اختیار کر چکی ہے۔ فولحسرتاہ و یا اسفا۔

راقم کو متذکرہ بالا کوشش کی ناکامی سے صدمہ تو بہت ہوا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس نے جلد ہی پورے معاملے کو مشیّتِ ایزدی کے حوالے کر کے اپنی پوری سعی و جہد اور تمام توجہات کو تعلیم و تعلّمِ قرآن پر مرتکز کر دیا اور آج محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ایک شان یہ ہے کہ "تُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَتُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ" (آل عمران: ۲۷) اسی طرح اس کی قدرت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ وہ ظاہری شر کے پردے میں سے خیر برآمد فرما دیتا ہے، بمصداقِ الفاظِ قرآنی "عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ" (البقرۃ: ۲۱۶) ——— اس لیے کہ اس حادثے کے بعد جب راقم نے اپنی جملہ توانائیوں اور صلاحیتوں کو کامل یکسوئی کے ساتھ قرآنِ حکیم کے درس و تدریس اور نشر و اشاعت میں لگا دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کی فضا میں دعوت رجوع اِلَی القرآن' کا غلغلہ بلند ہو گیا ——— اور تعلیم و تعلّمِ قرآن کی ایک جاندار تحریک کا آغاز ہو گیا۔ جس کے اثرات گزشتہ بائیس سالوں کے دوران بفضل اللہ و عونہٖ، دنیا کے کونے کونے تک، جہاں بھی اردو سمجھنے اور بولنے والے لوگ موجود ہیں، نہ صرف پہنچ گئے ہیں بلکہ دور دراز گوشوں میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے از خود بڑھتے چلے جا رہے ہیں! یہاں تک کہ اس احقر الانام کو حق الیقین کی حد تک وثوق حاصل ہے کہ اگر ہماری شامتِ اعمال' یا تقصیرِ ہمّت اور کوتاہیٔ عمل کے باعث مملکتِ خداداد پاکستان میں یہ دعوتِ قرآنی انقلابِ اسلامی پر منتج نہ ہو سکی تو الفاظِ قرآنی: "فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِهَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِهَا بِکٰفِرِیۡنَ" (الانعام: ۸۹) کے مصداق اللہ تعالیٰ کسی اور خطۂ ارضی کو یہ سعادت لازماً عطا فرمادے گا کہ وہ قرآن کے اُس انقلابی فکر کو حرزِ جاں بنا کر جسے دورِ حاضر کے شعور کی سطح (LEVEL OF CON-SCIOUSNESS) پر ایک مؤثر دعوت کی صورت دینے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے اپنے اس عاجز بندے کو عطا فرمائی ہے، بالفعل" اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" اور "غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی" کا گہوارہ بن جائے۔ اور وہ صورت عملاً پیدا ہو جائے جس کی پیشین گوئی اب سے ساٹھ ستر سال قبل اُس مردِ قلندر نے کی تھی جس کا نام اقبالؔ تھا یعنی ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ۔۔۔ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود ۔۔۔ پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

اس سے قبل کہ اس قرآنی تحریک کے چوبیس سالہ سفر کے اہم نشاناتِ راہ اور سنگ ہائے میل کا تذکرہ کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقتِ واقعی کی جانب اشارہ کر دیا جائے کہ اس دعوتِ قرآنی نے ع "اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے!" کے مصداق بحمد اللہ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے اعوان و انصار کی ایک جمعیت پیدا کر لی تو مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور سے قطع نظر جب راقم نے ۶۷ء والی قرارداد ہی کی اساس پر پورے آٹھ برس بعد ۱۹۷۵ء میں از سرِ نو دعوتِ تنظیم دی تو اس پر لبّیک کہنے والے اکیاسی افراد میں سے جماعتِ اسلامی سے سابقہ تعلق کی قدرِ مشترک کے حامل اشخاص تین چار سے زیادہ نہیں تھے، باقی سب کے سب اس دعوتِ قرآنی ہی کے شجرۂ طیّبہ کے تازہ پھل تھے! گویا کہ موجودہ 'تنظیمِ اسلامی' بھی ع "اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون" کے مصداق اسی دعوتِ قرآنی کے برگ و بار کی حیثیت رکھتی ہے۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ!!

'رجوع اِلَی القرآن' کی جس دعوت، اور 'تعلیم و تعلّمِ قرآن' کی جس تحریک کے نمایاں نشاناتِ راہ اور اہم سنگ ہائے میل اس وقت صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے مطلوب ہیں، اس کے سفر کا آغاز ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے فوراً بعد اوائل اکتوبر میں ہوا تھا اور ان سطور کی تحریر کے وقت (مارچ ۸۹ء) تک راقم کی عمرِ عزیز کے پورے ساڑھے تیئیس برس اس کی نذر ہو چکے ہیں! گویا حفیظ کے درج ذیل شعر میں نصف کے بجائے رُبع کا لفظ رکھ دیا جائے تو وہ راقم الحروف کے مناسبِ حال ہو جائیگا "تکمیل اور تدوینِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں!

ان میں سے پہلے ساڑھے چھ برس راقم نے بالکل تنہا کام کیا۔ اس لیے کہ اس وقت نہ کوئی انجمن تھی، نہ تنظیم، ایک اشاعتی ادارہ تھا تو وہ بھی خالص ذاتی، ——— اور اس بھری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی غیبی تائید و نصرت اور اپنے ذاتی عزم و ہمّت کے سوا کچھ میسّر تھا تو صرف مولانا امین احسن

اصلاحی کی مشفقانہ 'سرپرستی' ——— اور کچھ حقیقی بھائیوں کا تعاون!

ان ساڑھے سات سالوں میں سے بھی پہلے دو سالوں کے دوران، جیسے کہ اُوپر عرض کیا جا چکا ہے راقم کی توجہات دو کاموں پر منقسم رہیں، ایک تنظیم اسلامی کا قیام اور دوسرے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن۔ اواخر اکتوبر ۱۹۶۷ء میں تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت کا جو اجلاس سکھر میں ہوا تھا اسی میں تنظیم کی بساط اصُولی طور پر لپیٹ دی گئی تھی، لہٰذا اواخر ۶۷ء سے مارچ ۷۲ء تک گویا مسلسل ساڑھے چار برس[1] راقم کی جملہ توانائیاں اور تمام اوقات دعوت رجوع اِلیٰ القرآن اور تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن کی داغ بیل ڈالنے میں صَرف ہوئے جس کے نتیجے میں مارچ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور وجود میں آئی۔

اس کے بعد تین سال اس دعوت اور تحریک کے شباب کا دَور ہیں، اس لیے کہ اب راقم یکّہ و تنہا نہیں تھا بلکہ ؎

"گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ۔۔۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!"

اور ؎

"میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر ۔۔۔ راہ رَو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا"

کے مصداق اُس کی ذاتی مساعی کے ساتھ اعوان و انصار کی ایک جماعت کی محنت و مشقت اور خلوص و اخلاص کا سرمایہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

مارچ ۱۹۷۵ء میں اِسی دعوت رجوع اِلیٰ القرآن اور تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن کی کوکھ سے تنظیم اسلامی نے جنم لیا۔ لہٰذا بعد کے چودہ سالوں کے دوران راقم کی توانائیاں پھر منقسم ہو گئیں۔ تاہم وابستگانِ انجمن کے تعاون و اشتراک اور جماعتی زندگی کی برکات کے طفیل قرآنی دعوت و تحریک کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی، چنانچہ اس چمنِ قرآنی کی اصل بہار کا عرصہ ۷۵ء تا ۸۲ء کے سات سال ہیں جن کے دَوران کچھ اعوان و انصار کی محنت و مشقت اور کچھ خارجی اسباب کی بنا پر یہ دعوت و

---

[1] یہی وجہ ہے کہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی قرار دادِ تاسیس میں یہ الفاظ شامل ہیں:
"اور چونکہ ہمیں اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات سے کامل اتفاق ہے ——— اور ہم اس کام کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں جو وہ گزشتہ ساڑھے چار سال سے کر رہے ہیں ——— لہٰذا . . . ."

تحریکِ واقعۃً LILY IN BLOOM کی صورت اختیار کرگئی ـــــــ!

گزشتہ سات سالوں کے دوران ایک جانب تو تدریجاً "ع مضمحل ہو گئے قویٰ غالب!" کا طبعی ظہور ہوا، اور دوسری جانب تنظیمِ اسلامی کے مسائل و معاملات نے بھی وقت اور قوّت میں سے ضروری حصّہ وصول کرنا شروع کر دیا لہٰذا فطری طور پر تعلیم و تعلّمِ قرآن کے ضمن میں راقم کی ذاتی مساعی کا حصّہ کم ہوتا چلا گیا، تاہم چونکہ اب بحمد اللہ ایک جانب ایک منظّم انجمن اور مستحکم ادارہ بھی موجود ہے، اور دوسری طرف بفضلہٖ تعالےٰ میرے اپنے فرزندوں سمیت نوجوانوں کی ایک معتدبہ تعداد بھی اس مشن کی ذمّہ داریوں کو سنبھالنے کی اہلیّت کا ثبوت دے چکی ہے ــــــ لہٰذا مَیں مطمئن ہوں کہ ان شاء اللہ العزیز ولعونہٖ یہ قافلۂ دعوتِ رجوع اِلیٰ القرآن و تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" اور دینِ حق کے عالمی غلبے کی منزل کی جانب پیش قدمی جاری رکھے گا! اَللّٰھُمَّ اٰمین!!

اور ان سطور کی تحریر کے وقت، جبکہ حیاتِ مستعار کے بحسابِ شمسی ستاون اور بحساب قمری اُنسٹھ برس پُورے ہونے کو ہیں، اور مَیں اپنے آپ کو دنیا کے مقابلے میں آخرت سے قریب تر محسوس کرتا ہوں بحمد اللہ دل کو یہ گہرا اطمینان حاصل ہے کہ ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!" کے مصداق عمر کے بہتر اور بیشتر حصّے کے دوران جسم و جان کی بہتر اور بیشتر توانائیاں نویدِ نبویؐ: "خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ" کے مطابق بہترین کام میں صَرف ہوئی ہیں۔ گویا ع "شکر صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسید!" ـــــــ اس کے ساتھ ہی دل میں اس امّید کا چراغ بھی روشن ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے خود ہی اس کی توفیق عطا فرمائی تو لغزشوں، خطاؤں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے شرفِ قبول بھی ضرور عطا فرمائے گا۔ اور عجیب نویدِ جانفزا کا معاملہ ہے کہ جیسے ہی یہ الفاظ نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہوئے ایک جانب دل کی گہرائیوں سے حدیثِ قدسی کے الفاظ طلوع ہوئے کہ "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ!" اور دوسری جانب ذہن میں کسی شاعر کا مصرعہ اُبھرا ع "وَاَرْجُوْہُ رَجَاءً لَا یَخِیْبُ!" ـــــــ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ اٰمین یا ربّ العٰلمین!!

تحریکِ تعلّم و تعلیم قرآن کے دَورِ اوّل

کے

اہم سنگ ہائے میل

اوپر جو تفاصیل بیان کی گئی ہیں اُن کی رُو سے دعوت و تحریکِ قرآنی کا یہ ساڑھے تیئیس سالہ سفر پانچ ادوار میں منقسم قرار پاتا ہے —— لیکن اس کے اہم سنگ ہائے میل کی نشاندہی کے لیے اسے دو بڑے بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے —— یعنی پہلا اواخر ۱۹۶۵ء میں میری انفرادی مساعی کے آغاز سے مارچ ۱۹۷۲ء میں انجمن خدّام القرآن کی تاسیس تک، گویا ساڑھے چھ سال پر محیط، —— اور دوسرا قیامِ انجمن کے بعد سے آج تک کے سترہ سالوں پر مشتمل (اگرچہ گزشتہ دو سالوں کے دَوران اصولی اعتبار سے ایک تیسرے دَور کی داغ بیل پڑ چکی ہے، جس کا ذکر بعد میں آئے گا!)

ان میں سے پہلا دَور طوالت میں بھی کم تھا، اور اس کے دَوران صرف ایک حقیر و بے بضاعت فردِ واحد اپنی سی کوشش کر رہا تھا، جبکہ دُوسرا دَور طویل تر بھی ہے اور اس میں ایک انجمن اور ایک تنظیم کی مساعی بھی شامل ہیں لیکن اس دعوت و تحریک کے اہداف کی تعیین اور مزاج کی تشکیل کے اعتبار سے اصل اہمیّت پہلے ہی دَور کو حاصل ہے، جسے جدید اصطلاح میں اس کا FORMATIVE PERIOD قرار دیا جا سکتا ہے —— لہٰذا اس دَورِ اوّل کے تین اہم سنگ ہائے میل کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ کیا جا رہا ہے، چونکہ وہ درحقیقت اس تحریک کے سنگ ہائے اساس کی حیثیّت رکھتے ہیں، یعنی:

۱۔ مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب۔

۲۔ لاہور کے 'حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن' —— اور اتوار کی صبح کا مرکزی درس۔

۳۔ 'دارالاشاعت الاسلامیہ' —— اور سلسلۂ مطبوعات قرآن اکیڈمی۔

۱۔ مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

راقم نے اپنی اس دعوتِ قرآنی کی اساس 'مطالعۂ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب' کو بنایا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ جو کامیابیاں اسے حاصل ہوئیں ان کا سب سے بڑا راز اِسی منتخب نصاب میں مضمر ہے۔ اس لیے کہ اُن حضرات سے قطع نظر جنہیں قسمت ابتدا ہی سے عربی مدارس میں پہنچا دیتی ہے اور وہ اسی قدیم مذہبی نظامِ تعلیم سے فراغت حاصل کرتے ہیں اور اس طرح ان کے تو گویا شب و روز قال اللہ تعؐ اور قال الرسولؐ کی فضا ہی میں بسر ہوتے ہیں، سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے قرآن مجید کا ابتدا سے انتہا تک تسلسل کے ساتھ مطالعہ نہایت کٹھن کام ہے۔ اور اس کے لیے ایک نہایت مضبوط قوّتِ ارادی درکار ہے۔ جبکہ یہ منتخب نصاب جو حجم کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ دو پارے کے لگ بھگ یعنی کُل قرآن کے پندرہویں حصّے کے برابر ہے، ایک نہایت حکیمانہ تدریج اور منطقی ترتیب کے ساتھ نہ صرف یہ کہ، فقہی اور تاریخی مباحث کے سوا، قرآن حکیم کے جملہ بنیادی مضامین اور تعلیمات کو بخوبی ذہن نشین کر دیتا ہے بلکہ ایک جانب قرآن کے مخصوص اسلوب اور طرزِ بیان، اور دوسری جانب اُس کے فطری منہجِ استدلال (LINE OF ARGUMENT) سے بھی واقفیت ہی نہیں گہری مناسبت عطا کر دیتا ہے ——— اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی عظمت کا ایسا نقش دل پر قائم کر دیتا ہے کہ وہ مضبوط قوّتِ ارادی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے جو پُورے قرآن کے مسلسل مطالعے کے لیے ضروری ہے۔

اب سے دس بارہ سال پہلے جب اس منتخب نصاب میں شامل آیات و سُوَرِ قرآنی کو پہلی بار یکجا کتابی صورت میں شائع کیا گیا تو راقم نے اس کا تاریخی پس منظر تفصیلاً بیان کر دیا تھا ——— جو درج ذیل ہے:

> "آغاز ہی میں یہ بات عرض کر دینی مناسب ہے کہ یہ نصاب راقم کا 'طبعزاد' نہیں ہے بلکہ اس کا اصل ڈھانچہ مولانا امین احسن اصلاحی کا تیار کردہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۵۲-۱۹۵۱ء میں جب راقم الحروف اسلامی جمعیت طلبہ لاہور و پنجاب کا ناظم تھا

اس نے جمعیت کے زیرِ اہتمام طلبہ کے دو تربیتی کیمپ منعقد کیے تھے ایک دسمبر ۱۹۵۱ء میں کرسمس کی تعطیلات میں اور دوسرا ۱۹۵۲ء کی تعطیلاتِ موسم گرما میں ــــــ ان تربیت گاہوں میں قرآن حکیم کا درس مولانا اصلاحی مدظلہٗ نے دیا تھا اور اس غرض سے انہوں نے ایک نصاب تجویز کیا تھا جو درج ذیل ہے :

۱۔ انسان کی انفرادی زندگی کی رہنمائی کے لیے سورۃ لقمان کا دوسرا اور سورۃ فرقان کا آخری رکوع۔

۲۔ عائلی زندگی سے متعلق ــــــ سورۃ تحریم مکمل۔

۳۔ قومی، ملّی اور سیاسی زندگی کی رہنمائی کے ذیل میں سورۃ حجرات مکمل۔

۴۔ فریضۂ اقامتِ دین کے ذیل میں سورۃ صف مکمل۔

۵۔ اور تحریک اسلامی سے متعلق مختلف مسائل میں رہنمائی کے ذیل میں سورۃ عنکبوت مکمل

راقم کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بطور ناظم ان دونوں تربیت گاہوں میں شرکت کا موقع ملا اور یہ مقامات اس نے دو بار مولانا اصلاحی صاحب سے براہِ راست پڑھے اور راقم نے ان مقامات کو اس طرح اخذ کر لیا کہ " بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً " (پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت) کے مصداق انہیں آگے پڑھانے کے لیے بھی کسی قدر اعتماد پیدا ہو گیا۔ چنانچہ زمانۂ طالب علمی میں جمعیت کے اجتماعات میں بھی راقم مطالعۂ قرآن کی ذمہ داریاں نبھاتا رہا۔ تعطیلات کے زمانے میں ساہیوال میں ــــــ جماعتِ اسلامی کے اجتماعات میں بھی ان مقامات کا درس دیتا رہا اور رمضانِ مبارک کے ایک تربیتی پروگرام میں پورا نصاب بھی پڑھایا۔ ۱۹۵۴ء میں ملتان میں منعقدہ جمعیت کی ایک تربیت گاہ میں راقم نے پھر یہ نصاب اسی تدریج کے ساتھ پڑھایا۔ بعد میں جب ساہیوال میں راقم نے ایک 'اسلامی ہاسٹل' قائم کیا تو اس میں مقیم طلبہ کو بھی راقم نے اس پورے نصاب کا درس دیا۔ اس کے بعد جب راقم کراچی میں تھا تو وہاں بھی مقبول عام ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک حلقہ قائم کر کے اسی منتخب نصاب کا درس دیا گیا۔

البتہ اس عرصے کے دوران میں وقتاً فوقتاً راقم اس بنیادی نصاب میں اضافے

کرتا رہا۔ جن سے اس نصاب کی ایک واضح بنیاد بھی قائم ہوگئی اور مختلف مقامات کے مضامین میں جو فاصلے تھے وہ بھی بہت حد تک پاٹ دیئے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ بھی خود راقم یا کوئی اور شخص اس میں مفید اضافے کر سکے۔ تاہم اس وقت راقم کا گمان ہے کہ ایک خاص نقطۂ نظر سے قرآن حکیم کا جو انتخاب اس نصاب میں کیا گیا ہے وہ بہت حد تک مکمل بھی ہے اور نہایت مفید بھی۔

آگے چلنے سے پہلے اس "خاص نقطۂ نظر" کی وضاحت بھی ہو جاتے تو اچھا ہے۔ وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک مسلمان کے سامنے یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ اُس کے دین کے تقاضے اس سے کیا ہیں اور اُس کا رب اس سے کیا چاہتا ہے؟ گویا دین کے تقاضوں اور مطالبوں کا ایک اجمالی لیکن جامع تصور پیش کرنا اس انتخاب کا اصل مقصود ہے، ویسے ضمناً اس سے خود دین کا ایک جامع تصور بھی آپ سے آپ واضح ہو جاتا ہے اور محدود مذہبی تصورات کی جڑیں خود بخود کٹتی چلی جاتی ہیں"۔

اس نصاب کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے اور نقطۂ عروج سورۃ الحدید۔ چنانچہ اس کے حصۂ اوّل میں سورۃ العصر کے ساتھ تین مزید جامع اسباق شامل ہیں یعنی حقیقتِ برّ و تقویٰ کی وضاحت کے لیے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ (آیت البرّ)، حکمتِ قرآنی کی اساسات اور مقامِ عزیمت کی تشریح کے لیے سورۃ لقمان کا دوسرا رکوع اور "حظِ عظیم" کی وضاحت کے لیے سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶، اور حصۂ آخر (ششم) مشتمل ہے مکمل سورۃ الحدید پر جو امّتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت ہے۔

درمیانی چار حصے سورۃ العصر میں بیان شدہ چار لوازمِ نجات کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ حصۂ دوم میں ایمان کی حقیقت و ماہیت اور اس کے اجزاءِ ترکیبی کی وضاحت کے لیے سورۃ الفاتحہ، سورۃ آلِ عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۶، سورۃ النّور کا پانچواں رکوع، سورۃ التغابن کامل، اور سورۃ القیامہ کامل شامل ہیں ——— اسی طرح حصۂ سوم میں "عملِ صالح" کی وضاحت کے لیے بندۂ مومن کی انفرادی سیرت کی تعمیر کے اساسی لوازم کے بیان میں سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵، مردِ مومن کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ عالیہ کی تصویر کشی

کے لیے سورۃ الفرقان کا آخری رکوع ، عائلی زندگی کے خدوخال نمایاں کرنے کے لیے سورۃ التحریم (کامل)، مسلمانوں کی معاشرتی و سماجی زندگی کے اصولوں کی وضاحت کے لیے سورۃ بنی اسرائیل کا تیسرا اور چوتھا رکوع ، اور مسلمانوں کی حیاتِ ملّی و سیاسی کے اصولوں کے ضمن میں جامع ترین ہدایت نامے کے طور پر سورۃ الحجرات (مکمل) شامل ہیں۔

'تواصی بالحق' کے ضمن میں 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' اور 'دعوت الی اللہ' کا ذکر تو جامع اسباق ۳ و ۴ میں موجود ہے' اسی طرح ایمان حقیقی کی شرطِ لازم 'جہاد فی سبیل اللہ' کا تذکرہ نہایت زوردار انداز میں سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۵ میں آجاتا ہے ـــــ لہٰذا منتخب نصاب کا حصّۂ چہارم کُل کا کُل جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی تشریحِ مزید کے لیے وقف ہے۔ چنانچہ اس میں اوّلاً سورۃ الحج کا آخری رکوع (جو بجائے خود نہایت ہی جامع مقام ہے) اور سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ اور پھر سورۃ الصّف، سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقون (کامل) شامل ہیں ـــــ اسی طرح 'تواصی بالصبر' کی بھی اصل اساسات تو حصّۂ اوّل میں شامل جامع اسباق میں موجود ہیں' حصّۂ پنجم میں اوّلین اور اہم ترین حصّہ تو مشتمل ہے سورۃ العنکبوت کے پہلے اور آخری تین رکوعوں پر ـــــ اور اُن پر مستزاد ہیں قتال فی سبیل اللہ کے ضمن میں صبر و مصابرت کی تاکید پر مشتمل سورۃ البقرہ کی آیات ۱۵۳ تا ۱۵۷ اور آیت ۲۱۴ ، سورۃ الانفال کا پہلا اور آخری رکوع ، سورۃ آلِ عمران کی آیات ۱۲۱ تا ۱۲۹ اور ۱۳۹ تا ۱۴۸ ، سورۃ الاحزاب کا دوسرا اور تیسرا رکوع ، اور بالآخر سورۃ التوبہ کا چھٹا اور ساتواں رکوع۔

اور جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے' آخر میں آتی ہے اُمّ المسبّحات سورۃ الحدید جو ان تمام مباحث کو نہایت جامعیّت کے ساتھ ایک بار پھر سامنے لے آتی ہے' اس سورۂ مبارکہ کی عظمت و جامعیت کا جو نقش راقم الحروف کے قلب پر قائم ہے وہ بیان میں نہیں آسکتا۔ مختصر یہ کہ اگر سورۃ العصر کو گلاب کے پودے کے بیج سے تعبیر کیا جائے تو سورۃ الحدید اس پودے کی چوٹی پر کھلے ہوئے حسین و جمیل پھول کے مانند ہے' اب اگر امام شافعیؒ سورۃ العصر کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ "لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ" ـــــ اور "لَوْ لَمْ يُنْزَلْ مِنَ الْقُرْاٰنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ" تو میں نہیں کہہ سکتا کہ سورۃ الحدید کے بارے میں کیا کہا جائے کہ اُس کا حق ادا ہو سکے! راقم کے نزدیک تو یہ معاملہ خالصتاً "اے بروں از وہم و قیل و قالِ من!" والا ہے۔ اور یہاں

گھٹنے ٹیک دینے ہی میں عافیت ہے!

راقم الحروف کے پاس کوئی ریکارڈ تو ظاہر ہے کہ محفوظ نہیں لیکن وہ یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اُس نے اس پورے منتخب نصاب کے درس کی سعادت کم از کم پچاس مرتبہ تو ضرور حاصل کی ہوگی۔ اس لیے کہ لاہور میں جب ۶۸-۱۹۶۷ء میں حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن قائم کیے تو ان سب میں اسی کا درس دیا، پھر مسجد خضراء سمن آباد میں مرکزی درس کا آغاز ہوا تو وہاں بھی دوبارہ اسی کا درس دیا۔ پھر یہ مرکزی درس مسجد شہداء منتقل ہوا تو وہاں بھی اس کا اعادہ کیا۔ پھر جا بجا قرآنی تربیت گاہیں قائم کیں تو اُن میں بھی ان ہی مقامات کا درس دیا۔ بیرونی ممالک میں جانا ہوا تو وہاں بھی ع "الا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم!" کے مصداق اسی کو بیان کیا۔ پھر موقع اور مقام اور سامعین کی ذہنی سطح کے فرق کی مناسبت سے ان دروس میں طوالت یا اختصار کے اعتبار سے بھی فرق ہوتا رہا اور بیان کی سلاست یا علمی ثقالت کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ اس نصاب میں شامل ہر مقام کے راقم الحروف کے دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے کے دروس بھی ٹیپ کی ریلوں (SPOOLS) میں محفوظ ہیں اور نہایت مختصر اور آسان دروس کے کیسٹ بھی موجود ہیں ——— اور اب کچھ عرصہ سے خود راقم کے اسی منتخب نصاب کے دروس کا سلسلہ بند ہو چکا ہے تو بحمد اللہ کم از کم پندرہ بیس نوجوان ایسے تیار ہو چکے ہیں جو اس کا درس نہایت خوش اسلوبی سے دے رہے ہیں۔ اللہ ان کے عزم اور ارادے کو برقرار رکھے ——— اور ان کی صلاحیت اور استعداد میں ترقی عطا فرمائے! ———

یہ تو اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے کہ اِن میں میرے صُلبی بیٹے بھی شامل ہیں، ورنہ میں تو ان سب کو اپنی معنوی اولاد اور صدقۂ جاریہ سمجھتا ہوں ——— اور علامہ اقبالؔ کے شعر میں تھوڑے سے تصرّف کے ساتھ دست بدعا ہوں کہ ؎

یہ ہیں صدف تو تیرے ہاتھ اِن کے گہر کی آبرو
یہ ہیں خزف تو تو انہیں گوہرِ شاہوار کر!

۲۔ لاہور کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن اور اتوار کی صبح کا

مرکزی درس

لاہور میں راقم نے "حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن" کا آغاز جس طرح کیا اس کا مختصر تذکرہ عام قارئین کی دلچسپی اور اس راہ کے "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کے مصداق نئے ساتھیوں کی رہنمائی کے لیے مفید ہو گا۔

۱۔ تدریسِ عربی

اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) کی کوثر روڈ (سابقہ امرت روڈ) پر ایک مکان خرید کر اپنی رہائش اور مطب شروع کرنے کے فوراً بعد میں نے آس پاس کی تین مساجد میں نمازیں ادا کرنی شروع کیں اور نمازیوں میں سے نوجوانوں سے میل جول بڑھانا شروع کیا۔ اور چند ہی دنوں میں ان میں سے بعض کو آمادہ کر لیا کہ وہ مجھ سے ابتدائی عربی سیکھنے کے لیے بعد نمازِ عشاء وقت نکالیں۔ پھر ان ہی کے ذریعے ان مساجد یا اُن کے قریب کے مکانوں میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی یاد آیا۔ میرے سمن آباد کے درس کے آغاز کے بعد جب لاہور میں چرچا زیادہ ہوا تو پاکستان ریلوے کے بعض سینئر افسروں نے بھی مجھ سے عربی زبان کے ابتدائی قواعد سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں نے ہفتے میں تین دن کرشن نگر کے نوجوانوں کے لیے مختص کر دیئے اور تین دن ان حضرات کے لیے۔ میرا تیسرا بیٹا عزیزم عاطف وحید سلّمہ، اُن دنوں دو ڈھائی سال کا تھا اور میرے ہی ساتھ سویا کرتا تھا، نمازِ عشاء کے بعد اُسے سونے کی جلدی ہوتی تھی اور مَیں عربی کی کلاس میں مصروف ہوتا تھا، لہٰذا وہ بار بار آکر دیکھا کرتا تھا کہ طالبعلم رخصت ہو گئے یا نہیں ——— ایک روز جب اتفاق سے "بزرگوں" کی باری تھی، اُس نے دو تین چکّر لگانے کے بعد بالآخر تنگ آکر کہا: "اَبّی بچّوں کو چھٹّی دیدیں" اس پر پوری محفل زعفران زار ہو گئی ——— اس لیے کہ اُن "بچّوں" میں ایک شاہ محمّد ظفر صاحب تھے جن کی نہ صرف داڑھی

بلکہ پوری شکل وشباہت ماشاء اللہ بالکل مولانا احمد علیؒ جیسی تھی، ایک خالد احمد صاحب تھے جو اُس وقت پاکستان ریلوے کے ڈپٹی چیف انجنیئر تھے اور ان کا چہرہ بھی ماشاء اللہ خاصی طویل اور سفید براق داڑھی سے مزیّن تھا۔ اور باقی دو تین حضرات بھی ریلوے کے اعلیٰ افسروں میں سے تھے۔!

۲۔ مرکزی درس

لاہور کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن میں اوّلین دو حلقے کرشن نگر میں قائم ہوئے، ایک جامع مسجد ہرن روڈ[1] میں اور دوسرا عمر روڈ پر واقع زبیری صاحب مرحوم کے مکان پر! پھر جماعتِ اسلامی کے سابقہ تعلق کے اشتراک کی بنیاد پر تیسرا حلقہ دل محمد روڈ کے علاقے میں مولوی برکت علی صاحب کی بلڈنگ میں قائم ہوا۔ پھر سمن آباد میں درس شروع ہوا جس نے بعد میں لاہور کے مرکزی درس کی حیثیت حاصل کر لی۔

اُس کی تقریب یوں ہوئی کہ میرے پھوپھی زاد بھائی شیخ نصیر احمد صاحب نے اپنے مکان میں کچھ تعمیری تبدیلیاں اور اضافے کیے۔ جس سے ایک کمرہ اتنا بڑا نکل آیا کہ اُس میں ستّر اسّی آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ مَیں نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو بے اختیار زبان سے ع "ایں خانہ بایں خوبی آتش کدہ بائیستے!" کے مصداق یہ الفاظ نکل گئے: "یہاں تو قرآن مجید کا درس ہونا چاہیے" میرے پھوپھا شیخ نثار احمد نے جو میرے والد مرحوم کے حقیقی تایا زاد بھائی ہونے کے ناطے میرے تایا بھی تھے[2] میرے الفاظ کو فوراً پکڑ لیا ——— کہ "پھر دیر کس بات کی ہے، فوراً شروع کر دو!" ——— اور اس طرح اتوار کی صبح کا ہفتہ وار درس ۲۱۱۔ این، سمن آباد میں شروع ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے ایک دو دروس میں تیس پینتیس افراد شریک تھے، پھر یہ تعداد پچاس تک پہنچی، اور چند ماہ کے اندر اندر یہ درس کمرے کی وسعت سے نکل کر باہر لان تک پہنچ گیا جس کے لیے لاؤڈ سپیکر خریدنا پڑا۔ اور جب بات اس سے بھی آگے بڑھ گئی تو مسجد خضرا، سمن آباد کی انتظامیہ کے ذمّہ دار حضرات نے جو خود

---

[1] جہاں میں نے کئی سال تک رمضان المبارک میں اعتکاف بھی کیا ——— اور چونکہ سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگ سید علاؤ الدین شاہ بھی وہیں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور اس کے دَوران ان کے مسترشدین کا وہاں اجتماع ہوتا تھا اور وہ سلوک کے مسائل بیان فرمایا کرتے تھے لہٰذا میں بھی براہ راست نہ سہی بالواسطہ مستفید ہوتا رہا۔

[2] ان سطور کی تحریر کے وقت تک پھوپھی صاحبہ اور پھوپھا صاحب کا بھی انتقال ہو چکا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

بھی پابندی سے درس میں شریک ہوتے تھے اصرار کیا کہ اس درس کو مسجد میں منتقل کر دیا جائے، میں مساجد کے معاملے میں خائف تھا کہ وہاں چوہدریوں کے درمیان رسّہ کشی ہوتی ہے، لہٰذا ابتداء میں تو میں نے معذرت کی۔ لیکن بعد میں اس مجبوری کے باعث اُن کی دعوت قبول کر لی کہ شرکاءِ درس اب کسی طور مکان میں نہ سما سکتے تھے اور اس طرح آٹھ دس سال کے لیے مسجد خضرا سمن آباد اس دعوت و تحریکِ قرآنی کا مرکز بن گئی۔

مسجد خضرا سمن آباد کے اتوار کی صبح کے اس ہفتہ وار درسِ قرآن کی شہرت بہت جلد

(تسلسل) اور نہ صرف یہ کہ پھوپھی زاد بھائی شیخ نصیر احمد بھی انتقال فرما چکے ہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھائی شیخ بشیر احمد بھی داغِ مفارقت دے چکے ہیں، جو میرے بہنوئی بھی تھے ——— لیکن راقم کے شعور اور حافظہ میں ان محبّت بھری مجلسوں کی یاد ابھی تک تازہ ہے جو کئی سال تک ۱۱-۲۱-این سمن آباد میں ہر جمعہ اور اتوار کو منعقد ہوتی رہیں، اس لیے کہ ہر جمعہ کی نماز اور اتوار کے درس کے بعد مسجد خضراء سے کرشن نگر واپسی کے دوران راستے میں وہاں لازماً ٹھہرنا ہوتا تھا اور پھوپھی صاحبہ اور پھوپھا صاحب کی شفقت بھری تواضع اور بھائی نصیر احمد صاحب کی پُرخلوص مدارات کے ساتھ چائے کا (مع لوازمات) دَور چلتا تھا ——— اور واضح رہے کہ اس ’استفادہ‘ میں تنہا نہیں کرتا تھا بلکہ ان دونوں مواقع پر میرے کُل اہل وعیال بھی ساتھ ہوتے تھے۔ اس لیے کہ میں اپنے بیٹوں کو تو دوسرے تمام دروسِ قرآن میں بھی ساتھ لے جاتا تھا، جمعہ کے اجتماع اور اتوار کے درس میں تو میری اہلیہ اور بچیاں بھی لازماً شریک ہوتی تھیں۔ (جس کا اسی دنیا میں نقد صلہ مجھے یہ ملا ہے کہ میرے کُل اہل عیال بحمد اللہ میرے مشن میں میرے ساتھ شریک ہیں) بہرحال پھوپھا صاحب مرحوم، پھوپھی صاحبہ مرحومہ اور بھائی نصیر احمد و بشیر احمد مرحوم کا حق اس دعوت و تحریکِ قرآنی کے جملہ وابستگان اور استفادہ کنندگان (BENEFICIARIES) پر یہ ہے کہ وہ اُن کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہا کریں!

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَھُمْ وَارْحَمْھُمْ وَاَدْخِلْھُمْ فِیْ رَحْمَتِكَ وَحَاسِبْھُمْ حِسَابًا یَّسِیْرًا (آمین)

اور جب حق کی ادائیگی کا معاملہ زیرِ بحث آ ہی گیا ہے تو یقیناً حق تلفی ہوگی اگر یہ ذکر نہ ہو جائے کہ جب تک میرے پاس اپنی گاڑی نہ تھی، میاں محمد رشید صاحب رسول پارک اچھرہ سے اپنی گاڑی پر کرشن نگر جاتے تھے اور ہم سب کو لے کر سمن آباد آتے تھے ——— اور پھر واپس بھی پہنچایا کرتے تھے۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ

پورے لاہور میں اور پھر اس سے باہر دُور دُور تک پہنچ گئی۔ چنانچہ اس میں لاہور کے کونے کونے ہی سے نہیں، بیرونِ لاہور سے باضابطہ شدِّ رحال کر کے بھی لوگ شرکت کے لیے آتے تھے۔ لہٰذا بہت جلد اس کی حاضری دو ڈھائی سو، اور پھر تین ساڑھے تین صد تک پہنچ گئی جو بعض خاص خاص مواقع پر پانچ سو تک بھی ہو جاتی تھی[1] ——— پھر یہ درس اوسطاً ڈھائی گھنٹے پر محیط ہوتا تھا۔ اور الحمد للہ کہ اس میں سے کسی شخص کو کبھی اُٹھتے نہیں دیکھا گیا۔ اس طرح لاہور کی دینی فضا میں یہ درس ایک 'دھماکے' سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جس سے ایک خوشگوار حیرت کا تاثر پورے لاہور اور اس کے گرد و نواح پر طاری ہو گیا کہ ؎

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!"

۳۔ خطباتِ جمعہ

مسجد خضرا۔ کے خدّام اور منتظمین کا تعاون بھی اس پورے عرصے کے دوران نہایت مثالی رہا۔ انہیں اس پر خوشی بھی تھی کہ اُن کی مسجد پورے لاہور کی توجہات کا مرکز بن گئی ہے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُن حضرات کی طرف سے اصرار ہوا کہ جمعہ میں خطاب بھی آپ ہی فرمائیں۔ چنانچہ ابتداءً خطبۂ مسنونہ سے قبل خطاب ——— اور اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد باضابطہ خطیبِ مسجد کی ذمّہ داری بھی میرے کندھوں پر آگئی ——— اور میں نے اس خطبۂ جمعہ کو بھی اکثر و بیشتر درسِ قرآن کی صورت ہی دی، چنانچہ خود مجھے بھی اپنے ذاتی سرور اور کیف کا عالم یاد ہے، اور بہت سے دوسرے احباب بھی آج تک اُن تاثرات کا ذکر کرتے ہیں جو اُس وقت پیدا ہوتے تھے جب میں نے ایک خطابِ جمعہ میں پوری سورۃ القیامۃ کا درس کھڑے ہو کر خطیبانہ انداز میں دیا تھا ——— بہر حال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتوار کی صبح کے درس ہی کی مانند، جمعہ کا خطاب بھی پورے لاہور میں مشہور ہو گیا ——— اور اس کے لیے بھی دُور دُور سے لوگ آنے لگے۔ یہاں تک کہ مسجد اپنی وسعت کے باوجود تنگ پڑ گئی!

---

[1] جن میں سے کبھی کبھی ایک شخصیت مرحوم ضیاء الحق کی بھی ہوتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مجھے بہت بعد میں خود ضیاء الحق مرحوم ہی کے بتانے سے معلوم ہوا، ورنہ اُس وقت چار پانچ صد افراد میں کون کون شامل ہیں اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ میرے پاس موجود نہیں تھا۔

مسجدِ خضرا، سمن آباد میں اس دعوتِ قرآنی کو جو پذیرائی حاصل ہوئی اس پر میں خود، اور میرے قریبی ساتھی سب کے سب، شدید حیران تھے ـــــــ لیکن بالآخر اس کا راز ایک روز کھل ہی گیا ـــــــ آج کے عقلیت زدہ بلکہ گزیدہ لوگ تو شاید اس بات پر ناک بھوں چڑھائیں ـــــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسجدِ خضرا، کی اس اِستثنائی کیفیت کا اصل راز جو مجھے ایک دن اچانک معلوم ہوا یہ تھا کہ اس کا سنگِ بنیاد اُس مردِ درویش نے رکھا تھا جسے دنیا مولانا احمد علی لاہوریؒ کے نام سے جانتی ہے اور جس نے خود بھی پورے چالیس سال تک ارضِ لاہور پر درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ گویا معاملہ وہی تھا جو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

"ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام"

۴۔ مسجدِ شہدا،

افسوس ہے کہ خود ہمیں لوگوں کی سہولت، اور اس قرآنی دعوت و تحریک کی مصالح کے پیشِ نظر اس درس کو لاہور کے سب سے زیادہ مرکزی مقام یعنی مسجدِ شہدا، ریگل چوک میں منتقل کرنا پڑا، اس لیے کہ شہر سے سمن آباد جانے والے تمام راستے ٹریفک کی اصطلاح میں "بوتلوں کی گردنوں" (BOTTLE - NECKS) کی حیثیت رکھتے تھے جس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی! چنانچہ مسجدِ شہدا، میں درس کی حاضری مسجدِ خضرا، سے بھی بڑھ گئی۔ وہاں بھی راقم نے پہلے مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب ہی بیان کیا۔ بعد ازاں جب وہاں قرآنِ حکیم کا آغاز سے سلسلہ وار درسِ قرآن شروع ہوا اور سورۃ الفاتحہ زیرِ درس آئی اور ایک صاحبِ خیر کی جانب سے مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر آیتِ بسم اللہ و سورۃ الفاتحہ ہدیتہً تقسیم ہوتی تو معلوم ہوا کہ درس میں سات سو افراد شریک تھے۔ (اس لیے کہ کتاب کے سات صد نسخے تقسیم ہوتے!)

لاہور کے اتوار کی صبح کے اس مرکزی درسِ قرآن کی یہ رونقیں ۱۹۷۷ء تک لگ بھگ دس سال تک روز افزوں رہیں ـــــــ لیکن ۱۹۷۷ء میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی حکومت کے خاتمے کے قریب اتوار کی بجائے جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل کا اعلان کیا تو اس درس کی رونقیں رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں۔ اس لیے کہ جمعہ کے دن خطبہ و نمازِ جمعہ کے ساتھ کسی اضافی پروگرام کا معاملہ ناقابلِ عمل ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو یہ بھی ہوا کہ جمعہ ہی کو صبح ۹ بجے سے گیارہ بجے تک درس کی نشست رکھی گئی۔ اور پھر وہیں سے شرکاءِ درس براہِ راست جمعہ کی نماز کے لیے روانہ ہوتے۔ پھر کچھ عرصہ یہ کوشش کی گئی

کہ اُسی مسجد میں جہاں جمعہ کا خطاب ہوتا تھا پہلے باضابطہ چوکیاں لگا کر درس کی نشست ہوتی تھی اور پھر معمول کے مطابق خطابِ جمعہ اور خطبۂ مسنونہ و نماز۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی محسوس ہوا کہ یہ ایک تکلّف ہے۔ چنانچہ خطابِ جمعہ ہی پر قناعت کرنی پڑی ——— چنانچہ اب لاہور کے اتوار کی صبح کے مرکزی درسِ قرآن کی صرف سہانی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔

خطابِ جمعہ کے سلسلے میں بھی ۱۹۷۷ء کی قومی اتحاد کی تحریک کے دَوران جس نے رفتہ رفتہ عوامی احساسات و جذبات کے اعتبار سے تحریکِ نظامِ مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صورت اختیار کرلی تھی، چونکہ میں نے اسے ایک خالص سیاسی تحریک قرار دیا اور اس میں شمولیت اختیار نہ کی، مسجدِ خضراء میں کچھ صورتِ حال خراب ہوئی۔ اور بعض بد اندیشوں کو ریشہ دوانی کا موقع مل گیا۔ چنانچہ خطابِ جمعہ بھی اوّلاً پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس کی مسجد میں اور بالآخر مسجد دارالسّلام، باغِ جناح میں منتقل ہوگیا ——— یہاں یہ سلسلہ بحمداللہ، ان سطور کی تحریر کے وقت تک بخیر وخوبی جاری ہے، آئندہ کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، "وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ"!

۵۔ مسجد دارالسّلام باغِ جناح

مسجدِ خضراء کی طرح مسجد دارالسّلام کا بھی ایک خاص تاریخی پس منظر ہے، جو قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ جس مقام پر اب یہ خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے، وہاں بہت پہلے سے صرف ایک کچّا چبوترا (پنجابی تھڑا) ہوتا تھا۔ جہاں اکثر و بیشتر شام کو باغ کی سیر کے لیے آنے والوں میں سے چند، اور اسی طرح صبح کی سیر کرنے والے بعض حضرات نماز ادا کر لیا کرتے تھے۔ راقم الحروف کو اب تک یاد ہے کہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں فرسٹ اور سیکنڈ پروفیشنل ایم بی بی ایس کی تیاری کے لیے راقم بھی کبھی کبھی مسجد سے متصل 'گلستانِ فاطمہ' میں مطالعے کے لیے بیٹھتا تھا تو ظہر کی نماز اسی چبوترے پر ادا کیا کرتا تھا ——— بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں بھی اتوار کی صبح مولانا محمد علی قصوریؒ درس دیتے ہیں، ایک بار میں بھی کسی طرح وقت نکال کر شریک ہوا تو میرے اور مدرّس سمیت کل سات آدمی اس چبوترے کی زینت تھے ——— اس چبوترے پر باضابطہ مسجد کی تعمیر کرنل سلامت اللہ مرحوم کا وہ کارنامہ ہے جس کے لیے وہ ہمیشہ اس مسجد کے نمازیوں کے شکریے اور دعائے خیر کے مستحق رہیں گے۔ وہ خود ریٹائرڈ فوجی، اور نہایت

دبنگ انسان تھے اور انہوں نے اُن تمام مغرب زدہ سول افسروں سے بھرپور جنگ لڑی جو اس خوبصورت سیر گاہ کے حُسن کو مسجد کے وجود سے 'بدنما' بنانے پر تیار نہیں تھے۔ (چنانچہ ایک بار تو انہیں ایک کمشنر صاحب کے چہرے پر باضابطہ تھپڑ بھی رسید کرنا پڑا) بہرحال انہوں نے بڑی محنت و مشقت اور جانفشانی و صرفِ کثیر سے 'ادارہ دار السلام' جو ایک مسجد اور ایک لائبریری پر مشتمل ہے تعمیر کرایا۔ اور اس کے بعد ۱۹۷۶ء میں مجھ سے کہنا شروع کیا کہ میں مسجد دار السلام میں اپنے مشن کو جاری رکھوں۔ میں اب چونکہ مساجد کے بارے میں پھر بددل ہو گیا تھا لہٰذا معذرت کرتا رہا تا آنکہ ایک روز وہ ستر بہتّر سالہ، طویل القامت، اور قوی الجثہ انسان جس کی آواز بھی بھاری اور دبنگ تھی میرے مکان کے باہر کرسی بچھا کر انتہائی مسکینی کے انداز میں یہ کہہ کر بیٹھ گیا کہ میں یہاں سے اُس وقت تک نہیں اُٹھوں گا جب تک تم میری فرمائش قبول نہیں کرو گے ——— ! چار و ناچار میں نے حامی بھر لی ———

چنانچہ وہ دن اور آج کا دن مسجد دار السلام، باغِ جناح، لاہور کا اجتماعِ جمعہ ——— و نمازِ عیدین پاکستان بھر میں تو مشہور ہیں ہی، بیرونِ ملک بھی جانے پہچانے جاتے ہیں ——— یہاں تک کہ ۸۲-۸۳ء کے دوران جبکہ مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین کی جانب سے میری شدید مخالفت، اور مرحوم ضیاء الحق صاحب کی مجلسِ شوریٰ سے میرے استعفے کے باعث میرا نام بیرون ملک بھی بہت اچھل گیا تھا، مسجد دار السلام کے اجتماعِ جمعہ ——— کا ذکر اور اس کے فوٹو وال اسٹریٹ جرنل نیویارک، ٹورنٹو اسٹار کینیڈا، اور لاس اینجلیز ٹائم کیلیفورنیا تک میں شائع ہوئے۔

۶۔ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن

لاہور میں حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کہاں کہاں قائم رہے، اس کا کوئی ریکارڈ نہ تو محفوظ ہے، نہ ہی اس کی چنداں ضرورت ہے۔ یہ حلقے جیسے کہ آغاز میں عرض کیا گیا تھا، کرشن نگر سے شروع ہوئے اور پھر دل محمد روڈ، سانده، ڈھولنوال، پنجاب یونیورسٹی اسٹاف کالونی، انجینئرنگ یونیورسٹی کے ہاسٹلز، ایم اے او کالج، میڈیکل کالج ہاسٹل کی مسجد، گڑھی شاہو میں حاجی عبدالواحد مرحوم کا مکان، اقبال کالونی علامہ اقبال روڈ کی مسجد، رفاہِ عام ہال شادباغ، برکت علی اسلامیہ ہال، مسجد بیرون شاہ عالمی گیٹ، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے آفس واقع ۷۔ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، اور نمعلوم کہاں کہاں قائم رہے ——— گویا کم از کم لاہور کی حد تک تو

"دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

والا معاملہ ہو گیا۔

ان میں سے بعض کے اجتماعات ہفتہ وار ہوتے تھے اور بعض کے پندرہ روزہ، چنانچہ جمعہ اور اتوار کے روز تو اکثر تین تین درس یا خطاب ہو جاتے تھے! پھر ان میں سے اکثر میں تو مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب مکمل بیان ہوا۔ بعض میں اس کی بھی تلخیص ہی بیان ہو پائی۔

بہر حال ان میں راقم کی جو توانائیاں صرف ہوئیں اُن کے ضمن میں راقم کو تو اُس وقت بھی پورا اطمینان تھا اور آج بھی کامل اطمینان ہی نہیں انشراح و انبساط ہے کہ ع "جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" کے مصداق وہ توانائیاں اور قوتیں اللہ ہی کی عطا کردہ تھیں اور اگر اسی ہی کے کلام کے اِفشا، (حدیث مبارک میں الفاظ وارد ہوتے ہیں "وَافْشُوْهُ") واشاعت میں صَرف ہو گئیں تو ان کا اس سے بہتر اور کیا مصرف ممکن تھا! ——
البتہ بعض بزرگوں نے جو تنبیہ کی تھی اُس کی صداقت بہت جلد ظاہر ہو گئی —— مثلاً شیخ سلطان احمد صاحب، کراچی، نے انگریزی محاورے کے حوالے سے متنبہ کیا تھا کہ آپ تو اپنی شمع صرف دونوں اطراف ہی سے نہیں بیچ میں سے بھی جلا رہے ہیں —— اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی مرحوم نے فرمایا تھا کہ: "آپ کیا غضب کر رہے ہیں! ہم تو جب جمعہ پڑھایا کرتے تھے تو معمول یہ ہوتا تھا کہ پورا جمعرات کا دن یا آرام کرتے تھے یا جمعہ کے خطاب کے بارے میں سوچ بچار، اور پھر نہ صرف یہ کہ جمعے کے دن نہ صبح کوئی کام کرتے تھے نہ شام کو، بلکہ ہفتہ کا دن بھی کامل آرام کرتے تھے"! بہر حال میری اعتدال سے بڑھی ہوئی جانفشانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۶۹ء میں صحت نے ایک دم جواب دے دیا، جس کی تفصیل میں اپنی ایک دوسری تحریر میں درج کر چکا ہوں۔

قصہ مختصر یہ کہ اواخر ۱۹۶۹ء میں مَیں اس دوراہے پر کھڑا تھا کہ "یا چناں کن یا چنیں" کے مصداق یا تو یہ دعوت و تحریکِ قرآنی جس حد تک آگے بڑھ آئی ہے اس سے بھی قدرے پسپائی اختیار کر کے اِسے SEAL کر دیا جائے کہ بس اس سے زیادہ نہیں، یا پھر میڈیکل پریکٹس کو خیرباد کہہ کر "ہمہ تن اور ہمہ وقت" اسی میں لگ جایا جائے —— اور الحمد للہ کہ فروری ۱۹۷۱ء میں حج کے موقع پر ارضِ مقدس میں حتمی طور پر مؤخر الذکر فیصلہ کر کے راقم واپس آیا اور آتے ہی مطب بند کر دیا اور حملہ

اوقات اور کل توانائیاں اسی ایک کام پر مرتکز کر دیں تو مارچ ۱۹۷۱ء سے اس دعوت و تحریک کی رفتار پہلے سے ایک دم کئی گنا بڑھ گئی۔ چنانچہ ایک جانب تو اس کا لاہور سے باہر دائرۂ اثر جو اُس وقت تک صرف 'میثاق' اور دوسری مطبوعات یا گاہے گاہے بیرونی اسفار تک محدود تھا ایک دم بہت وسعت اختیار کر گیا (اس کا تفصیلی ذکر اس دعوت و تحریک کے دَورِ ثانی کی رُوداد کے ضمن میں آئے گا۔) اور دوسری جانب ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء کو 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کا قیام عمل میں آ گیا اور یہ دعوت و تحریک اپنے دوسرے دَور میں داخل ہو گئی۔

۶۔ آغاز سے سلسلہ وار درسِ قرآن

لاہور کے ان حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن اور مرکزی درس کے ضمن میں اس بات کا بھی ذکر ہو جاتے تو اچھا ہے کہ مسجد خضراء میں راقم نے آغاز میں منتخب نصاب کا درس دیا تھا، اس کی تکمیل پر شروع سے مسلسل درسِ قرآن شروع ہوا۔ پھر اک بار کسی سبب سے قدرے وقفہ ہوا تو دوبارہ پھر ایک بار منتخب نصاب کا اعادہ کیا ـــــــ اور اس کے بعد مسلسل درس جاری کیا ـــــــ پھر مسجد شہداء میں بھی اوّلاً منتخب نصاب ہی بیان ہوا، اس کے بعد وہاں بھی آغاز سے مسلسل درس شروع کر دیا۔ اس طرح ایک زمانے میں لاہور میں ان دو مقامات پر مسلسل درس جاری تھا۔ (بعد میں مسجد خضراء کا درس مسجد دارالسّلام میں منتقل ہو گیا۔) لیکن افسوس کہ اتوار کی صبح کی نشست کے ختم ہو جانے کے باعث اس مسلسل درس کا سلسلہ بہت سُست رفتاری سے آگے بڑھ سکا۔ چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت تک یہ درس اٹھائیسویں پارے کے اختتام تک پہنچ سکا ہے۔ مزید افسوس کی بات یہ کہ اگرچہ بہت سے حصّوں کے دروس ٹیپ میں محفوظ ہیں، اس کی مکمل اور مسلسل ریکارڈنگ محفوظ نہیں ہے۔ اور اگرچہ بہت سے احباب کا شدید تقاضہ ہے کہ ایک بار از سرِ نو سورۃ الفاتحہ سے آغاز کر کے پُورے قرآن حکیم کے درس کو ٹیپ میں محفوظ کر لیا جائے اور فی الوقت "قرآن آڈیٹوریم" کا جو عظیم منصوبہ زیرِ تکمیل ہے اس کی بنیاد میں بھی یہی خواہش یا آرزو کارفرما ہے۔ لیکن اپنی عمر اور صحت کی کیفیت کے پیش نظر اس کی امید بہت ہی کم ہے اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہ ـــــــ اور ظاہر ہے کہ اس کی شان یقیناً یہ ہے کہ "وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ" ـــــــ اور ہمارا ایمان بھی یہ ہے کہ ہو گا وہی جو وہ چاہے گا! اور ہمارے شایانِ شان تو یہی ہے کہ اس کی رضا پر راضی رہیں!

"لاہور کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن" اور "اتوار کی صبح کے مرکزی درس" کا یہ بیان نامکمل رہے گا ــــــ اگر دو چیزیں ہدیۂ قارئین نہ کر دی جائیں۔

۷۔ اعلان شائع شدہ 'میثاق' جنوری ۷۶ء

ایک 'میثاق' بابت جنوری ۱۹۷۶ء کے کور کے اندرونی جانب شائع شدہ اعلان کا عکس:

حسن اتفاق سے اس بار ہجری اور عیسوی سن تقریباً ساتھ شروع ہوئے ہیں
اور ان کے ساتھ ہی لاہور میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی قرآن مجید کے علم و حکمت کے نشر و اشاعت کی مساعی بھی آٹھ سال مکمل
کر کے نویں میں داخل ہو گئی ہیں اور اس وقت ان کے

درس قرآن کی مستقل ہفتہ وار نشستوں

کا پروگرام حسب ذیل ہے:

ــــــ (۱) ــــــ

ہر جمعرات کو بعد مغرب برکت علی اسلامیہ ہال میں

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا نصف آخر زیر درس ہے

ــــــ (۲) ــــــ

ہر جمعہ کو قبل جمعہ (۱ بجے) جامع مسجد نیو یونیورسٹی کیمپس میں

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ابتداء سے زیر درس ہے

ــــــ (۳) ــــــ

ہر ہفتہ کو بعد عصر مسجد دارالسلام باغ جناح میں

قرآن حکیم سورۃ بنی اسرائیل سے آگے سلسلہ وار زیر درس ہے

ــــــ (۴) ــــــ

ہر اتوار کو صبح ۹ بجے، مسجد شہداء ریگل چوک میں

قرآن حکیم ابتداء سے سلسلہ وار زیر درس ہے
(حال ہی میں تیسرے پارے کا آغاز ہوا ہے)

ع "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"

المعلن

میاں محمد رشید، ناظم اعلیٰ، انجمن خدام القرآن لاہور

۸- کچھ ذاتی، اور بعض ناقدین کے تأثرات

دوسرے[1] ان دروس کے بارے میں خود میرے اپنے اور دو دیگر حضرات کے تأثرات کے ذکر پر مشتمل میری تحریر۔ جو دسمبر ۱۹۷۶ء کے 'میثاق' میں اس وقت شائع ہوئی تھی جب مولانا امین احسن اصلاحی سے میرے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے، اور ان کی جانب سے میری مخالفت کی مہم شدت کے ساتھ جاری تھی۔

"اور اس عاجز پر اللہ کا یہ بڑا فضل ہے . . . . اور سب سے بڑھ کر اطمینان بخش بات یہ ہے کہ اس دعوت کا آغاز نہ کسی مصنف کی تصانیف سے ہوا نہ کسی خطیب کے خطبات و تقاریر سے بلکہ بحمد اللہ 'درسِ قرآن' سے ہوا ــــ اور اللہ کی کتاب کی ترجمانی اور افہام و تفہیم میں بھی، بالفضلہٖ تعالٰے وعونہٖ، کسی ایک لکیر کی فقیری نہیں بلکہ ابو الکلام اور ابو الاعلیٰ کی دعوتِ جہاد کا عنصر بھی شامل ہے اور فراہیؒ اور اصلاحی کے تفکّر و تدبّر[1] کا جوہر بھی، اور شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ کے احوالِ باطنی و نکاتِ روحانی کی چاشنی بھی موجود ہے اور ڈاکٹر اقبال کے جذبۂ ملّی کی حرارت

---

[1] یہ بات اب تو یقیناً مولانا اصلاحی اور ان کے بعض شاگردوں کو بہت ناگوار ہو گی لیکن غالباً مولانا بھولے نہ ہوں گے جناب وحید الدّین خاں صاحب، مؤلفِ 'تعبیر کی غلطی' اور مدیر مجلّہ 'الرّسالہ' دہلی کی شہادت جو انہوں نے راقم کے بعض دروس میں شمولیت کے بعد مولانا کے سامنے دی تھی کہ راقم کے درس میں فکرِ فراہیؒ کے اثرات سموئے ہوئے ہیں اور اگر یہ یاد نہ ہو تو بھی مولانا کے اپنے وہ الفاظ تو مطبوعہ موجود ہیں جو انہوں نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" پر تقریظ میں تحریر فرمائے تھے کہ ــــ "اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز امیدیں ان سے وابستہ ہیں"۔ عجب اتفاق ہے کہ اسی کے لگ بھگ الفاظ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی وفات پر تعزیتی مضمون میں ان کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی کے بارے میں لکھے تھے کہ "۔ . . جن میں قابلِ ذکر مولوی امین احسن اصلاحی ہیں، ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں"۔

اور ان کی اور ڈاکٹر رفیع الدین کی علوم جدیدہ اور فکرِ جدید پر قرآن حکیم کی روشنی میں جرح و تنقید کی کڑوی کونین بھی! ——— یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے تو یہ کہا ہے کہ "آپ کے درس کے بارے میں یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ اس سے ہر شخص کچھ نہ کچھ ضرور لے کر اٹھتا ہے"[1]۔ اور احباب کا کہنا یہ ہے کہ اس میں حد درجہ 'جامعیت' ہوتی ہے ——— اگر ان کا خیال کسی بھی درجے میں صحیح ہے اور جامعیت سے کوئی حصّہ راقم کو فی الواقع ملا ہے تو یہ سراسر فیض ہے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے اُنسِ قلبی، مناسبتِ ذہنی اور کسی درجے میں نسبتِ روحانی کا۔ اور اگر ان کا خیال مطابقِ واقعہ نہیں تب بھی راقم ربّ العزّت سے خواستگار ہے کہ وہ اُسے اس جامعیتِ کُبریٰ میں سے قدرِ قلیل ہی سہی مگر کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور عطا فرما دے جس کا مظہرِ اتم تھے بارہویں صدی ہجری میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور چودھویں صدی ہجری میں شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ ——— گویا بقول اقبالؔ ؎

"میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
مَیں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر!"

اور ظاہر ہے کہ اللہ کی شانِ کریمی سے یہ بعید بھی نہیں۔ ع

"شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را"

۹۔ مولانا اصلاحی کا درسِ قرآن و حدیث

کرشن نگر میں جیسے ہی میرے حلقۂ درس شروع ہوئے، مَیں نے ایک ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث مولانا امین احسن اصلاحی کا بھی شروع کرا دیا جو ابتداءً میرے ہی مکان پر ہر اتوار کی سہ پہر کو ہوتا تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد ہیرن روڈ کی مسجد میں منتقل ہو گیا۔ اس درس میں ابتداءً تو حاضری اچھی رہی لیکن جلد ہی محسوس ہوا کہ مولانا کے علمی مقام اور سامعین کی ذہنی سطح کے مابین فرق و تفاوت بہت زیادہ ہے لہٰذا لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی چلی گئی۔ ادھر کچھ عرصہ کے بعد مولانا شدید علیل ہو گئے اور یہ علالت بھی کچھ اعصابی اور کچھ ذہنی تھی ——— لہٰذا یہ سلسلۂ درس بھی منقطع ہو گیا۔

---

[1] یہ الفاظ ہیں مولانا اصلاحی کے شاگردِ رشید ——— خالد مسعود صاحب کے برادرِ نسبتی ڈاکٹر انوار احمد بگوی کے جو راقم کے کرم فرماؤں اور شدید ناقدوں میں سے ہیں۔

دارالاشاعت الاسلامیہ

کے مقصد کی وضاحت پر مشتمل خوشنما بلاک جو ماہنامہ 'میثاق' کے کور پر چھپا کرتا تھا

دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجہات قرآن حکیم کی جانب منعطف ہوں، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہو ــــــ اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور ان میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کیلئے وقف کر دیں۔

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے!

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

یہ ادارہ ۱۹۶۶ء میں قائم ہوا تھا اور ۱۹۷۲ء میں انجمن کی تاسیس تک قائم رہا

۳۔ دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور

اور سلسلۂ مطبوعات قرآن اکیڈمی

دعوت رجوع الی القرآن' اور 'تحریکِ تعلیم و تعلّم قرآن' کے دورِ اوّل کا تیسرا اہم سنگِ میل 'دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور' اور اس کا سلسلۂ مطبوعات ہے۔

میرا یہ خالص نجی اشاعتی ادارہ اوائل ۱۹۶۶ء ہی میں قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کا پہلا ایڈیشن بھی اِسی کے زیرِ اہتمام اپریل ۶۶ء میں شائع ہوا ———— اور ماہنامہ 'میثاق' کا میرے زیرِ ادارت اجرا بھی اگست ۶۶ء میں اِسی کے تحت ہوا۔

اس ادارے کے قیام کا "مقصد" جو 'میثاق' کے کور پر پہلے ٹائپ میں چھپتا رہا، بعد ازاں ستمبر ۶۸ء سے ایک خوشنما بلاک کی صورت میں مستقل طور پر شائع ہوتا رہا، مقابل کے صفحے پر دیکھا جا سکتا ہے، جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بحمد اللہ راقم کے اہداف بالکل آغاز ہی سے نہایت واضح تھے! اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں ان مقاصد کے تحت قائم ہونے والے ادارے سے کسی مالی منفعت کے حصول کا امکان کسی ایسے ہی شخص کے ذہن میں آ سکتا ہے جو عقل سے بالکل کورا ہو!

ایک اور اہم حقیقتِ واقعی بھی، جسے اس سے قبل راقم نے نجی گفتگوؤں میں تو بارہا بیان کیا ہے، تاہم آج تک تحریر میں نہیں آئی، آج مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ریکارڈ پر بھی لے آیا جاتے۔ اور وہ یہ کہ لاہور منتقل ہونے کے فوراً بعد میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ "اللہ تعالےٰ نے آپ کو قرآن حکیم کے علم سے حصّۂ وافر عطا فرمایا ہے' اور مجھے کسی قدر تنظیمی صلاحیت سے نوازا ہے، ہم دونوں مل کر ایک ادارہ قائم کر سکتے ہیں جو قرآن حکیم کے علم و حکمت کی اشاعت کا کام کرے اور خاص طور پر قرآن کے نام پر سنّتِ رسولؐ کے استخفاف اور مخالفت کا جو فتنہ غلام احمد پرویز کی تصانیف کے ذریعے پھیل رہا ہے اس کی بیخ کنی کریں۔

اس لیے کہ اب تک اِس فتنے کے جواب میں علماء کرام نے صرف مدافعانہ روش اختیار کی ہے' یعنی حجیّتِ حدیث اور اہمیّتِ سنّت کے موضوع پر کتابیں شائع کی ہیں، جبکہ ضرورت اِس امر کی ہے کہ اس فتنے پر جارحانہ حملہ کیا جائے اور اس کے مقابلے میں ایک جوابی قرآنی تحریک برپا کی جائے جو ع "عشق خود اک سیل ہے' سیل کو لیتا ہے تھام!" کے انداز میں پرویزیت کے گمراہ کُن اور نام نہاد 'تفکرِ قرآنی' کا استیصال کرے ـــــ البتہ اس سلسلے میں 'معاملہ' کی یہ بات واضح طور پر طے ہو جانی چاہیے کہ مجوّزہ ادارہ آپ کی اوسط معیار کے مطابق پوُری مالی کفالت کا ذمّہ لے گا، لیکن پھر آپ کی جُملہ تصانیف اس ادارے کی ملکیّت ہوں گی ـــــ اگرچہ آپ پر تحریر اور تصنیف و تالیف کے ضمن میں کسی مقدار کی کوئی پابندی ہرگز نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ آزاد ہوں گے کہ فطری رفتار سے اطمینان کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھیں!" ـــــ لیکن افسوس کہ مولانا نے میری اِس تجویز کو یہ کہہ کر ردّ کر دیا کہ "آپ میرے حالات و مسائل سے واقف نہیں ہیں!" اور مولانا کے اس انکار کے بعد ہی راقم نے مجبوراً اپنا نجی اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ جس نے مولانا سے اُن کی تصانیف کا حقِّ اشاعت نقد معاوضے پر حاصل کیا۔ چنانچہ 'میثاق' بابت نومبر ۶۸ءکے کور پر مولانا کی جانب سے یہ" اہم اعلان" جلی طور پر شائع ہوا کہ :

"میری تصنیفات میں سے اکثر کے پہلے ایڈیشن عرصہ سے ختم ہو چکے تھے۔ قدر دانوں کا شدّت سے اصرار تھا کہ اُن کی طباعت اور اشاعت کا کوئی قابل اطمینان انتظام کیا جائے لیکن حالات مساعد نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا تھا۔ اب میں نے ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، مالک

دارُ الاشاعۃ الاسلامیہ لاہور

کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ـ 1 (فون 69522)

کے سپرد کیا ہے، امید ہے کہ یہ انتظام قابل اطمینان ثابت ہوگا اور جلد یہ کتابیں چھپنی شروع ہو جائیں گی . . . . !"

یہاں اس بات کی مزید وضاحت ہو جائے تو بہتر ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ واقعۃً اتنی سادہ نہیں تھی۔ صورتِ واقعی یہ تھی کہ مولانا کو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے دس سال بیت چکے تھے اور چونکہ اس عرصے میں کوئی ادارہ یا نئی ہیئتِ تنظیمی قائم نہیں ہو سکی تھی لہٰذا اُن کی تصانیف بالفعل "نَسْیًا مَّنْسِیًّا" کی مصداق بن چکی تھیں —— اور جب دارالاشاعت الاسلامیہ نے اُن کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا نے فرطِ جذبات میں یہ الفاظ فرماتے تھے: "مَیں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے دوبارہ زندہ کر دیا!" بالخصوص جب تفسیر تدبّرِ قرآن کی جلد اوّل طبع ہوئی اور الفاظِ قرآنی: "وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ" کے مصداق نہایت اعلیٰ معیار پر اور حد درجہ آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی تب تو اُن کا تشکر و امتنان انتہا کو پہنچ گیا۔ (اس لیے کہ اُس کا مسوّدہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کے پاس گویا 'رہن' تھا اور مَیں نے ہی اُسے واگذار کرایا تھا۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ مولانا نے اپنی ضروریات کے لیے وقتاً فوقتاً حکیم صاحب سے کچھ رقوم قرض لی تھیں، جن کی واپسی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو رہی تھی، ایک بار حکیم صاحب ملاقات کیلئے آئے تو مولانا نے تفسیر کی جلد اوّل کا تصحیح شدہ مسوّدہ اُن کے سامنے رکھ دیا گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں کہ ع "یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر۔ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!" چنانچہ حکیم صاحب اسے لے تو گئے لیکن ان کی 'وہابیت' اُس کی اشاعت میں حائل رہی اور وقت اسی طرح گزرتا جا رہا تھا کہ میری لاہور منتقلی ہو گئی اور مَیں نے حکیم صاحب کی رقم اُن کو ادا کر کے مسوّدہ حاصل کر لیا!

بہر حال 'دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور' نے چھ سالوں کے عرصے میں تفسیر تدبّرِ قرآن کی دو ضخیم جلدوں کے علاوہ مولانا اصلاحی کی دو معرکۃ الآرا تصانیف، جن سے مجھے آج تک عشق کی حد تک تعلقِ خاطر ہے، یعنی "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" اور "مبادیٔ تدبّرِ قرآن" شائع کیں۔ اور ان کے علاوہ دو چھوٹے کتابچے بھی شائع کیے یعنی "قرآن اور پردہ" اور "اقامتِ دین کے لیے انبیاءِ کرام کا طریق کار"۔

۱۹۷۲ء میں جیسے ہی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی، راقم نے 'دارالاشاعت' کی بساط لپیٹ دی، چنانچہ مولانا کی تصانیف کی اشاعت کے ضمن میں بھی ایک نیا معاہدہ انجمن اور مولانا کے مابین

طے پا گیا! اور یہ معاملہ ۷۶ء میں مولانا سے راقم کے ذاتی تعلقات کے انقطاع کے بعد بھی جاری رہا۔ تا آنکہ ۱۹۸۲ء میں یہ تعلق بھی منقطع ہو گیا۔ جس کے سبب کی وضاحت کے لیے 'حکمتِ قرآن' بابت جولائی و اگست ۸۲ء میں راقم کی یہ عبارت شائع ہوئی:

"مولانا امین احسن اصلاحی سے 'وصل و فصل' کی داستان کے آخر میں عرض کیا گیا تھا کہ:

"مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنّف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدّام القرآن اور مولانا کے مابین ہے۔"

قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب یہ تعلق بھی ختم ہو چکا ہے اور انجمن نے اپنی ادا کردہ رقم واپس لے کر مولانا کو ان کی جملہ تصانیف کے حقوقِ اشاعت واپس لوٹا دیئے ہیں۔

سبب اس کا یہ ہوا کہ 'تدبرِ قرآن' کی جلد چہارم میں سورۂ نور کی تفسیر کے ضمن میں مولانا نے حدِ رجم کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اُس نے کم از کم اس مسئلے میں انہیں اہلِ سنّت کی صفوں سے نکال کر منکرینِ حدیث کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ جس وقت یہ جلد چھپی راقم نے ابھی اسے پڑھا نہیں تھا۔ بعد میں جب یہ بات راقم کے علم میں آئی تو سخت صدمہ ہوا کہ اس رائے کی اشاعت میں راقم الحروف اور اس کی قائم کردہ 'انجمن خدام القرآن' بھی شریک ہے۔ تاہم جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اُس پر تو اب سوائے استغفار کے اور کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اس جلد کی دوبارہ اشاعت پر طبیعت کسی طور سے آمادہ نہ ہوتی ——— ادھر یہ بھی کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک مصنّف کی تصنیف کی اشاعت صرف اس لیے رُک جائے کہ وہ اُس کے حقوقِ اشاعت کسی ادارے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے ———

بنا بریں تفسیر 'تدبرِ قرآن' کی بقیہ چار جلدوں کے ناشر برادرم ماجد خاور صاحب نے جیسے ہی مولانا کی جملہ تصانیف کے حقوقِ اشاعت کی واپسی کے سلسلہ میں گفتگو کی، راقم نے فوری آمادگی کا اظہار کر دیا اور الحمدللہ کہ خاور صاحب کی مساعیٔ جمیلہ اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلسِ منتظمہ کی منظوری سے یہ معاملہ بغیر کسی تلخی کے بااحسن وجوہ طے پا گیا ———

الغرض مولانا سے اب یہ رشتہ بھی بالکلیہ منقطع ہو گیا ہے!

اسرار احمد"

بہرحال مولانا امین احسن اصلاحی اور اُن کی تصانیف کی طباعت واشاعت کا ذکر تو اس وقت جملۂ معترضہ اور اصلاً اس تحریر کے تکملہ کے حکم میں ہے جو راقم نے دسمبر ۷۶ئہ میں مولانا سے اپنے "وصل و فصل" کی داستان کے ضمن میں لکھی تھی، فی الوقت تاریخ دعوتِ رجوع الی القرآن کے سلسلے میں اصل اہمیت راقم کے اُن چار کتابچوں کو حاصل ہے جو اس تحریک کے دورِ اوّل میں دارالاشاعت الاسلامیہ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئے، اور جن میں سے دُو کو تو بلاشبہ اس دعوت و تحریک کے سنگ ہائے میل ہی نہیں، سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے یعنی :

۱- 'اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام' اور

۲- 'مسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق'۔

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ

یہ مختصر سی تحریر مئی ۶۷ئہ میں راقم کے قلم سے کسی انتہائی جذب و کیف کے عالم میں صادر ہو کر جون ۶۷ئہ کے 'میثاق' میں بطور 'تذکرہ و تبصرہ' شائع ہوئی تھی اور اس میں ایمان و اسلام کے اعتبار سے موجود الوقت احوال کا جائزہ لے کر "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کی پہلی شرطِ لازم یعنی "تجدیدِ ایمان" کے لیے قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساس اور وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر ـــــ "ایک زبردست علمی تحریک" کی ضرورت کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اور اس کے آغاز کے لیے ایک "قرآن اکیڈمی" کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ بعد میں اسے کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا جس کو تعلیم و تعلّمِ قرآن کی فکری اساس اور مینی فسٹو (MANIFESTO) کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

اس تحریر پر سب سے پہلا ردِّ عمل، اور سب سے گہرا تاثّر تو پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی جانب سے ظاہر ہوا۔ چنانچہ انہوں نے زبانی تو یہ فرمایا کہ: "گزشتہ پچاس سال کے دوران جتنا دینی لٹریچر کم از کم اُردو زبان میں شائع ہوا ہے وہ سب میری نظر سے گزرا ہے لیکن میں نے اس معیار کی کوئی تحریر آج تک نہیں دیکھی!" ــــــ اور پھر شدتِ تاثّر میں ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کر دیا (جو اس کتاب میں بھی شامل کیا جا رہا ہے) اور چونکہ اس مقالے نے میری پُرزور تائید اور کلّی تصویب و تحسین کے علاوہ بجائے خود "فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر" کے موضوع پر ایک نہایت قیمتی دستاویز کی صورت اختیار کر لی تھی، لہٰذا "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کے

پہلے ایڈیشن میں افادۂ عام کی غرض سے راقم نے اسے بھی شامل کر لیا تھا ——— چنانچہ ان دونوں تحریروں پر جو مجموعی تبصرہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے قلم سے 'صدقِ جدید' (۷ فروری ۶۹ء) میں شائع ہوا، اُس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"دونوں مقالے ماہ نامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دونوں فکر انگیز ہیں۔ اور ایک طرف جوش و اخلاص، دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج، دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں، رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔"

——— مولانا عبدالماجد دریا بادی ———

اس کے علاوہ یُوں تو اس کتابچے پر نہایت زوردار تبصرے ملک کے تقریباً سب ہی دینی اور علمی جرائد نے شائع کیے، لیکن پاکستان ٹائمز لاہور کے مضمون نگار جناب صفدر میر نے جو 'زینو' کے قلمی نام سے علمی اور ادبی تبصرے لکھا کرتے تھے، اس پر ایک طویل مقالہ سپردِ قلم کیا جو اخبار کے ادارتی صفحے پر شائع ہوا۔ اس کا ایک مختصر سا اقتباس بھی ریکارڈ پر لے آنے کے قابل ہے:

"........Many official and unofficial, political and non-political agencies have recently been trying to issue calls and manifestoes for starting a renaissance movement in the thought of Islam. The most recent and by far the most interesting is a pamphlet by Dr. Israr Ahmed,..........This pamphlet, "Islam Ki Nisha'at-e-Sania", is a very important document and needs to be studied by all Muslims because it makes the attempt, rare in these days, to come to grips with the fundamental issue of our situation as Muslims in the modern world......"

'Cultural Notes' by 'ZENO'

The Pakistan Times, Lahore, Friday, June 14, 1968

ذاتی طور پر راقم کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش اور حوصلہ افزا تبصرہ برادرِ عزیز ابصار احمد سلمہٗ کا تھا۔ جو ان ہی دنوں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (فلسفہ) سے فرسٹ کلاس فرسٹ حیثیت میں فارغ ہو کر فلسفے کی مزید تحصیل کے لیے انگلستان گئے تھے۔ (میں نے تو انہیں ایم اے

فلسفہ کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے نفسیات کے لیے داخلہ دلوا کر ڈاکٹر محمد اجمل صاحب کی شاگردی میں دے دیا تھا۔ لیکن پھر اچانک گھر بیٹھے پی ایچ ڈی کے لیے وظیفہ مل جانے پر وہ انگلستان چلے گئے تھے۔) اس پر خاندان کے تقریباً سب ہی لوگ پریشان تھے کہ ایک تو انگلستان کا ماحول، اور دوسرے فلسفے کی تعلیم!! اللہ ہی خیر کرے!! تاہم مجھے ایک گونہ اطمینان حاصل تھا اس لیے کہ چار پانچ سال قبل منٹگمری میں جو اسلامی ہاسٹل، میں نے قائم کیا تھا وہ اُس میں مجھ سے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب" کا درس لے چکے تھے اور اُن کے ذہن کو حکمت قرآنی سے مناسبت حاصل ہو چکی تھی۔ تاہم جب میں نے اُن کے ۴ دسمبر ۶۷ء کے خط میں یہ الفاظ پڑھے: "نومبر دسمبر ۶۷ء کا 'میثاق'، مضامین کے تنوع کے اعتبار سے بہت اچھا تھا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا مضمون (فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر) خاصا معلومات افزا ہے اور تحریر میں بھی اُن کا زورِ دار اندازِ تکلم جھلکتا ہے۔۔۔" تو رہی سہی تشویش بھی ختم ہو گئی ——— اور پھر جب ۲۵ دسمبر ۶۷ء کے خط میں انہوں نے لکھا: (شائع شدہ 'میثاق' فروری ۶۸ء)

"جون ۶۷ء کے پرچے کا 'تذکرہ و تبصرہ' بلا مبالغہ پانچ چھ مرتبہ پڑھا ہے اور ہر بار کوئی نہ کوئی نیا نکتہ ہاتھ لگا ہے!"

تب تو کامل اطمینان حاصل ہو گیا کہ اِن شاء اللہ العزیز، انگلستان کا ماحول اور فلسفے کی تعلیم اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اور الحمد للہ کہ راقم کا یہ وثوق و اطمینان صحیح ثابت ہوا ——— اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ!!

'انجمن خدام القرآن' اور 'تنظیم اسلامی' کی تربیت گاہوں میں راقم الحروف نے اپنی اس مختصر تحریر کو بارہا وضاحت کے ساتھ بیان کیا تو تین تین گھنٹوں کی کم از کم دو نشستوں میں بات مکمل ہو سکی اور رفقاء و احباب نے اس تاثر کا شدّت اور اصرار کے ساتھ اظہار کیا کہ اس کی 'شرح' لکھی جانی چاہیے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کب اور کون اس خدمت کو سرانجام دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عزیزم ابصار احمد سلمہٗ ہی جنہوں نے اس کا انگریزی میں نہایت خوبصورت ترجمہ کیا ہے کبھی اس اہم خدمت کا بیڑا بھی اُٹھالیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو الفاظ قرآنی "وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا

(الفتح: ۲۶) کے مصداق اس کے حقدار ہی نہیں، ذمہ دار بھی ہیں، اور فلسفے میں ایم فل (ریڈنگ) اور پی ایچ ڈی (لندن) کی ڈگریاں رکھنے کے ناطے یقیناً اہل بھی ہیں!

بہرحال راقم کو یقین ہے کہ، ان شاء اللہ العزیز، یہ کتابچہ علامہ اقبال مرحوم کی "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" کے ساتھ "حکمتِ ایمانی کی تدوینِ جدید" کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرنے والے ضمیمے کی حیثیت سے تادیر زندہ رہے گا ——— واللہ اعلم!

۲۔ قرآن مجید کے حقوق

'دعوتِ رجوع الی القرآن' کے ضمن میں فکری اعتبار سے جو حیثیت "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کی ہے، بحمداللہ دینی اعتبار سے وہی مرتبہ و مقام "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا ہے۔

اس کا اساسی تانا بانا مسجد خضراء سمن آباد میں میرے دو اوّلین خطاباتِ جمعہ (جنوری ۶۸ء) میں تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد فروری میں مَیں نے اسی موضوع پر متعدد مقامات پر (قصور، صادق آباد، جھنگ وغیرہ) تقاریر کیں، اور چونکہ ع "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" کے مصداق میرے ذہن میں خیالات کا ترشح تقریروں کے دوران ہی ہوتا ہے، لہٰذا رفتہ رفتہ اس کتابچے کے مضامین بھی پختہ تر اور مکمل تر ہوتے گئے ——— تاآنکہ وسط ۱۹۷۰ء میں جبکہ مَیں شدید علالت کی بنا پر 'آرام' کی غرض سے جوہر آباد بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کے یہاں پندرہ روز کے لیے مقیم تھا، مَیں نے اسے موجودہ کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس، بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کتابچے کو عوام و خواص دونوں میں جو قبول عام عطا فرمایا اس کا تفصیلی بیان ضروری بھی نہیں اور اس میں کچھ زیادہ ہی 'خود ستائی' کا اندیشہ ہے لہٰذا صرف چند اشارات پر اکتفا کی جا رہی ہے:

۱۔ اب تک ہمارے اپنے اہتمام میں اس کے آٹھ ایڈیشن تو برائے فروخت طبع ہو چکے ہیں جن کے دوران کل ایک لاکھ چھبیس ہزار نسخے شائع ہوئے۔ مزید برآں ایک سال ماہ رمضان مبارک میں اس کا ایک سستا ایڈیشن مفت تقسیم کے لیے شائع کیا گیا تھا اور وہ بھی ایک لاکھ کی تعداد میں

طبع ہوا تھا ـــــــ اس کے علاوہ بہت سے اداروں (مثلاً کراچی کے صدّیقی ٹرسٹ اور پاکستان نیشنل آئلز کی سیرت کمیٹی وغیرہ) نے اسے بڑی تعداد میں اپنے طور پر شائع کیا۔

۲۔ اس پر مولانا امین احسن اصلاحی اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے نہایت اعلیٰ تقاریظ لکھیں (اِن کی تفصیل کی اس لیے کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ کتابچے کے آخر میں مستقلاً شائع ہوتی ہیں!)

۳۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی ماڈل ٹاؤن لاہور کی کسی کوٹھی میں ہفتہ وار مجلس سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ اس کتابچے کی اشاعت کے بعد انہوں نے اجتماعات میں ان ہی پانچ حقوق کو سلسلہ وار بیان کیا ـــــــ اور پھر سامعین کا تأثر ان الفاظ میں نقل کیا کہ: ”آپ آج تک تو اِدھر اُدھر ہی کی باتیں کرتے رہے تھے، مفید دینی تقریریں تو آپ نے اب کی ہیں!“

۴۔ اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم نے جو اُن ہی دنوں ہیلی کالج آف کامرس کے شعبۂ انگریزی کی صدارت سے فارغ ہوتے تھے، انتہائی محنت اور ذوق وشوق کے ساتھ کیا۔ پھر سکرپٹ کو خود ہی ٹائپ بھی کیا اور پریس میں ٹائپ SETTING بھی خود اپنی نگرانی میں کرائی اور دو تین بار پروف بھی خود پڑھے! (اور یہ سارا کام کلّیۃً ازخود، اور بغیر کسی معاوضے کے کیا!)

۵۔ اسی طرح اس کا فارسی ترجمہ بھی ڈاکٹر محمد بشیر حسین مرحوم، سابق صدر شعبۂ فارسی، جامعہ پنجاب نے بالکل اسی شان کے ساتھ بلا فرمائش ازخود و بلا مُزد کیا۔ (پروفیسر ابراہیم صاحب سے تو کسی حد تک میری ذاتی شناسائی تھی اس لیے کہ وہ سمن آباد کے درس کے مستقل شرکاء میں سے تھے! ڈاکٹر بشیر صاحب سے تو میرا سرے سے کوئی تعارف ہی نہیں تھا!)

۶۔ اِسی طرح اس کا عربی ترجمہ برادرم صہیب حسن خلف الرشید مولانا عبد الغفار حسن نے بھی ازخود کیا ـــــــ اور اس کا سبب یہ بیان کیا کہ ”جب میں نے اس کتابچے کو پڑھا اور اس کا گہرا اثر اپنے دل پر محسوس کیا اس پر مجھے خیال آیا کہ اگر اس کتاب کا اثر ایک ’مولوی‘ کے دل پر بھی ہو سکتا ہے تو عام لوگوں کے حق میں تو یہ یقیناً ’کیمیا‘ ثابت ہوگا!“۔ اُن کا ترجمہ پہلے ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ماہوار مجلّہ ”البعث الاسلامی“ میں پانچ اقساط میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ”جمعیۃ خدام القرآن المرکزیہ بلاہور“ نے اسے کتابچے کی صورت میں طبع کیا۔

۷۔ حال ہی میں اس کا سندھی ترجمہ بھی "انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی" نے شائع کیا ہے۔

۸۔ ایک افغان مہاجر عالم دین نے اس کا پشتو ترجمہ بھی مکمل کر کے از خود چھپوانے کے لیے کتابت کی غرض سے ایک کاتب صاحب کو دے دیا تھا۔ افسوس کہ اُس کے بعد وہ کاتب صاحب لاپتہ ہو گئے! اللہ کرے کہ زندہ ہوں، اور اُن عالم دین کی محنت رائیگاں نہ جائے۔!

۹۔ آخری اور اہم ترین بات یہ کہ اس کتابچے کو راقم الحروف نے نومبر ۱۹۷۰ء میں مدینہ منورہ میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پیش کیا کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں اور اگر کوئی غلطی محسوس کریں تو اصلاح فرما دیں۔ اس لیے کہ میں اسے بڑی تعداد میں شائع کرنا چاہتا ہوں، تو الحمدُ للہ کہ مولاناؒ نے مسجد نبویؐ میں اعتکاف کی حالت میں اس کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا اور صرف ایک مقام پر اصلاح تجویز فرمائی جو اگلے ایڈیشن میں کر دی گئی ــــــ اس طرح بحمداللہ اس کتابچے کو مولانا بنوریؒ کی کلّی تصدیق و تصویب کی سعادت حاصل ہے!

بہر حال راقم کے نزدیک اُس کا سب سے بڑا توشۂ آخرت یہ کتابچہ ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں میں تو شامل نہیں ہے جو "من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل" پر تکیہ کر سکیں۔ تاہم راقم کو یقین ہے کہ اللہ کے بہت سے بندوں کو اس کتابچے کے ذریعے تذکّر بالقرآن، اور تدبّرِ قرآن کی ترغیب حاصل ہوئی ہے ــــــ اور اِن شاء اللہ العزیز، آئندہ بھی ہوتی رہے گی ــــــ فَلَهُ الحَمدُ والمِنّةُ

ان دو اساسی کتابچوں کے علاوہ دعوتِ رجوع الی القرآن کے دورِ اوّل میں راقم کے دو اور کتابچے بھی شائع ہوئے، اور ان کے بھی اب تک متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں! جن کا سرسری سا تذکرہ درج ذیل ہے:

۳۔ دعوت اِلی اللہ

اس موضوع پر ایک تقریر راقم نے یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو باغ عام خاص، ملتان میں جامعہ محمدیہ کے سالانہ جلسے میں کی تھی جو بعد ازاں "دعوت اِلی اللہ کی ضرورت و اہمیت اور اس کے اصول و مبادی" کے عنوان سے اوّلاً 'میثاق' میں اور بعد

ازاں کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی۔

۴۔ قرآن اور امنِ عالم اسی طرح اس عنوان سے بھی ایک تقریر راقم الحروف نے ستمبر ۱۹۶۸ء میں 'مجلس طلبائے اسلام' کے پہلے تربیتی اجتماع کے موقع پر بنات الاسلام اکیڈمی، گلبرگ، لائلپور (حال فیصل آباد) میں کی تھی۔ اس کے بھی چار ایڈیشن اُردو میں، اور متعدد ایڈیشن انگریزی میں طبع ہو چکے ہیں۔

حرفِ آخر مولانا اصلاحی کی تفسیر اور تصانیف، اور خود اپنی کتاب اور کتابچوں کے علاوہ اس دورِ اوّل میں راقم نے ایک نہایت گرانقدر تالیف ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور کی بھی شائع کی یعنی: "اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدّعا اور طریق کار: ہمارے تحقیق اسلامی کے اداروں کے سامنے کرنے کا اصل کام"! اور چونکہ راقم کو یقین ہے کہ مستقبل کی اعلیٰ سطح اسلامی علمی تحریک کے شعبۂ تحقیق کے لیے یہ کتابچہ اساسی رہنمائی کا کام دے گا لہٰذا اس کے بارے میں مولانا اصلاحی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی آراء اور جو مفصّل اور گرانقدر تبصرہ "الیقین انٹرنیشنل" کراچی نے کیا اور جو اگست ۱۹۶۹ء کے 'میثاق' کے کور پر شائع ہوا، اُن دونوں کے عکس شاملِ اشاعت کیے جا رہے ہیں!

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

تاکہ حق کو حق ثابت کردے اور باطل کو باطل (سورۃ الانفال)

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدّعا اور طریق کار

"......محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے اس مقالے سے میرے دل کو سب سے زیادہ اطمینان حاصل ہوا ہے۔ میرے نزدیک اسلامی ریسرچ کا صحیح تصور یہی ہے جو اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے......"

مولانا امین احسن اصلاحی

"...... اس موضوع پر میری نظر سے اس سے زیادہ تشفی بخش تحریر اب تک نہیں گزری... اسلامی موضوعات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتابچہ ایک دستور العمل کا درجہ رکھتا ہے......"

ڈاکٹر سید عبداللہ، سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی تالیف

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار

پر معاصر ''یقین انٹرنیشنل'' کا تبصرہ:-

" Dr. Rafi-ud-Din is already known to us, not only as Director, All-Pakistan Educational Congress, Lahore, and formerly Director, Iqbal Academy Pakistan, Karachi, but also as one of those rare Muslim Educationists who have the courage and insight to expose the fallacies of Western thinkers on Education. His 'First Principles of Education' of which an Urdu translation is also available from All Pakistan Educational Conference, Karachi, is a work of extraordinary merit in as much as it presents a scientifically worked out ideal of Education—namely the ideal of Service to a Perfect Being. It is the only universal ideal that can insure growth and development to the highest degree of excellence. The small treatise now under review deals with the ideals and methods of Islamic Research. Here too Dr. Rafi-ud-Din strikes a new line, which is likely to be illuminating to Muslim scholars and institutions devoted to Research on Islam, but working along the lines laid down by non-Muslim Directors of Research Departments in Western Universities. Western Research sees holes where holes do not exist, re-opens controversies where controversies have long since been closed. It devotes itself to a sort of microscopic examination of words and phrases and has no affective apparatus for an overall view. Naturally it breeds unfaith and scepticism. In the last decade we had ample experience of such stuff being produced in Pakistan.

Dr. Rafi-ud-Din points out that the aim of Research on Islam ought to be to make it intelligible to the modern man and to expose the emptiness of the systems of thought that challange its validity and veracity. It is the bounden duty of Muslim scholars and if they fail therein God will raise some other people that His Will be done. True research should aim at catching the spirit of Islam and communicating it to others, rather than projecting questions and then answering them by hypothetical explanations."

"YAQEEN International", Karachi, July7, 1969.

:- شائع کردہ :-

دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کا قیام اور تحریکِ تعلّم و تعلیم قرآن کا دورِ ثانی

اس دعوت و تحریکِ قرآنی کا دورِ ثانی مارچ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے قیام سے شروع ہوتا ہے ــــــ جو تا حال جاری ہے! اس انجمن کے قیام کا جو "پس منظر" راقم نے ۱۹۷۲ء ہی میں تحریر کیا تھا حسبِ ذیل ہے:

"راقم الحروف نے مارچ ۶۷ء سے جون ۶۷ء تک ایک سلسلہ وار مضمون ماہنامہ 'میثاق' لاہور کے ادارتی صفحات میں لکھا تھا جس میں تحریکِ پاکستان کے فکری اور جذباتی پس منظر کا جائزہ بھی لیا گیا تھا اور متعین طور پر یہ بتایا گیا تھا کہ اس کے بنیادی عوامل میں مذہبی اور دینی داعیے کا حقیقی اور واقعی تناسب کس قدر تھا۔ اور یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں اربابِ اقتدار اور دین کی علمبردار جماعتوں کے مابین جو کشمکش جاری رہی اس کا میزانیہ نفع و نقصان کیا ہے۔

اس مسلسل مضمون کا اختتام اس تحریر پر ہوا جو بعد میں "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے نام سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی اور جس میں احیائے اسلام کے لیے صحیح اور مثبت لائحہ عمل کی نشاندہی کی گئی اور اس کے ذیل میں ایک قرآن اکیڈمی کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔

اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس لائحہ عمل کے پیش کرنے کے بعد بلا تاخیر اس پر عملی جدوجہد کے آغاز کی توفیق بھی بارگاہِ خداوندی سے حاصل ہو گئی۔ چنانچہ ایک طرف لاہور میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دوسری طرف دار الاشاعت الاسلامیہ کے تحت علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کی سعی کی گئی اور تیسری جانب سلسلۂ اشاعت

قرآن اکیڈمی' کے عنوان سے پے بہ پے کئی کتابچے اس مقصد سے شائع کیے گئے کہ اس کام کی اہمیت بھی لوگوں پر واضح ہو اور اس کا استدلالی پس منظر بھی نگاہوں کے سامنے رہے راقم کو اس کام کا آغاز بالکل تنہا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے کہ کسی بھی کام میں ساتھی اور رفیق اس کام کے ایک حد تک چل نکلنے کے بعد ہی ملا کرتے ہیں۔ تاہم اللہ تعالے کے فضل و کرم سے پانچ سال سے بھی کم مدت کی حقیر سی مساعی کا یہ ثمرہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اور ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — راہ رو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا!

اس کامیابی کا اصل سبب تو یقیناً فضلِ خداوندی اور توفیقِ ایزدی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن اس فضل و توفیق کا ایک مظہر یہ ہے کہ راقم نے اس کام کو نہ تو کسی تفریحی مشغلے کے طور پر کیا اور نہ محض جز وقتی طور پر، بلکہ زندگی کا ایسا مقصد سمجھ کر کیا جس پر نہ پیشہ ورانہ مصروفیت مقدم رہی نہ صحتِ جسمانی بلکہ ایک ایک کر کے ہر چیز داؤ پر لگ گئی۔ گویا ؎

خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اور یہ بہر حال قدرت کا اٹل قانون ہے کہ کسی کام کے چل نکلنے کے بعد تو اس کا امکان بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کے ساتھ جزوی طور پر وابستہ ہو سکے اور اپنی صلاحیتِ کار اور قوت و فرصت کا صرف ایک معین اور محدود حصہ صرف کر کے بھی کچھ نہ کچھ مفید خدمت انجام دے لے لیکن آغازِ کار کیلئے تو لازم ہے کہ انسان بالکل دیوانگی کی سی کیفیت کے ساتھ پوری متاعِ زیست کو داؤ پر لگا دے۔ ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے — شرطِ اول قدم این است کہ مجنوں باشی

بہر حال اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس تعالیٰ نے ایک بندۂ ناچیز اور عبدِ ضعیف کی حقیر سی مساعی کو اس درجہ مشکور فرمایا کہ ایک طرف درس و تدریس اور تعلیم و تعلّمِ قرآن کا سلسلہ لاہور اور بیرونِ لاہور روز افزوں ہے اور کچھ باہمت نوجوان اپنے اوقات کی متاعِ عزیز اور صلاحیتوں اور

قوتوں کا اثاثہ لے کر یعنی "بِاَنْفُسِهِمْ" نصرت کے لیے حاضر ہو گئے ہیں۔ اور دوسری طرف کچھ حضرات روپے پیسے سے یعنی "بِاَمْوَالِهِمْ" شرکت کے خواہاں ہیں چنانچہ انہوں نے راقم کے پیش نظر کاموں میں باضابطہ تعاون کے لیے کمر ہمّت کس لی ہے اور "قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت" اور "قرآن اکیڈمی" کے مجوزہ خاکے کو عملی شکل دینے کے لیے "مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور" کے نام سے ایک باقاعدہ ادارے کے قیام کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان حضرات کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبول عطا کرے اور ہم سب کو اپنے دین کی بالعموم اور اپنی کتابِ عزیز کی بالخصوص خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جہاں تک راقم کا تعلق ہے تو محض 'تحدیثاً للنّعمۃ' عرض ہے کہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"ہر تمنّا دل سے رخصت ہو گئی اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی"

راقم کا حال اب واقعتہً یہ ہے کہ زندگی میں کوئی تمنّا سوائے "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" اور "غلبۂ دینِ حق کے دَورِ ثانی" اور اس کے لیے لازمی طریق کے طور پر افشائے کلامِ ربّانی اور تشہیرِ علم و حکمتِ قرآنی کے باقی نہیں رہی۔

راقم نے اپنے بچپن میں نہایت ذوق و شوق سے حفیظؔ کا شاہنامہ پڑھا تھا۔ حضرت حفیظؔ بعد میں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کن کن وادیوں میں سرگرداں رہے۔ بہر حال شاہنامے کی تصنیف انہوں نے جس جذبے کے تحت کی تھی وہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے کہ:

؎ کیا فردوسیؔ مرحوم نے ایران کو زندہ خدا توفیق دے تو میں کروں اسلام کو زندہ

حقیقت یہ ہے کہ خود راقم کا واقعی 'حال' اب یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی تمنّا یا خواہش دل میں باقی نہیں رہی کہ 'احیائے اسلام' کے عظیم مقصد کے لیے کم از کم اتنا تو ہو کہ ع

خدا توفیق دے تو میں کروں قرآن کو زندہ!

راقم کے لیے یہ یقیناً بہت چھوٹا منہ اور بہت بڑی بات ہے لیکن اللہ کی قدرت سے تو بہر حال کوئی چیز بھی بعید نہیں۔ کیا عجب کہ وہ راقم کو اس خدمت کے لیے قبول ہی فرما لے

ع شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ!

خاکسار: اسرار احمد عفی عنہ، صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور"

اس پس منظر میں جب مارچ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا تو اس کی قرار داد تاسیس جن الفاظ میں مرتب ہوئی وہ بھی اس قابل ہیں کہ انہیں تاریخ کا حصہ بنا دیا جائے ـــــ لہٰذا اسے نہ صرف یہ کہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے بلکہ اس مقصد کے لیے انجمن کی اوّلین دستاویز ہی کا عکس شائع کیا جا رہا ہے ـــــ وھو ھٰذا:

"نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

چونکہ ہمیں اس امر کا شدید احساس ہے کہ

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

ـــــ کا خواب ـــــ

امتِ مسلمہ میں **تجدیدِ ایمان** کی عمومی تحریک

کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور

اس کے لیے لازم ہے کہ اوّلاً

منبعِ ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت

کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے

اور چونکہ

اس ضمن میں ہمیں ڈاکٹر اسرار احمدؒ صاحب کے خیالات سے کامل اتفاق ہے،

اور

ہم اس کام کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں جو وہ گذشتہ ساڑھے چار سال سے کر رہے ہیں

لہٰذا

ہم، چند خادمانِ کتابِ مبین،

"مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور"

کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں

جو ڈاکٹر صاحب موصوف کی رہنمائی میں مندرجہ ذیل مقاصد کیلئے کوشاں رہے گی:۔

۱ ــ * عربی زبان کی تعلیم و ترویج

۲ ــ * قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب و تشویق

۳ ــ * علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت

۴ ــ * ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں اور

۵ ــ * ایک ایسی "قرآن اکیڈمی" کا قیام جو قرآنِ حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے۔

اللہ تعالےٰ ہمیں ان مقاصد کیلئے بیش از بیش کوشش اور ایثار کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

ہم ہیں:۔ مؤسّسین مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور"

اُردو کی ایک عوامی کہاوت ہے "ایک[1] اکیلا دو[2] گیارہ" —— یہ ایک شخص کے ساتھ ایک دوسرے فرد کے اضافے کے بارے میں تو ہوسکتا ہے کہ کسی قدر مبالغے پر مبنی ہو لیکن ایک فرد کے ساتھ ایک 'انجمن' کے اضافے کی برکات کی تعبیر کے لیے تو صد فی صد درست ہے' لہٰذا قیام انجمن کے معاً بعد اس دعوت و تحریکِ قرآنی کی رفتار کم از کم دہ چند ہو گئی۔

ایک ذاتی محرومی

۱۹۷۲ء میں 'مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور' کے قیام سے جہاں اس دعوتِ رجوع الی القرآن اور تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن کی رفتار میں ایک دم تیزی آئی اور اس کی توسیع اور اثر و نفوذ کی نئی نئی جہتیں وجود میں آئیں، —— وہاں راقم کو ایک ذاتی نقصان بھی ہوا۔ یعنی انجمن کے قیام کے ساتھ ہی راقم مولانا امین احسن اصلاحی کی 'اس سرپرستی' سے محروم ہو گیا۔ جس کا ذکر اس تحریر کے بالکل آغاز میں کیا گیا ہے اور جو بلاشک و شبہ اس دعوت و تحریک کے ضمن میں راقم کے ابتدائی سرمائے کا اہم حصّہ تھا۔

اس کی مفصل داستان تو راقم ۱۹۷۶ء میں سپردِ قلم کر چکا ہے' اب اُسے دُہرانے کی کوئی ضرورت نہیں، سوائے ایک اہم نکتہ کی وضاحت کے جس پر اس تحریر کا اختتام کیا جا رہا ہے۔

وہ معاملہ ہے انجمن کے دستور میں راقم کی حیثیّت اور بالخصوص اس کی مجلس منتظمہ کے فیصلوں کے ضمن میں حقِّ استرداد (ویٹو) کا۔ اس معاملہ میں مولانا جدید جمہوری تقاضوں کے شدّت کے ساتھ قائل ہیں، راقم بھی اگرچہ حکومتی اور ریاستی سطح پر اسی کا قائل ہے لیکن جماعتی اور تحریکی سطح پر اسے نہ لازم سمجھتا ہے نہ قابلِ عمل۔ اس ضمن میں راقم نے اپنی رائے کو، بحمد اللہ، پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں انجمن کی تاسیس کے مرحلے ہی پر بیان کر دیا تھا۔ چنانچہ درج ذیل تحریر انجمن کے

---

[1] یہ مضمون اسی کتاب کے باب چہارم بعنوان "مرکزی انجمن خدّام القرآن کا مؤسّس اور اس کے فکر کے عناصر اربعہ" میں صہ۱۴۳ تا ۱۴۷ شامل ہے۔

مجوّزہ دستور کے ساتھ ہی جولائی ۶۷ء کے 'میثاق' میں بھی شائع ہو گئی تھی، اور بعد میں دستورِ انجمن کے ساتھ بھی شائع ہوتی رہی:

"دوسرا اعتراض جو اس جمہوریت نواز بلکہ جمہوریت پرست دَور میں انجمن کے مجوّزہ خاکے کے بارے میں پیدا ہونا لازمی ہے یہ ہے کہ اس میں صدرِ مؤسّس کی حیثیت تحکّمانہ ہی نہیں آمرانہ ہے۔ اس ضمن میں ہم اس اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے نزدیک کسی دینی خدمت خصوصاً احیائی کوشش کے لیے جو بھی انجمن یا ادارہ وجود میں آتے یا جماعت یا تنظیم قائم ہو اس کا نظم اسی نوعیت کا ہونا چاہیے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اس طرح کی کسی بھی کوشش کا آغاز بالعموم اسی طرح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرد کے دل میں اس کام کے لیے ایک شدید داعیہ بھی پیدا فرما دیتا ہے اور اس سلسلے میں موجود الوقت ظروف واحوال کی مناسبت سے اسے کسی خاص طریق کار اور منہجِ عمل کے لیے انشراحِ صدر بھی عطا فرما دیتا ہے، تب یہ فرد اس کام کو لے کر اٹھتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف بلاتا ہے اور صلائے عام دیتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ؟"[1] چنانچہ جن لوگوں کو اس کے خیالات سے اتفاق اور خود اس پر شخصی اعتبار سے فی الجملہ اعتماد ہوتا ہے وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اسے آپ سے آپ ان لوگوں کی رہنمائی کا منصب حاصل ہو جاتا ہے۔

اب صاف اور سیدھی سی صورت یہی ہے کہ اس حقیقت کو خود بھی قبول کیا جائے اور اسی کا اعلانِ عام بھی ہو تا کہ جو بھی آئے اس صورت کو ذہناً قبول کر کے آئے اور بصورتِ دیگر اپنے لیے کوئی اور راہ تجویز کرے۔ یہی وجہ ہے کہ امّتِ مسلمہ کی تاریخ کے دَوران میں جو احیائی کوششیں ہوئیں ان سب کا کم از کم 'تحریکِ شہیدین' کے زمانے تک تو نظم یہی رہا ہے کہ ایک شخص بحیثیتِ داعی اٹھتا ہے اور جو لوگ اس کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ آپ سے آپ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ نہ کوئی شرائطِ رکنیت ہوتی ہیں نہ فارم داخلہ نہ کہیں

---

[1] سورۃ الصف آیت: ۱۴ "کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں"

"پانچ سالہ" انتخاب کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے نہ ہی 'امیر' اور 'شوریٰ' کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لیے پیچ در پیچ فارمولے ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی استعفا یا 'اخراج' کے لیے کوئی ضابطہ بنایا جاتا ہے۔ بلکہ ایک شخص اپنے ذاتی احساس فرض کے تحت کام کا آغاز کر دیتا ہے۔ پھر جس جس کو اس کے خیالات سے اتفاق اور اس کی ذات پر اعتماد ہوتا ہے اس کا ساتھ دیتا رہتا ہے اور جونہی یہ دونوں ——— یا ان میں سے کوئی ایک بات موجود نہیں رہتی اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے اور خواہ مخواہ "هَلْ لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ"[1] کے قسم کے قضیے کھڑے کرنے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ وہ داعی اگر واقعی مخلص ہے اور خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے اور "وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا"[2] کا مصداق بننے کا شوقین نہیں تو اس کے لیے لازم ہے کہ جماعت میں شورائیت کا ماحول قائم رکھے، تاکہ اطمینان و اعتماد کی فضا برقرار رہے۔

ہم اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمارا ذہن بالکل یکسو ہے۔ ہم نے مجوّزہ انجمن کے لیے قواعد و ضوابط کا یہ تھوڑا سا کھکھیڑ بھی صرف اس لیے مول لیا ہے کہ ایک تو یہ جماعت نہیں انجمن ہے اور دوسرے اس کی لامحالہ کچھ جائیداد بھی ہوگی جس کی تولیت کا معاملہ خالص قانونی ہے، ورنہ اگر خدا نے چاہا اور کسی ہمہ گیر دعوت کے آغاز کی توفیق بارگاہِ رب العزّت سے ارزانی ہو گئی تو اس کا معاملہ ان شاء اللہ خالصتاً اس نہج پر ہوگا جس کا ذکر اُوپر ہو چکا۔

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور نے تعلیم و تعلّم قرآن کے جس کام کا عَلَم اٹھایا ہے اس کی ابتداء بھی اسی فطری نہج پر ہوئی تھی کہ ایک شخص کے دل میں اس کا داعیہ پیدا ہوا اور اسے کامل

---

[1] سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۵۴ "اختیارات میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟"

[2] سورۂ نحل آیت نمبر ۹۲ "اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے مضبوطی کے ساتھ کاتتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا!"

انشراح ہوگیا کہ فی الوقت "کرنے کا اصل کام" یہی ہے (کہ جا ایں جا است!) چنانچہ اس نے تن تنہا سفر کا آغاز کر دیا۔ تا آنکہ اب صورت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کی نصرت پر کمر ہمت کس لی ہے۔ اس فطری صورتِ حال کو صرف موجود الوقت رجحانات کے دباؤ کے تحت 'جمہوری' رنگ دینا نہ صرف یہ کہ ایک خواہ مخواہ کا تکلّف اور تصنّع ہے بلکہ خدشہ یہ ہے کہ اس طرح تمام وقت قواعد وضوابط کی خانہ پُری اور حدود و اختیارات کی رسّہ کشی کے نذر ہو کے رہ جائے گا اور کام کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ بنابریں ہم نے وہی راستہ اختیار کیا ہے جو مطابقِ واقعہ بھی ہے اور کام کی مقدار اور رفتار کے اعتبار سے موزوں تر بھی! اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص واخلاص کی دولت عطا فرمائے اور ہمیں اپنے دین کی بالعموم اور اپنی کتابِ عزیز کی بالخصوص خدمت کی توفیق عطا فرمائے آمین ——— خاکسار اسرار احمد"

الحمد للہ کہ ہمیں اپنی اس رائے کی صحت پر جس قدر اعتماد اس وقت تھا اس سے کم از کم دہ چند انشراح اب حاصل ہے۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک:

(ا) یہی طریقہ معقول اور منطقی بھی ہے' اور سادہ اور فطری بھی'

(ب) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسنون و ماثور بھی ہے۔۔۔ (بلکہ 'منصوص' بھی!)

راقم اس امر پر اللہ کا جتنا شکر ادا کرے کم ہے کہ اس تعؐ نے نہ صرف یہ کہ اپنے اس بندۂ حقیر کو توفیق عطا فرمائی کہ وہ اپنے اس تصوّر کے مطابق اوّلاً انجمن اور بعد ازاں تنظیم اسلامی کو بالفعل قائم کرنے میں' خواہ ادنیٰ درجہ ہی میں سہی' کامیاب رہا' بلکہ اس رائے کی صحت و برکت کا یہ عملی مظہر بھی دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ بحمد اللہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی سترہ سالہ تاریخ کے دوران کوئی اکھیڑ پچھاڑ اور دنگا فساد تو درکنار' سوائے چند منٹوں پر مشتمل دو مواقع کے کبھی باہمی گفتگو میں تلخی کا انداز بھی پیدا نہیں ہوا اور تمام امور ہمیشہ نہایت خوش اسلوبی اور اتفاقِ رائے سے طے ہوتے رہے' اور ویٹو کے استعمال کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی —— (اسی طرح تنظیمِ اسلامی میں چودہ سال کے دوران اکّا دُکّا رفقاء نے تو علیحدگی اختیار کی' بحمد اللہ کبھی کسی دھماکے کی نوبت نہیں آئی۔) "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ" "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔" اٰمین یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ!!

دورِ ثانی کے اہم نشاناتِ راہ

گزشتہ سترہ سال کے دوران انجمن خدام القرآن نے جو کام کیا ہے اس کی مفصل رُوداد کے لیے تو ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ (دسمبر ۱۹۸۳ء میں انجمن نے اپنی دس سالہ رپورٹ شائع کی تھی تو کُل کتاب تو ۹۶ صفحات پر مشتمل تھی لیکن خالص رپورٹ بھی ۵۶ صفحات پر محیط تھی)۔ مزید برآں جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان سترہ سالوں میں سے پہلے تین سال کی مساعی کا اہم ترین نتیجہ تنظیم اسلامی کے قیام (یا بالفاظ دیگر 'احیاء') کی صورت میں ظاہر ہوا۔

دعوتِ قرآنی کی اندرونِ ملک توسیع

درسِ قرآن کے سلسلے میں لاہور سے باہر سفروں کا سلسلہ ویسے تو بالکل آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ملتان کے اکتوبر ۶۷ء کے سفر اور لائل پور کے ستمبر ۶۸ء کے سفر کا ذکر تو اوپر کتابچوں کے حوالے سے آچکا ہے۔ اسی طرح جنوری ۶۸ء میں شہر قصور، اور پھر فروری ۶۸ء میں صادق آباد، سکھر اور جھنگ میں "قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر تقاریر کا ذکر اسی موضوع والے کتابچے کے پیشِ لفظ میں موجود ہے۔ وقِس علیٰ ذٰلک !

فروری ۷۱ء میں مطب بند کرنے کے بعد ان اسفار کی تعداد میں بھی ایک دم بہت شدت آگئی۔ اور ان کا دائرہ بھی بہت وسیع ہو گیا اور انجمن کے قیام کے بعد تو چونکہ بحمد اللہ مالی وسائل کی کمی بھی نہ رہی لہٰذا ان میں مزید اضافہ بھی ہوا، اور اس کے ساتھ ساتھ میری مشقت میں کمی آگئی ——— تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۷۱ء میں مارچ سے دسمبر تک راقم نے ہر ماہ کراچی کا سفر کیا۔ جو ریل گاڑی کی اُس وقت کی تھرڈ کلاس میں ہوتا تھا (بالعموم عوامی ایکسپریس میں)، اور مجھے آج تک یاد ہے کہ آتے یا جاتے جب سکھر، صادق آباد اور رحیم یار خاں ٹھہرنا ہوتا تھا تو اس خیال سے کہ لاہور سے غیر حاضری کم از کم ایّام کی ہو یہ درمیانی سفر عین دوپہر کے وقت کرنے پڑتے تھے، اور مئی، جون،

جولائی کی شدید گرمی میں، تھرڈ کلاس کا یہ سفر نیم مردہ کر ڈالتا تھا ـــــــ انجمن کے قیام سے قبل بھی چند ماہ کے بعد کراچی کے بعض احباب (مثلاً شیخ جمیل الرحمٰن صاحب، شیخ سلطان احمد صاحب وغیرہ) کے ایثار کی بنا پر لاہور کراچی کا ایک طرف کا سفر پی آئی اے کی نائٹ کوچ سے ہونا شروع ہو گیا تھا اور انجمن کے قیام کے بعد تو ظاہر ہے کہ بحمد اللہ اس معاملے میں کوئی تنگی رہی ہی نہیں!

کراچی کا ماہانہ سفر کراچی، سکھر، صادق آباد اور رحیم یار خاں کے ماہانہ سفر کی ایک جھلک اُس اعلان کے عکس میں دیکھی جا سکتی ہے جو 'میثاق' بابت اپریل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا ـــــــ وَھُوَ ھٰذا:

ڈاکٹر اسرار احمد کے ماہانہ سفر کراچی

کا پروگرام اس طرح طے ہوا ہے کہ

ہر انگریزی ماہ کا پہلا اتوار

اور اس سے متصلاً قبل ہفتہ اور جمعہ

انشاءاللہ کراچی میں صرف ہونگے

خطبۂ جمعہ جامع مسجد کلفٹن روڈ میں ہوتا ہے ـــــــ اور جمعہ او ہفتہ کی شام اور اتوار کی صبح کو مختلف مساجد یا کسی پبلک ہال میں درس قرآن ہوتا ہے

اس کے علاوہ ـــــــ کراچی جاتے یا آتے

سکھر، صادق آباد اور رحیم یار خاں میں

خطابات عام یا مجالس درس کا پروگرام رہتا ہے۔

اور ان دوروں میں درس و تدریس اور خطاب عام کے پروگرام کی شدت اور 'گھمبیرتا' کا کسی قدر اندازہ 'حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کراچی' کی جنوری ۱۹۷۲ء تا جون ۱۹۷۲ء کی اس 'ششماہی رپورٹ' سے کیا جا سکتا ہے جو شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے مرتب کی تھی اور 'میثاق' کے جولائی ۱۹۷۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی (یہ رپورٹ کتاب کے آخری حصے میں بطور ضمیمہ شامل ہے)

لاہور میں دعوت کی توسیع

اور اس کے ساتھ خود لاہور میں حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کو جو وسعت حاصل ہو گئی تھی۔ اور میرے نوجوان ساتھیوں نے جس طرح اس تحریک میں عملاً حصہ لینا شروع کر دیا تھا اس کا اندازہ بھی اسی پرچے میں شائع شدہ حسبِ ذیل تفصیل سے ہو سکتا ہے :

۱۔ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن لاہور کا مرکزی اجتماع ہر اتوار کی صبح کو آج کل ساڑھے آٹھ بجے جامع مسجد خضراء سمن آباد میں منعقد ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر اسرار احمد قرآن کا سلسلہ وار درس دیتے ہیں۔ (آج کل سورۂ انعام زیرِ درس ہے۔)

نوٹ

۱۔ اس اجتماع میں خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔

۲۔ ہر انگریزی ماہ کے پہلے اتوار کو ڈاکٹر صاحب کے سفر کراچی کے باعث اس اجتماع میں محترم خالد مسعود صاحب درس دیتے ہیں۔

۲۔ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن لاہور کے اجتماعات میں دوسرے نمبر پر وہ دو اجتماع ہیں جن میں آج کل مطالعۂ قرآن کے منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس جاری ہے : یعنی

۱۔ ہر جمعرات کو بعد نماز مغرب جامع مسجد ہرن روڈ، کرشن نگر میں ــــــــ اور

۲۔ ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب مسجد اقبال کالونی، گڑھی شاہو میں۔

ان دونوں مقامات پر درس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی دیتے ہیں۔ ان اجتماعات کا اصل مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں رفقاء مطالعۂ قرآن کے اس منتخب نصاب کو اس طرح ذہن نشین کر لیں کہ پھر خود بھی بیان کر سکیں تاکہ قرآن حکیم کی جانب توجہ و التفات کی ایک عام رَو چل نکلے۔

۳۔ لاہور میں مطالعۂ قرآن حکیم کے اس نظام میں تیسرے نمبر پر چھ حلقے ہیں جن کے اپنے اجتماعات ہفتہ وار ہوتے ہیں اور جن میں وہ رفقاء درس کی ذمہ داری نباہ رہے ہیں جنہوں نے منتخب نصاب کے بیان کرنے پر کمرِ ہمت کس لی ہے۔ ان تمام حلقوں میں ہر مہینے میں ایک بار ڈاکٹر اسرار احمد بھی شریک ہوتے ہیں اور درسِ قرآنِ مجید دیتے

ہیں۔ان حلقوں کے پروگرام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ حلقہ سانده (تاج مسجد، ملک کالونی، قلعہ حکیماں، سانده)

۲۔ حلقہ ڈھولنوال (مسجد ذیلداراں ڈھولنوال۔ ملتان روڈ)

۳۔ حلقہ سنت نگر (غنی مسجد بابو محلہ، سنت نگر)

۴۔ حلقہ انجنیئرنگ یونیورسٹی (کمرہ مسجد زیریہال۔ انجنیئرنگ یونیورسٹی)

۵۔ حلقہ میڈیکل کالج (مسجد میڈیکل کالج ہاسٹل، میکلوڈ روڈ)

۶۔ حلقہ نیو یونیورسٹی کیمپس (مسجد ای بلاک، سٹاف کالونی)

۴۔ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن لاہور کے تنظیمی سلسلے میں چوتھے نمبر پر سمن آباد اور اس کی نواحی آبادیوں میں قائم شدہ آٹھ ذیلی حلقے ہیں جن کا مقصد اصل میں یہ ہے کہ گزشتہ چار ساڑھے چار سالوں کے دوران میں سمن آباد اور اس کی نواحی بستیوں کے جو لوگ تعلیم و تعلّمِ قرآن کے اس کام سے متعارف ہوتے ہیں انہیں تدریجاً ایک فطری تنظیم میں منسلک کیا جاتے۔ان حلقوں میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شرکت طے نہیں ہے بلکہ ان میں مطالعۂ قرآن کی جملہ ذمہ داریاں دوسرے رفقاء ہی نباہ رہے ہیں ——— ان کے ہفتہ وار اجتماعات کے پروگرام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

نمبر شمار	نام حلقہ	مقامِ اجتماع
۱۔	رسول پارک اور نیا مزنگ،	بر مکان محمد رشید صاحب ۴۶۔ رسول پارک۔
۲۔	اسلامیہ پارک، چوبرجی کوارٹرز،	بر مکان چوہدری نذیر احمد ۲۳۔ پونچھ روڈ۔
۳۔	سمن آباد مین اور ۱۲ ایکڑ سکیم،	بر مکان چوہدری نصیر احمد صاحب ۶۔ ایل، سمن آباد۔
۴۔	سمن آباد ایکسٹینشن	مسجد خضرا۔
۵۔	نیو سمن آباد اور چاہ جموں والا،	بر مکان سید اسحاق علی ۱۳۶۔ این، سمن آباد
۶۔	چودھری کالونی، پکی ٹھٹھی اور نیشنل بنک کالونی	بر مکان چودھری دین محمد ۶۳۶۔ این (نزد امامیہ مسجد)
۷۔	مسلم کالونی اور سٹیٹ بنک کالونی،	بر مکان ترین صاحب ۳۶۔ ایس ۱۲، بسطامی روڈ۔

۸۔ غلام نبی کالونی، جسٹس شریف سکیم، بر مکان چودھری سردار محمد، سردار بلڈنگ۔

نوجوان میدانِ عمل میں

اسی طرح نئے نوجوان ساتھیوں کے اس تعلیم و تعلّمِ قرآن کے مبارک کام میں عملاً شریک ہونے اور گویا 'تنظیم اسلامی' کی داغ بیل پڑنے پر راقم کے جو تأثرات تھے اُن کا اندازہ 'میثاق' دسمبر ۷۶ء کے تذکرہ و تبصرہ (جس کے بعض اقتباسات پہلے بھی سامنے آچکے ہیں) کا حسبِ ذیل اقتباس مفید ہوگا:

"ویسے اب راقم بحمد اللہ حضرتِ اکبر کے اس شعر کہ ؎

دیوانہ چمن کی سیر پہ نہیں ہیں تنہا — عالم ہے ان گُلوں میں پھولوں میں بستیاں ہیں

اور فیض کے اس شعر کہ ؎

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن — یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منوّر جاتی ہے

اور اقبال کے اس شعر کہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

کے مصداق بالکل یکہ و تنہا نہیں ہے۔ بلکہ اسے اللہ نے ہمراہیوں اور ہم سفروں کی ایک معتد بہ تعداد اور اعوان و انصار کی اچھی بھلی جمعیّت عطا فرما دی ہے اور اس کی دس سالہ مساعی کو رب العالمین نے اس درجہ بار آور کیا ہے اور ایسا شرفِ قبول عطا فرمایا ہے کہ راقم خود حیران ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ راقم پر علامہ اقبال کے ان اشعار کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں — ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اور ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے — ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

چنانچہ لاہور، کراچی اور سکھر تو راقم کی دعوتِ قرآنی اور درسِ قرآن کے بڑے مراکز رہے ہی ہیں، گزشتہ دس سالوں کے دوران راقم اس پیغام کو لے کر ایک جانب گوجرانوالہ، شیخوپورہ،

وزیر آباد، گجرات، جہلم، سرگودھا، جوہر آباد، راولپنڈی، اسلام آباد، واہ، ٹیکسلا اور تربیلا تک گیا ہے اور دوسری جانب ساہیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یار خاں، صادق آباد، حیدر آباد اور کوئٹہ تک ——— اور نہ صرف یہ کہ تین عظیم الشان سالانہ قرآن کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں بلکہ لاہور اور کراچی میں دو دو بار، اور کوئٹہ اور راولپنڈی میں ایک ایک بار قرآنی تربیت گاہیں قائم کی جا چکی ہیں ——— اور ان پر مستزاد ہیں سلسلۂ مطبوعات کے ذریعے دعوتِ قرآنی کی توسیع اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کی توجہات کو قرآن حکیم کی جانب منعطف کرنے کی کوششیں۔ مثلاً لاہور کے عوامی میلوں، رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماعات اور یومِ اقبال کی تقریبات میں اخباری اشتہاروں، پوسٹروں اور ہینڈ بلوں کے علاوہ دس دس ہزار کی تعداد میں 'دعوت الی اللہ' اور 'راہ نجات' ایسے کتابچوں کی تقسیم، اور آخری مگر کمترین نہیں، قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز جس پر ان سطور کی تحریر کے وقت تک کم و بیش پانچ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے ———! اور ان سب کا حاصل یہ کہ 'درسِ قرآن' کا چرچا تو بحمد اللہ دُور دُور تک ہے ہی کم از کم پاکستان کے طول و عرض میں راقم کا نام 'دعوتِ رجوع الی القرآن' کی علامت بن گیا ہے! ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

تنظیمِ اسلامی کا قیام

اسی عبارت میں آگے 'تنظیمِ اسلامی' کے قیام کا ذکر ہے اس لیے کہ یہی نوجوان جنہوں نے تعلیم و تعلّمِ قرآن کے اس مبارک کام کے لیے پیش قدمی کی تنظیمِ اسلامی کا ابتدائی سرمایہ بنے ——— چنانچہ راقم نے اُس وقت تحریر کیا تھا کہ:

"مزید برآں ——— اور نَافِلَةً لَّكَ کے درجے میں یہ کہ 'تنظیم اسلامی' کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ فرمانِ نبوی " اِنِّیْ اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ " میں بیان شدہ مقاصد کے پیشِ نظر سفر کا آغاز کر چکا ہے اور اس راہ کے پہلے اقدام یعنی تجدیدِ ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد

کی دعوت زبانوں پر آنے اور کانوں سے ٹکرانے لگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قافلہ بھی بہت ہی چھوٹا ہے اور اس کا قائد بھی حد درجہ حقیر پر تقصیر۔ لیکن یہ اطمینان پوری طرح حاصل ہے کہ کرنے کا کام ہے یہی! ؎

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی　　اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی!

راقم کو جو ساتھی ملے ہیں وہ راقم کے لیے اللہ کا عطیہ ہیں۔ اور راقم تو قائل ہی اس کا ہے کہ ع "ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!" کبھی ان میں سے کسی کی سُست رفتاری یا سہل انگاری سامنے آتی ہے تو راقم اپنے آپ سے کہتا ہے ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ　　کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!

اور اس عاجز پر اللہ کا یہ بڑا فضل ہے کہ جب کسی ساتھی سے کسی کمزوری کا ظہور ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ لامحالہ اس کی اپنی ہی کسی کمزوری کا مظہر ہے۔!"

'تنظیمِ اسلامی' کے قیام کے ضمن میں اپنے ذاتی فیصلے کا اعلان تو راقم الحروف نے اس اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر اپنے الوداعی خطاب میں کر دیا تھا جو جولائی ۱۹۷۴ء میں انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ (راقم کا یہ خطاب اب "عزمِ تنظیم" کے نام سے کتابی صورت میں مطبوعہ موجود ہے۔) تاہم اس کے بعد راقم بالفعل اقدام سے قبل مزید استخارہ کے لیے مع اہلیہ حج کے لیے گیا۔ الحمد للہ کہ اس سفرِ حج میں برادرم قمر سعید قریشی اور محترم ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ کی رفاقت بھی راقم کو حاصل رہی۔ بہر حال وہاں ارادہ بفضلہ تعالےٰ مزید مستحکم ہو گیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۷۵ء میں ایک قافلہ آمادۂ سفر ہو گیا جس میں، جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، تقریباً سب کے سب لوگ وہی تھے جو میری 'دعوت رجوع الی القرآن' اور 'تعلیم و تعلّمِ قرآن' سے منسلک تھے۔ (یہی وجہ ہے کہ تنظیم کا تاسیسی اجتماع انجمن کی تیسری سالانہ قرآن کانفرنس سے ملحق رکھا گیا تھا۔)

اس طرح 'تنظیمِ اسلامی' اگرچہ میرے سابقہ تعلق' اور میری ذہنی و فکری نشوونما کے اعتبار سے تو یقیناً اوّلاً مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی 'حزب اللہ'، ثانیاً سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کی 'جماعتِ اسلامی' اور پھر اُس اسلامی تنظیم کے تسلسل کی حیثیت رکھتی ہے جو ۱۹۶۷ء میں جماعت سے علیحدہ ہونے

والے حضرات نے قائم کرنے کی کوشش کی تھی تاہم اس کی موجودہ ہیئتِ تنظیمی کی حیثیت فی الواقع اس 'دعوتِ رجوع الی القرآن' کے شجرِ مبارکہ کے برگ وبار کی ہے جس کا آغاز راقم الحروف نے اواخرِ ۶۵ء میں کیا تھا!

انجمن اور تنظیم

فطری طور پر بہت سے لوگوں کو میری قائم کردہ ان دو تنظیمی ہیئتوں کے بارے میں الجھن اور خلجان رہتا ہے، اور وہ ان دونوں کے دائرہ ہائے کار اور تنظیمی لائحہ عمل کے فرق وتفاوت، اور ان کے مقاصد واہداف کے مابین توافق اور ہم آہنگی کے فہم وادراک میں دقّت محسوس کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ الجھن بعض اوقات انجمن اور تنظیم دونوں سے طویل اور گہری وابستگی رکھنے والے رفقاء واحباب کو بھی پیش آجاتی ہے ——— لہٰذا مناسب ہے کہ اس ضمن میں جو وضاحتیں راقم نے 'میثاق' بابت جولائی اگست ۷۵ء کے 'تذکرہ وتبصرہ' میں پیش کی تھیں ان کے اہم حصّے اس تحریر میں شامل کر دیئے جائیں، جو درجِ ذیل ہیں:

"ہمارے بعض رفقاء واحباب اور بعض بزرگوں اور بہی خواہوں کو یہ مغالطہ لاحق ہوگیا ہے کہ شاید تنظیم اسلامی کے قیام سے ہم نے اپنے سابقہ طریقِ کار میں کوئی ترمیم کرلی ہے یا 'انجمن خدّام القرآن' اور 'تنظیم اسلامی' کے مقاصد میں کوئی اساسی فرق ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک مقصد اور نصب العین کا تعلق ہے ان دونوں میں سرِمُو بھی کوئی فرق موجود نہیں ہے، اور جو تھوڑا بہت فرق نظر آتا ہے وہ صرف ہیئتِ تنظیمی سے متعلق ہے یعنی جبکہ انجمن خدّام القرآن کی حیثیت ایک 'ادارے' کی ہے جس کی طرف واضح اشارہ لفظِ "انجمن" میں موجود ہے وہاں 'تنظیم اسلامی' کی حیثیت ایک 'جماعت' کی ہے جو لفظِ تنظیم سے ظاہر ہے!

مزید برآں راقم الحروف، بحمد اللہ، ہر مرحلے پر اپنے ذہن کو بالکل کھول کر سامنے رکھتا رہا ہے اور اس پورے معاملے میں کسی بھی موقع پر کسی بھی درجے میں کسی اخفاء یا کتمان کا شائبہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

...... چنانچہ "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" میں طویل نظری مباحث کے بعد "عملی اقدامات" کے ذیل میں جو دو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان میں سے پہلی یہ تھی

"کہ عمومی دعوت وتبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدیدِ ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجّہ ہوں ان کی ذہنی وفکری اور اخلاقی وعملی تربیت

کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت اُن لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوانوں کو تلاش کرے جو پیشِ نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔"

دوسری تجویز یہ تھی کہ:

"ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشرواشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علومِ جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہِ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔"

اسی طرح "تنظیمِ اسلامی" کی تاسیسی قرارداد میں دوسرے امور کے علاوہ یہ صراحت بھی موجود ہے کہ:

"عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری اُمّتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے، اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کُن افکار و نظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لیے کتاب و سنت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔"

اور اس کی "توضیح" میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ:

"اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر و مدلّل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ و الحاد اور مادہ پرستی کے سیلاب کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کر دے اور انسانی زندگی کے لیے دین کی

رہنمائی وہدایت کو بھی مدلّل ومفصّل واضح کر دے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین وشریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک مؤثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے! اس لیے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار ونظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلّق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ضلالت وگمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کیے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشر واشاعت کا کام بھی کرے اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا بھی مناسب اور مؤثر بندوبست کرے جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی اعتقادات کی حقّانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔"

گویا پوری مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور اپنے جملہ اغراض ومقاصد اور قرآن اکیڈمی کے منصوبے سمیت تنظیم اسلامی کے متذکرہ بالا مجوّزہ ادارے کی حیثیّت رکھتی ہے۔ دوسری طرف تنظیمِ اسلامی کی حیثیّت "عمومی دعوت وتبلیغ" کے اس "ادارے" کی ہے جس کا ذکر "قرآن اکیڈمی" کے منصوبے کے ضمن میں شرطِ لازم (PREREQUISITE) کے طور پر کیا گیا تھا۔ بالفاظِ دیگر 'انجمن خدّام القرآن' اور 'تنظیمِ اسلامی' باہم لازم وملزوم ہیں یا یک جان ودو قالب! اور ان کے مابین ہرگز نہ کوئی تضاد ہے نہ تباین!"

بہرحال ۱۹۷۲ء کے بعد تو جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے راقم کی توانائیاں انجمن

کے قیام کی بنا پر ایک دم دس گنا ہو گئی تھیں، تنظیم کے قیام کے بعد قوتِ کار میں مزید اضافہ ہوا اور اس دعوت و تحریک کو گویا دو بازو مل گئے۔ چنانچہ گزشتہ چودہ سالوں کے دوران بحمد اللہ رفتارِ کار دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔

تحریک تعلّم و تعلیم قرآن کے اس دورِ ثانی کے لگ بھگ اٹھارہ سالوں کی مفصّل رُوداد تو نہ ممکن ہے نہ مطلوب۔ تاہم "مَالَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ" کے مصداق قارئین کے لیے "**دعوتِ رجوع الی القرآن**" کے رُوح پرور "**منظر**" کی ادنیٰ درجہ میں نقشہ کشی کے لیے چند منتخب نکات کا نہایت اجمالی تذکرہ شاملِ کتاب کیا جارہا ہے۔

آخر میں صرف اُس 'تبدیلی' کا ذکر مطلوب ہے، جس کی جانب آغاز میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ گزشتہ دو سالوں کے دوران تدریجاً اس تحریک کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے ——— یہ تیسرا دور عبارت ہے اس دعوت و تحریک کی علمبرداری اور ذمّہ داری کے اگلی نسل کو منتقل ہونے سے ——— راقم نے جیسے آغاز میں عرض کیا تھا، اس کے واقعی احساسات کی ترجمانی یا تو اس مصرعے سے ہوتی ہے کہ ؎ "شکر صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسید!" ——— یا اس سے کہ ؎ "ہم تو فارغ ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا!"

راقم کے لیے یہ احساس فی الواقع بہت اطمینان بخش ہے کہ 'دعوتِ رجوع اِلی القرآن' کے ضمن میں اُس نے اللہ تعالےٰ کی توفیق و تیسیر اور تائید و نصرت سے اپنے حِصّے کا کام مکمل کر لیا ہے، اور اب اس دعوت و تحریک کے ضمن میں راقم کی آرزوئیں صرف دُو ہیں ——— ان میں سے بھی صرف ایک اُس کی 'ذاتی' ہے ——— اور دوسری خالص 'فرمائشی' ——— ذاتی خواہش تو یہ ہے کہ فلسفہ و حکمتِ قرآنی کے بعض اہم لیکن غامض پہلو جن پر اللہ تعالےٰ نے اپنی عنایتِ خصوصی سے راقم کو انشراح عطا فرمایا ہے ضبطِ تحریر میں آجائیں، اور دوسری یہ کہ ایک بار سورۃ الفاتحہ سے آغاز کر کے پورے قرآن مجید کا درس تسلسل کے ساتھ ریکارڈ کرا دیا جائے چنانچہ قرآن آڈیٹوریم کی تعمیر اصلاً اسی مقصد سے ہو رہی ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور! ہمارا مقام تو بقول اکبر الٰہ آبادی یہ ہے کہ ؎ رضائے حق پہ راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا؟
خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم! تو کیسا؟

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کی اٹھارہ (۱۸) سالہ کارگزاری کا

اجمالی جائزہ

اعداد و شمار کی روشنی میں

مرتّبہ

ڈاکٹر عارف رشید
ناظمِ عمومی، قرآن اکیڈمی

- ابتدائیہ
- سالانہ اجلاس اور انتخابات
- کُل زرِ تعاون
- سالانہ قرآن کانفرنسیں اور قرآنی محاضرات
- سیرت کانفرنس
- انجمن کی دس سالہ تقاریب
- قرآنی تربیت گاہیں
- قرآن اکیڈمی
- قرآن کالج اور آڈیٹوریم
- جامع مسجد جامع القرآن
- مکتبۂ انجمن اور سمعی و بصری کیسٹ
- قرآن اکیڈمی کی متفرق سرگرمیاں
- عام دعوتی سرگرمیاں

ابتدائیہ

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے قیام سے دسمبر ۱۹۸۹ء تک یعنی کل ۱۸ برس کی مختصر ترین روداد کے لئے بھی خاصی ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ اس لئے کہ ابتدائی ۱۰ سال کی جو رپورٹ ۱۹۸۲ء میں مرتب کی گئی تھی وہ انتہائی اختصار کے باوجود تقریباً ایک صد صفحات پر مشتمل تھی۔ لہٰذا یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ انجمن کی کارکردگی کے کس پہلو کو لیا جائے اور کس پہلو کو چھوڑ دیا جائے ------ اور عین ممکن ہے کہ بعض ایسی چیزیں چھوٹ جائیں جن کے بارے میں بعض واقفانِ حال کی رائے یہ ہو کہ "یہ تو بہت ضروری تھیں"۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اگرچہ قائم تو مارچ ۱۹۷۲ء میں ہو گئی تھی لیکن اس نے ایک باقاعدہ رجسٹرڈ ادارے کی حیثیت نومبر ۱۹۷۲ء میں اختیار کی جس کے تاحینِ حیات صدرِ مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قرار پائے۔ جن کی سات سالہ سعی وجہد ہی کا نتیجہ انجمن کی شکل میں نمودار ہوا تھا! ابتداً بیس حضرات نے مبلغ پانچ ہزار روپے فی کس یکمشت ادا کئے اور پچاس روپے ماہانہ ادائیگی کا وعدہ کیا اور اس طرح انجمن کے "مؤسسین" کی حیثیت اختیار کی۔ بعدہٗ جن حضرات نے پانچ ہزار یکمشت ادا کر دیا اور پچاس روپے ماہوار زرِ تعاون دینے کا وعدہ کیا انہیں "حلقہ محسنین" میں شامل کیا گیا ------ مبلغ دو ہزار روپے یکمشت اور بیس روپے ماہانہ ادا کرنے والے حضرات حلقہ "مستقل ارکان" سے منسلک ہوئے اور کسی یکمشت ادائیگی کے بغیر صرف دس روپے یا اپنی مرضی سے اس سے زائد ماہانہ زرِ تعاون ادا کرنے والے "عام اراکین" کے حلقہ میں شامل ہوئے[1]۔

فی الوقت انجمن کے اراکین کی تعداد ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

۱) حلقہ مؤسسین میں شامل ۲۰ حضرات میں سے تین حضرات اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اعلیٰ مراتب عطا فرمائے۔

۲) حلقۂ محسنین کی کل تعداد ۲۱۰ ہے جن میں سے ۱۰۸ حضرات باقاعدگی کے ساتھ ماہانہ زرِ تعاون ادا کر رہے ہیں۔

۳) حلقۂ مستقل ارکان کی کل تعداد ۱۱۵ ہے جن میں سے ۵۵ حضرات باقاعدگی کے ساتھ زرِ

---

[1] بعد میں ۱۹۸۶ء کے آغاز سے مؤسسین اور محسنین کا ماہانہ زرِ تعاون یک صد روپیہ، مستقل ارکان کا چالیس روپے اور عام ارکان کا کم از کم بیس روپے کر دیا گیا۔

تعاون ادا کر رہے ہیں۔

۴) حلقۂ عام ارکان کی کل تعداد ۳۵۶ ہے جن میں سے ۲۰۱ حضرات باقاعدہ زرتعاون ادا کر رہے ہیں۔

سالانہ اجلاس اور انتخابات

انجمن کے قیام سے آج تک الحمد للہ ہر سال باقاعدگی کے ساتھ انجمن کا سالانہ اجلاسِ عام منعقد ہوتا رہا ہے۔ جس کا باضابطہ اخبارات میں اشتہار کے ذریعے اعلان کیا جاتا ہے۔ اب تک ۱۷ سالانہ اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں اور ان مواقع پر صدر مؤسس کا خصوصی خطاب اس پروگرام کا مستقل حصہ رہا ہے۔ علاوہ ازیں قواعد و ضوابط کے مطابق ہر دو سال بعد مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ کا انتخاب بذریعہ بیلٹ (خفیہ رائے دہی) عمل میں آتا ہے ------ علاوہ ازیں ہر ماہ انجمن کی مجلس منتظمہ کا اجلاس انتہائی باقاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے جس میں اکیڈمی اور انجمن کو درپیش مسائل اور اُن کے حل کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوتی ہے۔

کُل زرِتعاون

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے فنڈز کا ایک عمومی جائزہ بھی ہدیۂ قارئین کر دیا جائے۔

- قیام انجمن سے لے کر دسمبر ۱۹۸۹ء تک : گویا سترہ سال ایک ماہ کی مدت میں

۱۔ مؤسسین، محسنین اور مستقل ارکان کا یکمشت زرتعاون -/۱۳۳۷۰۰۰ روپے

۲۔ جو رقوم بطور ماہانہ زرتعاون وصول کی گئیں -/۲۱۱۳۲۶۶ روپے

۳۔ جو رقوم بطور عطیات عمومی وصول کی گئیں -/۲۹۵۰۸۲۹ روپے

۴۔ جو رقوم بطور زکوٰۃ وصول کی گئیں -/۲۲۸۲۴۱۹ روپے

۵۔ جو رقوم بطور قرآن اکیڈمی عطیات وصول کی گئیں -/۲۱۵۵۳۵۳ روپے

۶۔ جو رقوم برائے تعمیر قرآن کالج آڈیٹوریم وصول کی گئیں -/۷۳۵۷۰۱۳ روپے

میزان -/۱۸۱۹۵۸۸۰ روپے

گویا انجمن کے قیام سے لے کر دسمبر ۸۹ء تک مبلغ ایک کروڑ' اکاسی لاکھ' پچانوے ہزار' آٹھ صد' اسّی روپے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کو اپنے معاونین سے حاصل ہوئے - اگرچہ یہ رقم موجودہ حالات میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تاہم اس مادّہ پرستانہ دور میں بغیر کسی سیاسی نعرہ بازی یا فرقہ وارانہ اپیل کے خالصتاً قرآن حکیم کے علوم و معارف کی اشاعت کی غرض سے اتنی رقم کا فراہم ہو جانا بھی اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کے باعث ہی ممکن ہو سکا ہے۔

اب بعض عنوانات کے تحت انجمن کی کارگزاری کی ایک مختصر رپورٹ بلکہ جھلک پیش خدمت کی جا رہی ہے - اس سلسلے میں تحریر کی ناپختگی پر پیشگی معذرت قبول فرمائیں۔

سالانہ قرآن کانفرنسیں اور قرآنی محاضرات

۱۹۷۳ء سے انجمن نے سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا جو نہ صرف دعوتِ رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئیں بلکہ ملک کی سماجی و ثقافتی زندگی کا ایک مستقل نشان بن گئیں - اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ملک کے دیگر ادارے بھی ملک کے مختلف مقامات پر ایسے اجتماعات منعقد کر رہے ہیں جن کا عنوان "قرآن کانفرنس" ہوتا ہے۔ بعد میں ہم نے اس کی بجائے "محاضراتِ قرآنی" کا عنوان اختیار کر لیا - حاضرین کی تعداد' شرکاء کے ذوق و شوق' اجتماعات کے نظم و ضبط اور مقالوں اور تقاریر کے معیار کے علاوہ حاضرین کے جوش و خروش' کارکنوں کی مستعدی اور حسنِ انتظام یہاں تک کہ اجتماع گاہ کی تزئین و آرائش' غرض ہر اعتبار سے انجمن کے زیرِ اہتمام قرآن کانفرنسیں معیاری ہی نہیں مثالی قرار دی گئیں - جنہوں نے اہل وطن ہی سے نہیں بیرون ملک مقیم حضرات سے بھی زبردست خراجِ تحسین حاصل کیا - ایک خوشگوار رجحان اور حیرت افزاء بات لوگوں کو یہ محسوس ہوئی' اور ہم اس پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں' کہ اختلاف اور افتراق و انتشار کے اس دور میں انجمن نے اپنی قرآن کانفرنسوں کے ذریعے تقریباً تمام مسلّمہ فرقوں اور مسلکوں کے اہل علم و فضل حضرات کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔

اب تک الحمدللہ آٹھ قرآن کانفرنسیں اور نو محاضرات قرآنی منعقد ہو چکے ہیں جن میں قرآن حکیم کی تعلیمات کو بلند ترین علمی و فکری سطح پر متعارف کرانے کے ضمن میں بلا

مبالغہ سینکڑوں مفکرینِ قرآن اور علمائے دین نے اپنے قرآنی فکر کا نچوڑ پیش کیا۔
(۱) ان میں سے بہت سے حضرات ان ۱۸ برسوں میں اپنے رب کے حضور پہنچ گئے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قوی امید ہے کہ وہ سورۂ یونس کی آیات ۹ اور ۱۰ کے مصداق بن چکے ہوں گے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ☆ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ☆

ان میں سے جن حضرات کے اسمائے گرامی حافظے میں محفوظ ہیں وہ ذیل میں درج ہیں:

۱- مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ ۲- مولانا شمس الحق افغانیؒ
۳- مولانا حافظ محمد گوندلویؒ
۶- مولانا محمد حنیف ندویؒ
۷- مولانا عبید اللہ انورؒ ۸- مولانا سید حامد میاںؒ
۹- مولانا سید منتخب الحق قادریؒ ۱۰- مولانا محمد مالک کاندھلویؒ
۱۱- ڈاکٹر منظور احسن عباسیؒ ۱۲- پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ
۱۳- مولانا سید ابو بکر غزنویؒ ۱۴- خواجہ غلام صادق صاحبؒ

(۲) انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کے علاوہ وہ حضرات جن کا انجمن کی قرآن کانفرنسوں اور محاضرات کے ساتھ مستقل تعاون رہا، ان میں سے بعض معروف شخصیات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱- مولانا مفتی محمد حسین نعیمی - لاہور ۲- مولانا محمد طاسین - کراچی
۳- مولانا اخلاق حسین قاسمی - (دہلی) ۴- علامہ سید غلام شبیر بخاری - لاہور
۵- ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب - لاہور ۶- ڈاکٹر سلیم فارانی صاحب - لاہور
۷- مولانا سید وصی مظہر ندوی - حیدر آباد ۸- مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب
۹- پروفیسر مرزا محمد منور صاحب - لاہور ۱۰- جناب خالد ایم اسحاق صاحب - کراچی
۱۱- چوہدری مظفر حسین صاحب - لاہور ۱۲- پروفیسر حافظ احمد یار صاحب - لاہور
۱۳- حافظ نذر احمد صاحب - لاہور ۱۴- مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب - لاہور

۱۵- مولانا عبد الرحمان مدنی-لاہور ۱۶- ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب-
۱۷- ڈاکٹر امان اللہ ملک-لاہور ۱۸- پروفیسر محمد اسلم صاحب-لاہور
۱۹- ڈاکٹر خالد علوی صاحب-لاہور

ایسے حضرات جو وقتاً فوقتاً ان قرآن کانفرنسوں کی سرپرستی فرماتے رہے ہیں، اُن کی فہرست تو بہت طویل ہے تاہم کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- مولانا امین احسن اصلاحی صاحب (لاہور) ۲- مولانا ظفر احمد انصاری صاحب (کراچی)
۳- مولانا محمد اسحاق صدیقی صاحب (کراچی) ۴- مولانا عبد الرشید نعمانی صاحب (کراچی)
۵- مولانا محمد اجمل خان صاحب (لاہور) ۶- مولانا عبد الرحمٰن صاحب (جامعہ اشرفیہ)
۷- مولانا محمد مظہر بقا صاحب (کراچی) ۸- مولانا عبد الکریم پاریکھ صاحب ناگپور (انڈیا)
۹- ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری (کراچی) ۱۰- جسٹس شیخ ظہور الحق صاحب (کراچی)
۱۱- جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب (کراچی) ۱۲- ڈاکٹر عبد الواحد ہالے پوتہ (حیدر آباد)
۱۳- حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب (فیصل آباد) ۱۴- شاہ بلیغ الدین صاحب (کراچی)
۱۵- پروفیسر محمد اقبال (علی گڑھ) ۱۶- پروفیسر عضد الدین صاحب (علی گڑھ)
۱۷- ڈاکٹر عبد الواسع (علی گڑھ) ۱۸- ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ (لاہور)
۱۹- پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب ۲۰- علامہ پروفیسر طاہر القادری صاحب
۲۱- پروفیسر ڈاکٹر عبد الخالق (لاہور) ۲۲- پروفیسر ڈاکٹر خواجہ امجد سعید صاحب
۲۳- قاری میر قطب الدین علی چشتی حیدر آباد (دکن) ۲۴- مولانا محمد موسیٰ خان صاحب (لاہور)
۲۵- مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب (لاہور)
۲۶- قاری محمد عبد العلیم (حیدر آباد — دکن)

۱۹۸۱ء سے قرآن کانفرنس کی بجائے قرآنی محاضرات "Quranic Seminars" کے عنوان سے سالانہ پروگرام ترتیب دیئے جاتے رہے جن میں حاضرین بھی تحریری شکل میں مقرر یا مقالہ نگار سے سوال کرتے اور ان کا جواب دیا جاتا- اس طرح ان محاضرات کی وجہ سے ان پروگراموں کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا-

ان سالانہ محاضرات کے ضمن میں تین اہم موضوعات جن پر اُس سال کے محاضرات کی جملہ نشستیں وقف رہیں حسب ذیل ہیں-

۱- ۱۹۸۵ء میں "فرائض دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر انجمن کے صدر مؤسس نے ایک مختصر تحریر مرتب کی اور اسے ایک صد سے زائد علماء اور فضلاء کی خدمت میں ارسال کیا تاکہ وہ اس کی تصویب' یا تصحیح کی زحمت گوارا فرمائیں اور انہیں دعوت دی کہ وہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور تنظیم اسلامی کے مشترکہ اجتماع سے خطاب فرمائیں جہاں انجمن کے صدر مؤسس اور امیر تنظیم اسلامی مع اپنے جملہ رفقاء واحباب کے محض سامع ہوں گے تاکہ بحث مباحثہ کی فضا پیدا نہ ہو اور ہمارے جملہ ساتھی اہل علم سے بھرپور استفادہ کر سکیں- یہ محاضرات مسلسل چھ روز تک عصر تا مغرب اور پھر مغرب تا عشاء قرآن اکیڈمی کی کشادہ جامع مسجد میں منعقد ہوئے اور ان میں تقریباً تیس حضرات نے اپنے خیالات کا بھرپور اور بلاجھجک اظہار کیا- جن میں جہاں تصویب و تائید تھی' وہاں تردید و ابطال ہی نہیں تمسخر و استہزاء بھی تھا- اور اس طرح یہ بات عام طور پر تسلیم کی گئی کہ یہ ایک نرالی مثال ہے جس کی کوئی دوسری نظیر کم از کم عہد حاضر میں موجود نہیں- فالحمد للہ علیٰ ذالک-

۲- انجمن کے صدر مؤسس نے "استحکام پاکستان" کے موضوع پر کتاب تصنیف فرمائی تو اس پر اسی قسم کے محاضرات جناح ہال لاہور میں چار روز تک منعقد ہوئے اور اس میں علماء اور دینی ذہن رکھنے والے دانشور حضرات کے ساتھ ساتھ سیکولر اور سوشلسٹ خیالات کے حامل حضرات کو بھی اظہار خیال کی کھلی دعوت دی گئی اور بحمد اللہ کوئی تلخ صورت پیدا نہیں ہوئی-

۳- مارچ ۸۸ء میں لاہور میں حسب معمول جو محاضرات قرآنی جناح ہال میں منعقد ہوئے اُن کا مجموعی عنوان "اسلام کا نظام حیات" تھا جس میں مقررین اور مقالہ نگار حضرات نے اسلامی نظام کی نظریاتی اساس یعنی ایمان' اور پھر اسلام کے اجتماعی نظام کے مختلف پہلوؤں یعنی اخلاقی' معاشرتی' معاشی اور سیاسی پر اظہار خیال کیا-

۴- دسمبر ۱۹۸۸ء میں کراچی کے 'ہاشو آڈیٹوریم' میں "اسلام کا نظام حیات" ہی کے موضوع پر دوبارہ محاضرات منعقد ہوئے اگرچہ اس کی نوعیت مختلف رہی- یعنی بجائے اس کے کہ متعدد اصحاب علم و فضل اظہار خیال کریں ہر روز درج ذیل عنوانات کے تحت ——— انجمن کے صدر مؤسس ہی کے نہایت جامع و مانع خطابات ہوئے اور ان کے خطاب کے بعد ماہرین کے ایک پینل کی جانب سے سوالات کے جواب میں اضافی وضاحتیں ہو گئیں- اس پورے پروگرام کو پڑھے لکھے طبقے نے بہت سراہا- اگرچہ اس

میں ایک مرحلے پر کسی قدر تلخی بھی پیدا ہو گئی۔

۱۔ اسلامی نظام کی نظریاتی اساس

۲۔ اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام

۳۔ اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام

۴۔ اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام

۵۔ اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام

یہ خطابات کم و بیش دو سوا دو گھنٹے کے دورانئے کے تھے اور لگ بھگ ایک ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش کے باوجود تمام راہداریاں اور اسٹیج پر موجود جگہ سامعین سے پُر تھی۔ بہت سے افراد برآمدوں میں براجمان تھے اور خاصی تعداد میں لوگ ڈاکٹر صاحب کو سننے کی خواہش دل میں لئے ہی واپس گھروں کو لوٹ گئے۔ تقریباً تین ہفتے بعد ہاشو آڈیٹوریم کراچی میں انجمن کے صدر مؤسس کا ایک اور خطاب اس موضوع پر ہوا کہ اسلامی نظام قائم کیسے کیا جا سکتا ہے اس میں بھی الحمد للہ کہ حاضری بہت تھی۔

مارچ ۱۹۸۹ء میں جناح ہال لاہور میں مذکورہ بالا عنوانات کے تحت پھر تفصیلی خطابات صدر مؤسس ہی کے ہوئے۔ اگرچہ رونق کے اعتبار سے وہ کراچی کے محاضرات سے خاصے کم تھے!

سیرت کانفرنس

سالانہ قرآن کانفرنسوں اور سالانہ قرآنی محاضرات کی طرح یہ طے کیا گیا کہ انجمن کے زیر اہتمام سالانہ سیرت کانفرنس بھی منعقد کی جایا کرے۔ اس کی تحریک یوں پیدا ہوئی کہ ۷ اپریل تا ۱۶ جون ۷۸ء ہر جمعہ کی شام کو ماڈل ٹاؤن لاہور کے مختلف بلاکوں کی جامع مساجد میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سیرت نبویؐ کے موضوع پر تقاریر کیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ ۲۴ تا ۲۷ نومبر ۷۸ء پہلی سیرت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ بعض وجوہات کی بنا پر جناح ہال صرف ایک روز دستیاب ہو سکا چنانچہ یہ کانفرنس صرف ایک روز یعنی ۲۴ نومبر ۷۸ء کو منعقد کی جا سکی، جس کے تین اجلاس ہوئے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے یکم دسمبر سے ۸ دسمبر ۷۸ء تک روزانہ مسجد شہداء لاہور میں صدر مؤسس کی سیرت النبیؐ کے موضوع پر مسلسل تقاریر ہوئیں۔ پہلی سیرت کانفرنس کے بعد انجمن کے

زیر اہتمام پھر کوئی سیرت کانفرنس منعقد نہ کی جا سکی - جس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان سنّی کونسل کے زیر اہتمام ہر سال خالق دینہ ہال کراچی میں صدر مؤسّس کے کئی روز تک سیرت پر مسلسل خطابات کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں سال کے اکثر مہینوں اور خصوصًا ماہ ربیع الاول میں سرکاری نیم سرکاری اور غیر سرکاری تجارتی اور صنعتی اداروں کی طرف سے اس قدر خطابات ہوتے رہے ہیں کہ پھر کسی سیرت کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی -

انجمن کی دس سالہ تقاریب

انجمن کی تاسیس چونکہ نومبر ۷۲ء میں ہوئی تھی لہٰذا نومبر ۸۲ء میں عشرۂ تقاریب کا اہتمام کیا گیا - اس سلسلہ کی ابتداء ایک مجلسِ مذاکرہ سے ہوئی جو "اصلاح معاشرہ اور قرآن حکیم" کے موضوع پر جناح ہال لاہور میں مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب رئیس بلدیہ حیدر آباد سندھ کے زیر صدارت منعقد ہوئی - اس مجلس کے مہمان خصوصی جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب چیئرمین اسلامک آئیڈیالوجی کونسل پاکستان تھے - ان کے علاوہ پروفیسر حافظ احمد یار، علامہ سید غلام شبیر بخاری، پروفیسر مرزا محمد منوّر، اور چوہدری مظفر حسین، نے مقالات پیش کئے یا تقریریں کیں - ڈاکٹر اسرار احمد گزشتہ دو ہفتوں سے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں "اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور اور قرآن حکیم" کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے رہے تھے - چنانچہ اس کے تسلسل میں موصوف نے سب سے آخر میں اسی موضوع پر تقریر کی -

دس سالہ تقاریب کے عشرہ کے پروگرام میں نو دن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درسِ قرآن کے لئے مختص کئے گئے تھے - چنانچہ تین دن یعنی ۱۳ تا ۱۵ نومبر ۸۲ء مسجد شہداء لاہور میں روزانہ عصر تا مغرب اور بعد مغرب تا عشاء چھ نشستوں میں سورۃ الحج کے آخری رکوع کی چھ آیات کا جو دین کے فلسفہ و حکمت اور اس کے اساسی مطالبات کے موضوع پر قرآن حکیم کے جامع ترین مقام کی حیثیت رکھتی ہیں، ڈاکٹر صاحب نے درس دیا - درس قرآن کا چھ روزہ مزید پروگرام ۱۶ تا ۲۱ نومبر ۸۲ء جناح ہال لاہور میں رکھا گیا تھا - جس میں سورۃ حدید اور سورۃ صف کے درس کا اہتمام تھا - یہ دونوں سورتیں خطاب بہ امّتِ مسلمہ اور جہاد و قتال فی

سبیل اللہ کے ضمن میں قرآن حکیم کے ذروۂ سنام کا مقام رکھتی ہیں۔ بعد میں سورۃ جمعہ کا درس بھی شامل کر لیا گیا تھا جو انقلابِ محمدیؐ کے اساسی نہج کی رہنمائی کے ضمن میں ایک اہم خصوصیت کی حامل سورۃ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے سورۃ حدید کے درس سے قبل جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحومؒ نے سورۃ حدید کی خصوصیات پر ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔ جناح ہال میں یوں تو اس سے قبل بھی ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآن حکیم اور خطابات ہوتے رہے ہیں لیکن اس ہال میں مسلسل چھ روز تک ڈاکٹر صاحب کے دروس پہلی بار ہوئے اور الحمد للہ کہ نہایت کامیاب رہے۔ ہال میں سامعین کا ذوق و شوق دیدنی تھا۔ تِل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ ہال کے باہر بھی بہت سے لوگ کھڑے ہو کر سنتے تھے۔ پورا مجمع اعجازِ قرآنی اور دل سوز و پُر تاثیر اندازِ خطاب سے مبہوت و مسحور ہوتا تھا۔

قرآن حکیم کی ان سورتوں کے مضامین و مفاہیم اور مطالب و مباحث کی جامعیت تو مسلّم ہے ہی ـــــ اس پر مستزاد ڈاکٹر صاحب کا اسلوب بیان انداز تعلیم و تفہیم اور پر تاثیر خطابت ـــــ گویا سونے پر سہاگہ تھا۔

قرآنی تربیت گاہیں

کسی بھی اصولی و نظریاتی تحریک کے کارکنوں کے لئے تربیت گاہوں (Training Camps) کا انعقاد نہایت ضروری ہوتا ہے' ان میں جہاں ایک طرف کارکنوں کے قلوب و اذہان میں اُس تحریک کے اصول و نظریات کو راسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں دوسری طرف مخالف تحریکوں کی یلغار سے بچنے کے لئے خود اُن تحریکوں کے اصول و نظریات سے واقف کرایا جاتا ہے۔ ان تربیت گاہوں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کارکنوں کو نہ صرف ان نظریات کا عملی نمونہ بناتی ہے تاکہ وہ اس تحریک کے چلتے پھرتے پیکر نظر آئیں بلکہ وہ اس کا پرچارک اور علمبردار بناتی ہیں ـــــ یہ کام دنیا کی دوسری نظریاتی تحریکوں کے لئے ضروری ہو یا نہ ہو' اسلام کے لئے کام کرنے والی تحریک کے لئے تو انتہائی ضروری (must) ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قرآن حکیم کا جو ایک منتخب نصاب مرتب کیا ہے اس کی بنیاد ہی سورۃ العصر پر ہے جس میں عذاب اخروی سے نجات کے لئے کم از کم لوازم بیان کئے

گئے ہیں - یعنی ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دل کے پورے یقین کے ساتھ ایمان لائے ان تمام چیزوں پر جن پر ایمان لانے کا اسلام تقاضا کرتا ہے اپنی زندگی میں اس کے مطابق تبدیلی لائے یعنی عمل صالح کا پیکر بن جائے' حق کی تبلیغ کرے' پرچار کرے اس کا علمبردار ہو اور اس کو ادیانِ باطلہ پر غالب کرنے کی جدوجہد کرے اور اس جدوجہد میں صبر و مصابرت سے کام لے - کہیں پیٹھ نہ دکھائے' کوئی Persecution اور کوئی لالچ (Temptation) اس کے قدم راہ اعتدال سے نہ ہٹا سکیں اور یہ کہ نہ مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر شارٹ کٹ (Short Cut) اختیار کرے - اور نہ ہی نیک مقصد کے لئے غلط طریقۂ کار کی بھول بھلیّوں میں گم ہو کر رہ جائے -

انجمن اپنے کارکنوں کی تربیت سے غافل نہیں رہی ہے - یوں تو ہر درس قرآن اور درس حدیث کسی دینی موضوع پر تقریر کی مجلس خود ایک تربیت گاہ ہے - لیکن ایسی تربیت گاہیں جو اقامتی ہوں' جو یا تو کسی ایک شہر کی بنیاد پر یا پھر پورے ملک کی بنیاد پر منعقد کی گئی ہوں' انجمن کے پروگرام میں شامل رہی ہیں -

۱ - لاہور - اگست ۱۹۷۲ء

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کے کل چار ماہ بعد ہی پہلی قرآنی تربیت گاہ کا انعقاد عمل میں آ گیا - اگست ۱۹۷۲ء کے وسط میں جامع مسجد خضراء سمن آباد میں (جو دعوت رجوع الی القرآن کے اس قافلے کے ضمن میں مکانی اعتبار سے بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے) دس روز کے لئے منعقد ہوئی - بعد میں ہر سال یہ تربیت گاہیں ہوتی رہی ہیں لیکن اس پہلی تربیت گاہ کا سرور انگیز نقش جو دل پر قائم ہوا اس کی مٹھاس آج بھی دل میں نشاط کی کیفیت پیدا کرتی ہے - راقم اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا - F.S.C پری میڈیکل کا امتحان پانچ یا چھ ماہ بعد ہونا تھا لیکن اس تربیت گاہ میں 'کل وقتی' شرکت ہوئی - قبلِ فجر اجتماعی نوافل کا اہتمام' نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن حکیم' صبح ۸ بجے تا ایک بجے تعلیمی و تربیتی پروگرام' پھر قبلِ نماز عصر تجوید و قراءت کی کلاس جس میں مولانا عبدالرحمٰن تونسوی صاحب (جو آج کل سعودی عرب میں مقیم ہیں) تجوید کی تصحیح فرماتے تھے' مسجد خضراء کا وسیع ہال لحنِ قرآنی سے گونج اٹھتا تھا' پھر عصر تا مغرب اور مغرب تا عشاء قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس کہ ان دس دنوں میں اس نصاب کی تکمیل کر لی گئی - عشاء کی نماز کے بعد قیام گاہ (قریب ہی موجود سنٹرل ماڈل اسکول سمن آباد کی عمارت) پر

رات گئے تک ادعیۂ ماثورہ، اذکار مسنونہ اور سیرت النبی علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کا تذکرہ ہوتا تھا۔

اس تربیت گاہ کا انتظام نہایت عجلت میں کیا گیا۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ جولائی میں کراچی میں تربیت گاہ منعقد کرنے کا پروگرام تھا لیکن اس ماہ میں کراچی ہی نہیں پورا صوبہ سندھ لسانی فسادات کی لپیٹ میں آ گیا اس لئے وہاں اس کا انعقاد ممکن نہ رہا ------ وقت کی کمی اور مناسب طور پر بروقت لوگوں کو اطلاع نہ ملنے کے باوجود یہ تربیت گاہ ہر اعتبار سے کامیاب رہی ۔ لاہور اور بیرون لاہور سے کم و بیش چالیس ،پینتالیس شرکاء تو مستقلاً تربیت گاہ ہی میں مقیم رہے اور ان میں اکثریت بحمد اللہ نوجوان طلباء کی تھی۔ ان کے علاوہ بعد نماز فجر، بعد نماز عصر اور بعد نماز مغرب جو کھلی مجالس ہوتی رہیں اُن میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوتے رہے، یہ حاضری پانچ صد سے بھی تجاوز کر گئی۔ اس تربیت گاہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مطالعۂ قرآن حکیم کا مرتب کردہ نصاب تقریباً پورا پڑھا دیا۔ مولانا عبد الغفار حسن صاحب نے "حجیّت حدیث اور اہمیت سنّت" کے موضوع پر تین نہایت جامع اور مدلّل تقریریں کیں۔ اور بعد ازاں منتخب احادیث کا درس دیا۔ اس کے علاوہ قاری عبدالرحمٰن صاحب تونسوی نے تجوید و قراءت کے بنیادی قواعد کی تعلیم دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دو نہایت موثر اور مفید خطاب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے ہو گئے۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ ۱۹۷۴ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کے موقع پر تنظیم میں شمولیت اختیار کرنے والوں کی اکثریت ان حضرات پر مشتمل تھی جو اس پہلی قرآنی تربیت گاہ میں شرکت کر چکے تھے گویا خالصتاً انفرادی حیثیت میں والدِ محترم کے دروسِ قرآن نے ان حضرات کے کشتِ قلوب میں تخم ریزی کی تھی اور دین کے اجتماعی پہلو کی اہمیت کے اعتبار سے پہلی قرآنی تربیت گاہ نے ان میں کل دس دنوں میں منتخب نصاب کی تکمیل ہو جانے کے باعث اجتماعیت کی اہمیت اور ضرورت اور دین کے کام میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر باطل اور مزعومہ عقائد و افکار کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کام کرنے کا جذبہ اور ولولہ پیدا کیا تھا۔

اس پہلی تربیت گاہ کے بعد تو یہ معمول بن گیا کہ ہر سال ایک یا دو تربیت گاہیں منعقد ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ تاہم دسمبر ۷۶ء تک جو تربیت گاہیں پاکستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہوئیں ان کی ایک مختصر روداد انجمن کی دس سالہ رپورٹ سے نقل کی جا رہی ہے جسے محترم قاضی عبد القادر صاحب نے مرتب کیا تھا۔

کراچی (دسمبر ۷۲ء)

دسمبر کے آخری ہفتہ میں رباط العلوم اسلامیہ کے ہال میں ایک دس روزہ قرآنی تربیت گاہ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے منتخب قرآنی نصاب تسلسل کے ساتھ پیش فرمایا۔ حاضری توقع سے کہیں زیادہ رہی۔ مولانا بدیع الزمان صاحب (پیر جھنڈا) نے اس تربیت گاہ میں درسِ حدیث دیا۔

کراچی (دسمبر ۷۳ء)

۲۳ تا ۳۰ دسمبر جمعیت الفلاح ہال کراچی میں ایک آٹھ روزہ قرآنی تربیت گاہ منعقد ہوئی جس میں حسب سابق تین درس روزانہ ہوئے۔ ایک صبح نماز فجر کے بعد جس میں اربعین نووی کی ابتدائی احادیث کا درس دیا گیا' دوسرا بعد نماز عصر جس میں آخری پارے میں سے سلسلہ وار سورۂ بلد سے سورۂ والتین تک چھ سورتوں کا درس ہوا اور تیسرا بعد نمازِ مغرب جو طویل ترین ہوتا تھا اور جس میں بحمداللہ پوری سورۂ ھود کے علاوہ سورۂ یونس کے بھی دو رکوع مشتمل بر انباء الرسل بیان کئے گئے۔ صبح کے درس حدیث میں تو حاضری کم ہی رہتی تھی لیکن شام کے دروس میں حاضری تقریباً تین صد تک رہی اور شرکاء نے حد درجہ ذوق و شوق کا اظہار کیا۔

کراچی (اپریل ۷۴ء)

یہ اقامتی تربیت گاہ شہر کے مضافات میں قریشی کنسٹرکشن کمپنی کی عمارات واقع کورنگی میں یکم تا ۴ اپریل منعقد ہوئی۔ اس میں کراچی کے رفقاء کے علاوہ لاہور اور حیدر آباد سے بھی کچھ احباب نے شرکت فرمائی۔ عصر تا عشاء دروس قرآن اور فجر کی نماز کے بعد درس حدیث ہوتا تھا۔ درس قرآن میں سورۂ علق' سورۂ قلم' اور سورۂ مزمل شامل تھیں۔ دن میں ڈاکٹر صاحب کے خطابات اور لٹریچر کا مطالعہ ہوتا تھا۔ خطابات کے موضوع "حقیقتِ شرک" اور "حقیقت ایمان" تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے "اسلام کی نشأۃ ثانیہ' کرنے کا اصل کام" کا اجتماعی مطالعہ بھی کرایا۔

لاہور (جولائی ۷۴ء)

ماہنامہ "میثاق" جون کے شمارہ میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام یکم تا ۳۱ جولائی' دینی تعلیم و تربیت کے ایک ماہی پروگرام کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ دینی ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے یہ ایک سنہری موقع اور خصوصاً اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کے لئے تعطیلاتِ گرما کا بہترین مصرف تھا۔ اس تربیت گاہ کا

روزانہ کا پروگرام اس طرح ترتیب دیا گیا تھا: بعد نماز مغرب درس قرآن حکیم ازڈاکٹر اسرار احمد صاحب جس میں موصوف نے منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس دیا۔ بعد نماز فجر درس حدیث جس میں مشکوٰۃ المصابیح کے دو اجزا یعنی کتاب الایمان اور کتاب العلم کا مطالعہ ہوتا تھا اور بعد نماز عصر 'قواعد لغت عربی کا ایک سبق اور صبح ۸ تا ۱۲ بجے باقاعدہ کلاسوں کی صورت میں مطالعۂ کتب 'مذاکرہ 'مشق تقریر و خطاب اور تصحیح قرات و تجوید۔

اتوار ۳۰ جون کی صبح کو مسجد شہداء میں تربیت گاہ کی تمہید کے طور پر ایک مفصل تقریر "پاکستان اسلام اور قرآن" کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے کی اور اسی شام کو تربیت گاہ کی افتتاحی تقریب سے مولانا عبید اللہ انور رحؒصاحب خلف الرشید مولانا احمد علی لاہوریؒ نے خطاب فرمایا۔

اعلان کے مطابق تربیت گاہ کو پورے ایک ماہ جاری رہنا تھا لیکن موسم کی خرابی 'بجلی کی رو کا بار بار منقطع ہو جانا اور بعض دیگر وجوہات اور اصلاً اس وجہ سے کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت پہلے عشرہ کے بعد ہی جواب دے گئی پروگرام کو مختصر کرنا پڑا اور بجائے ایک ماہ کے تین ہفتوں پر قناعت کرنی پڑی تاہم ڈاکٹر صاحب نے جیسے بھی بن پڑا اپنے آپ پر شدید سختی جھیل کر حسبِ اعلان مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس بھی مکمل کر لیا اور اس کے اختتام پر اتوار ۲۱ جولائی کی شام کو ایک تقریر میں شرکاء و سامعین کے سامنے واضح الفاظ میں یہ سوال بھی رکھ دیا کہ دین کے جو تقاضے اور مطالبے قرآن حکیم کے ان مقامات کی روشنی میں واضح ہوئے ہیں کون ہے جو ان کی ادائیگی کے لئے ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو ------چنانچہ اسی کے نتیجے میں مارچ ۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس لئے کہ اس تربیت گاہ میں ملک کے مختلف شہروں سے احباب خاصی تعداد میں شریک ہوئے تھے۔

کوئٹہ (جولائی ۷۵ء)

اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ کی عمارت میں ۲۳ تا ۳۰ جولائی یہ تربیت گاہ منعقد ہوئی۔ جس میں کراچی 'لاہور اور دیگر مقامات سے شرکاء کے علاوہ کوئٹہ کے شہریوں کی بھی اچھی خاصی تعداد شریک رہی۔ بعد نمازِ فجر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب درس قرآن دیتے تھے 'موصوف نے سورۃ حجرات کی آیات ۱۴ '۱۵ 'سورۃ حج کی آخری دو آیات اور پوری سورۃ صف اور مکمل سورۃ جمعہ کا درس دیا۔ درس حدیث روزانہ بعد نماز عصر مولانا عبدالغفار حسن صاحب دیتے تھے موصوف نے مشکوٰۃ المصابیح کی کتاب العلم کی پہلی دونوں فصلوں کا درس دیا۔ دن میں ڈاکٹر صاحب لٹریچر کا مطالعہ کراتے تھے۔ آخری روز زیارت کا ایک روزہ پکنک کا

پروگرام بنا جو دراصل ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب کے پر زور اور محبت آمیز اصرار کا نتیجہ تھا۔

کراچی (دسمبر ۷۵ء)

شہر کے مرکزی علاقہ میں مدینہ مسجد میں ۲۳ تا ۳۰ دسمبر یہ آٹھ روزہ تربیت گاہ منعقد ہوئی۔ لاہور سے بھی چند رفقاء شرکت کے لئے تشریف لائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس تربیت گاہ میں سورۂ توبہ کا مکمل درس دیا جسے لوگ نہایت ذوق و شوق سے سننے کے لئے پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ اسی تربیت گاہ میں حیدر آباد (سندھ) کے معروف عالم دین اور مدرسہ عربیہ اسلامیہ حیدر آباد کے ناظم و مہتمم مولانا سید وصی مظہر صاحب ندوی نے چھ روز تک عصر تا مغرب درس حدیث دیا۔

راولپنڈی (اگست ۷۶ء)

ایک آٹھ روزہ تربیت گاہ (۸ راگست تا ۱۵ راگست) راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان مری روڈ پر واقع انجمن فیض الاسلام کے یتیم خانہ کی عمارت میں منعقد کی گئی جو دار الشفقت کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تربیت گاہ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہی۔ اس کے انعقاد میں خالص خدائی تائید و نصرت کار فرما اور اس کا خصوصی فضل شامل حال رہا ورنہ ظاہری اسباب انتہائی نامساعد تھے۔ ملک بھر میں بارشوں کا زبردست طوفان بپا تھا۔ سیلاب کی وجہ سے ریل اور سڑک کے اکثر راستے مسدود ہو گئے تھے اور جو کھلے تھے وہ انتہائی مخدوش تھے۔ اس کے باوجود بھی راولپنڈی اور اسلام آباد کے سینکڑوں باسیوں کے علاوہ لاہور سے ۳۲، کراچی سے ۱۴، اور سکھر، شیخوپورہ، سرگودھا، گوجرانوالہ، ہری پور ہزارہ اور آزاد کشمیر سے متعدد احباب شریک ہوئے۔ مقامی خواتین کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد پابندی سے شرکت کرتی رہی جن کے لئے پردہ کا معقول انتظام تھا۔ عصر تا مغرب اور مغرب تا عشاء دو عمومی نشستوں میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ایک طرف اپنے مرتب کردہ قرآنی نصاب کے مطابق درس قرآن دیا تو دوسری جانب "حقیقت و اقسام شرک"، "حقیقت ایمان" اور "حقیقت نفاق" کے موضوعات پر بصیرت افروز تقاریر کیں۔ قیام اللیل کا بھی اجتماعی اہتمام کیا گیا جس میں آٹھ راتوں میں قاری عبد القادر صاحب نے پورا قرآن کریم ختم کرایا۔ راولپنڈی کی اس تربیت گاہ سے جہاں شرکاء کے دینی ذوق کو جلا ملی وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دار الحکومت میں دعوتِ قرآنی کا ایک حلقہ وجود میں آ گیا۔

دسمبر ۷۶ء میں انجمن کے مرکزی دفاتر کے قرآن اکیڈمی میں منتقل ہونے کے بعد ہر

سال پابندی سے مرکزی تربیت گاہ کا انعقاد قرآن اکیڈمی لاہور ہی میں ہوتا رہا- جو عموماً ہر سال اکتوبر یا نومبر کے مہینہ میں منعقد کی جاتی رہیں- ان تربیت گاہوں کا انعقاد تنظیم اسلامی اور انجمن کی مشترکہ مساعی سے کیا جاتا رہا اور اس میں تنظیم اسلامی اور انجمن کے جملہ وابستگان شرکت کرتے رہے- مربّی کی حیثیت سے اکثر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی فرائض انجام دیتے رہے- کبھی کبھار کسی تربیت گاہ میں رئیس بلدیہ حیدر آباد (سندھ) مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب کو بھی دعوت دی گئی- ان تربیت گاہوں میں جہاں پاکستان کے مختلف علاقوں کے تنظیم اسلامی اور انجمن کے وابستگان کو مل بیٹھنے اور باہمی تعارف اور تبادلۂ خیال کا موقع ملتا تھا وہاں صدر مؤسس انجمن اور امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے قرآن حکیم اور حدیث نبوی کے دروس سے استفادہ اور زندگی کے مختلف مسائل میں قرآن و سنت کی روشنی میں موصوف کا نقطہ نگاہ جاننے کا موقع بھی نصیب ہو جاتا تھا- طوالت مانع ہے ورنہ ان کی تفصیلات بھی ہدیہ قارئین کی جاتیں-

قرآن اکیڈمی

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ جس 'قرآن اکیڈمی' کا تصور ۱۹۶۷ء میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" میں پیش کیا گیا تھا اس کا سنگ بنیاد ۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۷۶ء کو رکھ دیا گیا ----- اس موقع پر دیگر حضرات کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب بھی موجود تھے جنہوں نے ان مقاصد میں کامیابی کی دعا فرمائی جن کے لئے اکیڈمی کا قیام عمل میں آ رہا ہے- سنگ بنیاد رکھے جانے کے فوراً بعد تعمیر کا کام نہایت تیزی سے شروع کر دیا گیا- چنانچہ دسمبر ۷۶ء میں انجمن کے مرکزی دفاتر سمن آباد لاہور کی کرایہ کی عمارت سے قرآن اکیڈمی میں منتقل ہو گئے- اب ایک بہت بڑا مرحلہ اس کی تعمیر کا تھا- چونکہ ۶ کنال پر مشتمل ایک قطعہ ارضی انجمن کے 'مؤسسین' ہی میں سے ایک صاحبِ خیر یعنی شیخ محمد عقیل صاحب کی جانب سے فراہم کر دیا گیا تھا (جو اس وقت تو -/۹۷۳۱۲ روپے کا خریدا گیا تھا لیکن آج کل اس کی مالیت ستر لاکھ روپے سے کم نہیں ہے-) لہٰذا زمین کی فراہمی کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تاہم جو نقشہ پیشِ نظر تھا اس کے لئے تعمیراتی اخراجات کے ضمن میں تیس چالیس لاکھ روپے کی خطیر رقم درکار تھی ----- بہر حال اللہ تعالےٰ کی مدد اور اس کی نصرت ہی کے بھروسے پر رہائشی کوارٹروں سے تعمیر کا آغاز کر دیا گیا- ان آٹھ کوارٹرز کی "تیار

چھتیں" انجمن کے صدر مؤسس کے ایک بھائی کی جانب سے بلا قیمت فراہم کر دی گئیں اور اس طرح تعمیر کے ابتدائی اخراجات کے ضمن میں بڑی سہولت حاصل ہو گئی - چنانچہ یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو صدر مؤسس اور بعض دوسرے کارکنانِ انجمن کی رہائش اور انجمن کے دفاتر قرآن اکیڈمی کی زیر تعمیر عمارت میں منتقل ہو گئے -

ایک محتاط اندازے کے مطابق قرآن اکیڈمی کی تعمیر پر آج تک -/۲۹۵۷۴۰۷ روپے کا زرِ کثیر خرچ ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ اصحاب خیر کے ذاتی انفاق کی بدولت ہوا ہے - اس میں ایک پیسہ بھی حکومت پاکستان یا کسی دوسرے ملک کی گرانٹ یا کسی عرب شیخ کے عطیات پر مشتمل نہیں ہے -

ا- 'دار المقامہ'

قرآن اکیڈمی کے ہاسٹل کی ابتدائی دو منزلیں مکمل ہوتے ہی بعض ایسے نوجوانوں کو قیام کی سہولت فراہم کر دی گئی جو..... لاہور کے مختلف کالجوں یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے چنانچہ الحمد للہ لگ بھگ ابتدائی پانچ سال قرآن اکیڈمی کے قیام کا ایک مقصد ضمنی طور پر اسی صورت میں پورا ہوتا رہا کہ شام کے اوقات میں ان نوجوانوں کے لئے "عربی زبان کی تحصیل اور مختلف تدریسی و تربیتی پروگراموں" کا اہتمام کیا جاتا رہا------

۲- معہد ثانوی

اسی طرح ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۰ء چند مڈل پاس طلبہ کو داخلہ کی سہولت فراہم کی گئی جو دو سال میں میٹرک کر لیں اور ساتھ ہی ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہو سکے - اس سلسلے میں صرف ایک Batch ہی لیا گیا اور بعد میں جب فیلوشپ اسکیم کے اجراء کے لئے زمین ہموار کرنے کا مرحلہ شروع ہوا تو معہد ثانوی کی اسکیم کو بند کر دیا گیا -

۳- شام کی عربی کلاسز

پنجاب یونیورسٹی ہاسٹلز کے عقب میں قرآن اکیڈمی کی تعمیر کے ضمن میں بنیادی شے جو پیش نظر تھی وہ یہ کہ پنجاب یونیورسٹی کے وہ طلباء جو ہاسٹلز میں مقیم ہوں اُن سے رابطہ کیا جائے اور اُن کی توجہات کو قرآن حکیم کی جانب منعطف کرانے کے لئے کوشش کی جائے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے گرمیوں کی تعطیلات میں خصوصاً اور بقیہ سال میں عموماً اب تک کثیر تعداد میں عربی کورسز کا اجراء ہو چکا ہے اور بے شمار افراد نے ان کلاسز سے استفادہ کیا -

۴-ہفتہ وار درسِ قرآن

اگرچہ قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد کا اصل ہال تین چار سال بعد تعمیر ہوا- تاہم اس کے تہ خانے میں ایک بڑا کمرہ جو 'لائبریری' کی غرض سے بنایا گیا تھا پنج وقتہ نماز باجماعت کی ادائیگی کے لئے مخصوص رہا------اسی عرصہ کے دوران اس بیسمنٹ کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ' کا ایک مفصل خطاب "قرآن فہمی کے اصول و مبادی" کے موضوع پر ہوا - اگرچہ بعد میں والدِ محترم کی شدید خواہش کے باوجود اپنی ناسازئ طبعیت کے باعث مولانا کسی 'قرآن کانفرنس' یا 'محاضرات قرآنیہ' میں شرکت نہ فرما سکے!

اسی لائبریری ہال میں انجمن کے صدر مؤسس کے ہفتہ وار درس کا آغاز بھی اس 'منتخب نصاب' سے فوراً کر دیا گیا تھا جو اس دعوت قرآنی کی اصل اساس ہے جسے انجمن لے کر چل رہی ہے- تاہم بعد میں وہ سلسلہ وار درس قرآن بھی جس کا آغاز ۱۹۶۰ء میں مسجدِ خضراء سمن آباد سے ہوا تھا اور جو بعد میں پہلے مسجد شہداء اور پھر مسجد دارالسلام باغ جناح میں منتقل ہو گیا تھا بیسمنٹ کی تعمیر مکمل ہوتے ہی قرآن اکیڈمی میں منتقل کر دیا گیا------اس درس قرآن کا دورانیہ ہمیشہ لگ بھگ دو گھنٹے پر محیط رہا اور الحمد للہ ثم الحمد للہ جنوری ۱۹۹۰ء میں یہ درس سورۃ قیامہ تک پہنچ گیا ہے-

۵-فیلوشپ اسکیم

قرآن اکیڈمی کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو علمی و فکری سطح پر قرآن حکیم کے علوم و معارف سے روشناس کرایا جائے' کیا عجب کہ چند نوجوان ایسے نکل آئیں جو اپنی زندگیاں "تعلیم و تعلّم" قرآن کے لئے وقف کر دیں ------ یکم جنوری ۱۹۸۲ء میں یہ خواب اس صورت میں شرمندۂ تعبیر ہوا کہ پانچ نوجوانوں نے اپنے آپ کو اس مشن اور بلند ترین نصب العین کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا جنہیں 'قرآن اکیڈمی' کے 'رفیق' یا فیلو (Fellow) قرار دیا گیا- ان پانچ نوجوانوں میں دو ڈاکٹر تھے' ایک ایم-اے فلسفہ' ایک ایم ایس سی بیالوجی' اور ایک ایم ایس سی کیمسٹری- بعد کے دو سالوں میں دو مزید نوجوان جن میں سے ایک ایم اے اسلامیات اور دوسرے ایم ایس سی (جیالوجی) تھے اس فیلوشپ اسکیم سے وابستہ ہو گئے-

مذکورہ بالا سات نوجوانوں میں سے الحمد للہ چار ابھی تک فیلوشپ اسکیم کے ساتھ وابستہ ہیں اور اپنی مقدور بھر سعی و جہد کے ساتھ "دعوت رجوع الی القرآن" کے قافلے میں شامل

ہیں - ایک ساتھی ڈاکٹر عبد السمیع صاحب جو ڈینٹل سرجن ہیں واپس فیصل آباد چلے گئے اور وہاں درس قرآن کے علاوہ 'تنظیم اسلامی' کی امارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں - ایک نوجوان ریاض الحق علم حیاتیات میں پی - ایچ ڈی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ان کو پنجاب یونیورسٹی میں 'ریسرچ اسکالر' کے طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی گئی' ------ البتہ ایک ساتھی کو عدم دلچسپی کے باعث فیلوشپ اسکیم سے علیحدہ کر دیا گیا -

فیلوشپ اسکیم کے اجراء کو لگ بھگ ساڑھے آٹھ برس بیت چکے ہیں لیکن الحمد للہ کہ اسکیم سے وابستہ نوجوانوں کی بیشتر صلاحیتیں اور اوقات "دعوتِ رجوع الی القرآن" کے لئے ہی وقف ہیں' خواہ قرآن کالج میں تدریس کی ذمہ داریاں ہوں خواہ انجمن خدام القرآن کی ایڈمنسٹریشن کا کام ہو' ------ خواہ حکمت قرآن اور میثاق کی ایڈیٹنگ ہو' خواہ لاہور کے طول و عرض میں پھیلے حلقہ ہائے دروسِ قرآن کی ذمہ داریاں ہوں' ------ الغرض جملہ رفقاء اکیڈمی اس ہمہ جہتی کام میں انجمن کے صدر مؤسس اور تنظیم اسلامی کے امیر کے دست و بازو ہیں اور اس طرح گویا "دعوتِ رجوع الی القرآن" کے قافلے کے ہمراہی بھی ہیں اور انقلاب اسلامی کے 'سپاہی' بھی!

۶۔ دوسالہ تعلیمی و تدریسی کورس

۸۵-۱۹۸۴ء میں انجمن کے زیر اہتمام ایک دوسالہ کورس کے اجراء کا اہتمام کیا گیا اور نوجوانوں کو اس کی جانب متوجہ کرنے کے لئے ماہنامہ 'حکمت قرآن' اور 'میثاق' سے بھرپور مدد کے علاوہ اخبارات میں اشتہارات کا مہنگا ذریعہ بھی اختیار کیا گیا -

مزید برآں' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ نے اتفاق رائے سے ایک بڑے پراجیکٹ کی منظوری دیدی اور وہ یہ کہ دوسالہ تعلیمی و تدریسی کورس کے بعض شرکاء کو جو ذہین بھی ہوں اور گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایشن کر چکے ہوں لیکن مالی طور پر مستحکم نہ ہوں علی الترتیب مبلغ ایک ہزار روپے اور آٹھ صد روپے ماہانہ اسکالرشپ دیا جائے ------ الحمد للہ کہ اس کے نتیجے میں کئی نوجوان جو ہماری دعوتِ رجوع الی القرآن کے ساتھ ذہنی و فکری مناسبت رکھتے تھے' اس اسکیم میں شامل ہوگئے -

اس مد میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور نے مبلغ دولاکھ پچاسی ہزار تین صد چھیاسٹھ (۲۸۵۳۶۶) روپے خرچ کئے -

الحمد للہ کہ اس دوسالہ تعلیمی و تدریسی کورس کو تین گروپوں نے خاطر خواہ کامیابی

کے ساتھ مکمل کیا اور تقریباً پچاس اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے بنیادی عربی قواعد کے علاوہ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب تفصیلی وضاحت کے ساتھ اور پورے قرآن حکیم کا قواعد کے اجراء کے ساتھ ترجمے کے علاوہ حدیث نبویؐ اور اصول حدیث' اور فقہ اور اصول فقہ کی بھی بنیادی معلومات کی تحصیل کی۔ ہماری دعا ہے کہ یہ سب آیہ مبارکہ: ——————

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ" (التوبۃ : ۱۲۳)

ترجمہ : اور کیوں نہ نکلی ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت تاکہ سمجھ حاصل کرے دین کی' اور پھر باخبر کرے اپنی قوم کو جبکہ ان کے پاس واپس جائے"

——————— اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس 'قول مبارک' کو اپنی زندگیوں کا مشن اور نصب العین بنالیں "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ' —

(دو سالہ کورس کے پہلے گروپ کے سال اول کی روداد انجمن کے صدر مؤسس نے خود اپنے قلم سے تحریر کی تھی جو اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے)

کچھ عرصے کے بعد محسوس ہوا کہ بہت سے نوجوانوں کے لئے دو سال نکالنا مشکل ہے' لہٰذا ایسے نوجوانوں کے لئے "مَالَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ" کے مطابق ایک سالہ کورس جاری کیا گیا جس سے کثیر تعداد میں نوجوان استفادہ کر چکے ہیں۔

ہم اس پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے کہ اس دور میں بھی نوجوانوں میں ایسی سعید روحیں موجود ہیں جو "تابناک مستقبل" کو تج کر تعلیم و تعلّم قرآن کو اپنی زندگی کا مشن بنالیں۔ اس ضمن میں ایک تازہ ترین مثال دوسروں کی حوصلہ افزائی کے لئے مفید ہوگی —— ایک نوجوان نے جو سر زمین امریکہ سے سٹرکچرل انجینئرنگ (Structural Engg.) میں ایم ایس سی کر کے حال ہی میں پاکستان واپس آئے تھے' میثاق اور حکمت قرآن میں ایک سالہ تعلیمی و تدریسی کورس کے بارے میں پڑھا تو اس میں شمولیت کے لئے لاہور پہنچ گئے : کورس کے تمام امتحانات امتیازی حیثیت میں پاس کئے اور اب چراغ سے چراغ روشن کرنے کے مصداق قرآن کالج اور ایک سالہ تربیتی کورس میں تدریس عربی کی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ اور اب فلسفہ میں ایم اے کا امتحان پاس کرنے کی تیاری کر رہے ہیں تاکہ حکمتِ قرآنی کو فلسفہ کی اعلیٰ سطح پر پیش کر سکیں اللّٰھم زِدْ فَزِدْ!

قرآن کالج اور آڈیٹوریم

۱۹۸۴ء میں انجمن کی مجلس منتظمہ میں قرآن کالج کے منصوبے کی تصویب کے بعد اس کے لئے قرآن اکیڈمی سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن میں ساڑھے پانچ کنال پر مشتمل ایک قطعہ زمین ایل ڈی اے سے سرکاری نرخ پر حاصل کیا گیا۔ اُس کی تعمیر کے ضمن میں باقاعدہ ٹینڈرز طلب کئے گئے اور بالآخر ایک کنسٹرکشن کمپنی کو قرآن کالج اور آڈیٹوریم کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔ ابتداءً تعمیر کا اندازہ ساٹھ لاکھ روپے کا تھا لیکن بعد میں لوہے، سیمنٹ اور دیگر سامانِ تعمیر کی قیمتوں میں اضافے کے باعث اصل لاگت بڑھتی چلی گئی۔ ان سطور کے رقم ہونے تک مبلغ -/۷۷۴۹۷۶۲ روپے کی خطیر رقم اس پراجیکٹ پر خرچ ہو چکی ہے اور ابھی آڈیٹوریم کی تزئین، فرنیچر اور ایئر کنڈیشننگ، اور ہاسٹل کی دو منزلوں کی تعمیر کا کام باقی ہے جس کے لئے کم از کم چالیس لاکھ روپے کی رقم مزید درکار ہے۔

ستمبر ۱۹۸۷ء میں قرآن کالج کی بی اے کلاسز کے لئے اخبارات کے ذریعے تشہیر کی گئی اور الحمدللہ کہ ۲۸ طلباء کے ساتھ تدریس کا کام قرآن اکیڈمی ہی میں شروع ہو گیا۔ تاآنکہ ستمبر ۱۹۸۹ء میں قرآن کالج کے تدریسی حصے کی حد تک تعمیر مکمل ہوتے ہی ان کلاسز کو نو تعمیر شدہ کیمپس میں منتقل کر دیا گیا۔

مئی ۱۹۸۹ء کے مجلس منتظمہ کے اجلاس میں ایک اور فیصلہ یہ کیا گیا کہ سالِ رواں سے F.A. کی کلاسز کا بھی اجراء کر دیا جائے ------ جس کے لئے مناسب تشہیر بھی کی گئی اور انٹرویو کے نتیجے میں F.A سال اول کے ۶۷ طلباء کو داخلہ دیدیا گیا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ قرآن کالج کیمپس میں F.A سال اول کے دو سیکشن، بی اے سال اول، سال دوم اور بی اے سال اضافی گویا بیک وقت پانچ کلاسز میں تعلیمی و تدریسی سرگرمیاں جاری ہیں۔

جامع مسجد جامع القرآن

جب تک قرآن اکیڈمی کی مسجد کا ہال تعمیر نہیں ہوا تھا باجماعت نماز زیر تہہ خانہ ہی میں

ادا کی جاتی تھیں اور قرآن اکیڈمی کے اجتماعات بھی اسی میں منعقد کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب نے اپنے دورۂ پاکستان کے موقع پر قرآن اکیڈمی کو بھی زینت بخشی اور زنانہ خانہ کے اس چھوٹے ہال میں خطاب فرمایا۔ ۸۰ء میں مسجد کا وسیع ہال تعمیر ہو گیا۔ اور نمازیں اسی ہال میں ادا کی جانے لگیں۔ البتہ جمعہ کی نماز کا اہتمام مارچ ۸۱ء سے شروع کیا گیا۔ "جامع القرآن" میں پہلا جمعہ مولانا عبد الغفار حسن صاحب نے ۲۷ مارچ ۸۱ء کو پڑھایا جو اس مقصد سے فیصل آباد سے تشریف لائے تھے۔ قبل ازیں صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے درسِ قرآن حکیم دیا۔ حاضری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ چنانچہ اس وقت ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ صدر مؤسس نماز جمعہ بدستور مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں پڑھاتے رہیں اس لئے کہ اگر موصوف نے یہاں جمعہ پڑھایا تو حاضرین کے لئے گنجائش نہیں ہو گی جب تک کہ بالائی ہال کی تعمیر نہ ہو جائے چنانچہ صدر مؤسس جمعہ کی نماز مسجد دار السلام میں پڑھاتے ہیں اور مسجد جامع القرآن میں نماز جمعہ انجمن سے متعلق مختلف حضرات پڑھاتے رہے ہیں ——— چنانچہ کچھ عرصہ برادرم حافظ عاکف سعید صاحب پڑھاتے رہے، پھر کافی عرصہ تک جناب عبد الرزاق صاحب یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ چند سال بعد مسجد کا بالائی ہال بھی تعمیر ہو گیا۔ حال ہی میں طے ہوا ہے کہ 'جامع القرآن' میں مستقل طور پر تو خطابت کے فرائض راقم الحروف ادا کرے۔ البتہ ہر انگریزی ماہ کا آخری جمعہ انجمن کے صدر مؤسس خود پڑھائیں گے!۔

مکتبۂ انجمن اور سمعی و بصری کیسٹ

اوائل ۶۶ء میں جب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مستقل طور پر لاہور منتقل ہوئے تو انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ "دار الاشاعت الاسلامیہ" قائم کیا۔ چونکہ اُس وقت کوئی اجتماعی شکل موجود نہ تھی اس لئے یہ ادارہ ان کا ذاتی ادارہ تھا۔ جس کے تحت "تدبرِ قرآن" جلد اول اور جلد دوم، "مبادی تدبّر قرآن"، "دعوت دین اور اس کا طریق کار" اور چند دیگر کتب اور کتابچے شائع کئے گئے۔ لیکن جب اللہ کے فضل و کرم سے ایک اجتماعی ادارہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے نام سے وجود میں آ گیا تو اس کے تحت ایک مکتبہ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جس نے دار الاشاعت اسلامیہ کی جگہ لے لی۔ مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے نہ صرف وہ تمام کتب شائع کیں جو اس سے قبل "دار الاشاعت اسلامیہ"

شائع کر رہا تھا بلکہ اس کا اشاعتی پروگرام وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا یکمشت ادائیگی کی بنیاد پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کی چند جلدوں اور ان کی دیگر تصنیفات نیز امام حمید الدین فراہیؒ کی مجموعہ تفاسیر فراہیؒ اور ان کی تصانیف کے ترجموں کے حقوق طباعت بھی حاصل کر لئے گئے جو چند سال بعد واپس کر دیئے گئے مکتبہ نے طباعت اور اشاعت کا اعلیٰ معیار پیش کر کے ہر حلقہ سے خراج تحسین وصول کیا۔ انجمن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تصانیف اور تالیفات کی ایک طویل فہرست ہے جو مکتبہ کے تحت شائع ہوتی ہیں۔ ماہنامہ 'میثاق' اور ماہنامہ 'حکمت قرآن' بھی الحمد للہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں ——— علمی و فکری مضامین کے اعتبار سے حکمت قرآن اور دعوتی اور تنظیمی نقطۂ نظر کے اعتبار سے ماہنامہ میثاق اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور اس سلسلۂ مطبوعات کے علاوہ 'جدید ذرائع ابلاغ کے ضمن میں سمعی اور بصری (آڈیو اور ویڈیو) کیسٹوں کی تیاری اور ترسیل و فروخت کا کام بھی مکتبہ انجمن ہی کے ذمّے ہے 'چنانچہ ایک محتاط اندازے کے مطابق مکتبہ کے قیام سے آج تک نصف کروڑ سے زائد رقم (۵۱۰۱۴۴۶) روپے کی کتب اور کیسٹس مکتبہ سے فروخت ہو چکے ہیں اور (۴۳۳۲۶۰) روپے کی کتب اور کیسٹس اسٹاک میں موجود ہیں۔

قرآن اکیڈمی کی متفرق سرگرمیاں

قرآن اکیڈمی سے منسلک بعض ایسے پراجیکٹس بھی ہیں جن کے ذکر کے بغیر اکیڈمی کی رپورٹ تشنہ رہ جائے گی۔ ان شعبہ جات کی بہت مختصر رپورٹ ہدیۂ قارئین ہے:

۱۔ شعبہ حفظ و تجوید

تقریباً پانچ سال قبل اگست ۱۹۸۵ء میں اس شعبہ کا اجراء عمل میں آیا تھا۔ الحمد للہ کہ یہ شعبہ بہت ہی احسن انداز میں خدمتِ قرآنی کے اس بابرکت باب میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے ——— زیر نظر سطور کے رقم ہونے تک ۳۳ طلباء حفظِ قرآن کی تکمیل کر چکے ہیں۔ داخلہ کے ضمن میں دو شرائط ہمیشہ پیشِ نظر رہتی ہیں ایک یہ کہ بچے کی عمر ۱۰ تا ۱۲ سال ہو اور دوسرے کم از کم پرائمری پاس کر چکا ہو۔ ان شرائط کے باعث الحمد للہ کہ عام ذہن رکھنے والا بچہ بھی زیادہ سے زیادہ دو سال میں حفظ کی تکمیل کر لیتا ہے۔ البتہ ایسی بھی متعدد مثالیں

موجود ہیں کہ ذہین اور خوش ذوق طلبہ نے ایک سال سے بھی کم میں حفظ کی تکمیل کرلی- ان میں سے صرف دو مثالیں درج کی جارہی ہیں ---ان میں سے ایک ڈاکٹر نیاز احمد صاحب (امریکہ) کے صاحب زادے محمد عاصم نے کل ساڑھے گیارہ ماہ میں قرآن حکیم حفظ کرلیا تھا اور دوسری شیخ علاؤالدین (کیو' گلبرگ' لاہور) کے صاحب زادے محمد احمد کی ہے جس نے حال ہی میں حفظ کی تکمیل کی ہے اور اس میں کل پانچ ماہ سکول (بیکن ہاؤس) کی تعلیم کے ساتھ اور مزید صرف دس ماہ کی مدت صرف کی ہے- ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ - بعض مستحق طلباء کے قیام و طعام کے ضمن میں انجمن نے اب تک زکوٰۃ کی مد میں سے ایک لاکھ سے زائد رقم خرچ کی ہے-

۲-خط و کتابت کورس

جنوری ۱۹۸۸ء میں اس کورس کا اجراء کیا گیا-الحمدللہ کہ تین صد چودہ (۳۱۴) افراد کو اس کورس کے ذریعے قرآن حکیم کے علوم و معارف سے روشناس کرایا جارہا ہے جن میں سے ۱۵ افراد یہ کورس مکمل کر چکے ہیں- قرآن حکیم کا منتخب نصاب اور بعض دیگر کتب کورس میں شامل ہیں- اس کورس پر اب تک ایک لاکھ تراسی ہزار تین صد تینتالیس روپے خرچ کئے گئے ہیں جن میں سے ایک لاکھ تین ہزار ایک صد چھتر روپے' بسلسلہ واجبات کورس شرکاء سے وصول کئے- گویا کل مبلغ اسی ہزار پانچ صد اڑسٹھ روپے' انجمن کی جانب سے خرچ کئے گئے ہیں-

۳-قرآن اکیڈمی جنرل کلینک

فیلوشپ اسکیم میں ابتداء ہی سے جو پانچ نوجوان شریک ہوئے تھے اُن میں سے ایک ایم بی بی ایس (راقم الحروف) اور ایک بی ڈی ایس ڈینٹل سرجن ڈاکٹر عبدالسمیع تھے------ لہٰذا اس خیال سے کہ چار پانچ سال کی جو طبّی تعلیم انہوں نے حاصل کی ہے اُس سے جو استفادہ اور افادہ ہوسکتا ہو کرنا چاہیے' جنرل کلینک اور ڈینٹل کلینک کا قیام عمل میں آیا- جنرل کلینک تو گزشتہ سات سال سے معمولی ادائیگی کے عوض گردو پیش کے رہنے والوں کو طبّی سہولتیں فراہم کر رہا ہے البتہ ڈینٹل کلینک ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب (سابق فیلو قرآن اکیڈمی) کے فیصل آباد نقل مکانی کر جانے کے باعث بند کر دیا گیا ------ایک صاحبِ خیر کی جانب سے 'امراض چشم' سے متعلق آلات فراہم کر دئے گئے تھے لہٰذا امراضِ چشم کے آؤٹ ڈور مریض دیکھنے کا اہتمام بھی موجود ہے- ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۹ء کے دوران جنرل کلینک

کا گوشوارہ درج ذیل ہے :

۱- کل رقم جو انجمن نے ادویات وغیرہ پر خرچ کی -/۲۳۹۸۹۷ روپے

۲- وہ رقم جو مریضوں سے وصول کی گئی -/۱۰۵۷۵۷ روپے

رقم جو انجمن نے خرچ کی -/۱۳۴۱۴۰ روپے

۴-مقابلہ مضمون نویسی

مختلف موضوعات پر نوجوانوں کے اندر مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً "مقابلہ مضمون نویسی" کا اہتمام بھی قرآن اکیڈمی کے تحت ہوتا رہتا ہے اور اول اور دوم آنے والے طالب علم کو دس ماہ کے لئے مبلغ ایک سو روپیہ ماہانہ اسکالرشپ دیا جاتا ہے اور اگلی پانچ پوزیشنز کے حامل طلباء کو مبلغ پچاس' پچاس روپے ماہانہ اسکالرشپ دیا جاتا ہے-

۵-قرآنک ورکشاپس

نوجوان طلباء میں قرآن حکیم سے ذہنی مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے سال بہ سال قرآنک ورکشاپس کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پچھلے سال ایک اسلامک جنرل ورکشاپ ۱۸ جولائی سے شروع ہو کر ۱۰ اگست ۸۹ء تک جاری رہی ______ واقعہ یہ ہے افادیت کے لحاظ سے یہ ورکشاپ بہت کامیاب رہی- اور آخری روز طلباء کے جو تاثرات ہمیں موصول ہوئے وہ انتہائی حوصلہ افزاء تھے- انشاء اللہ آئندہ کے مستقل پروگراموں میں ان ورکشاپس کا اہتمام پیش نظر رہے گا- ان بیس ایام میں تجوید و تصحیح قراءت سے لے کر قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا ایک خلاصہ شرکاءِ ورکشاپ کے سامنے نکھر کر آ گیا-

۶-دارالمطالعہ اور بیرونی سیل کاؤنٹر

دفتری اوقات کے بعد مکتبہ انجمن کی کتب سے استفادے کی خاطر قرآن اکیڈمی ہی میں ایک 'دارالمطالعہ' قائم کیا گیا- تین سال سے روزانہ 'عصر تا عشاء' یہ دارالمطالعہ کھلا رہتا ہے- باقاعدہ ممبر شپ نظام کے تحت لگ بھگ تین صد ممبرز کتابیں اور کیسٹس (آڈیو+ویڈیو) کو ایک ہفتہ کے لئے اپنے نام جاری کروا لیتے ہیں------ ان اوقات میں انجمن کی مطبوعات کی فروخت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے-

۷-لائبریری

قرآن اکیڈمی لائبریری کے قیام کا مقصد اکیڈمی کے طلباء' اساتذہ' ریسرچ اسکالرز اور وابستگان انجمن اور تنظیم کے لئے علمی مواد کی فراہمی ہے- یہ لائبریری قرآن اکیڈمی کے تہہ

خانے میں ۱۹۸۶ء سے کام کر رہی ہے ----- لائبریری میں اس وقت کتب کی کل تعداد ۴۰۶۷ ہے - سال ۸۹ء کے دوران ۴۳۶ کتب کا اجراء عمل میں لایا گیا جبکہ لاتعداد حضرات نے لائبریری میں آکر کتب اور رسائل سے استفادہ کیا-

لائبریری میں موصول ہونے والے سالانہ ' ششماہی ' دوماہی ' ماہانہ ' پندرہ روزہ اور ہفت روزہ رسائل و جرائد کی مجموعی تعداد ۱۳۰ سے زائد ہے - اور ان تمام کا مکمل ریکارڈ رکھا جاتا ہے-

لائبریری میں وقتاً فوقتاً دینی و علمی موضوعات پر مبنی ویڈیو فلمیں دکھانے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے-

عام دعوتی سرگرمیاں

اگر والدِ محترم کی انجمن کے قیام سے آج تک دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کی ایک رپورٹ مرتب کرنا ہو تو اس کے لئے بلا مبالغہ کئی ہزار صفحات پر مشتمل ایک ضخیم تصنیف درکار ہو گی ----- اس ضمن میں ان کے جذبے اور جوش و خروش کا عالم بعینہٖ وہی رہا ہے جو فیض کے ان اشعار سے ہویدا ہے۔

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا - تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں ' راحتِ تن ' صحتِ داماں - سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

اور صورت یہ نہیں کہ یہ کیفیت صرف ابتداء کے پانچ چھ سال ہی رہی ہو بلکہ آج بھی " اگر سورۃ العصر " کا درس دینا ہو تب بھی شوق اور لگن اور مخاطب کو قائل (Convince) کرنے کا وہی جذبہ نظر آتا ہے جو آج سے ۲۴ سال پہلے تھا - حالانکہ بلا مبالغہ سورۃ العصر کا درس انہوں نے سینکڑوں مرتبہ دیا ہو گا - اسی طرح کل ۲۴ صفحات پر مشتمل کتابچہ " اسلام کی نشأۃ ثانیہ " بھی بیسیوں مرتبہ پڑھانے کے باوجود حال ہی میں ایک سالہ کورس کے طلباء کو جن کی تعداد ۱۸ سے زیادہ نہیں ہے ' یہ کتاب پڑھانے کا موقع ملا تو اس طرح ڈوب کر پڑھایا کہ چار دن میں تقریباً دو گھنٹے روزانہ کے لیکچر سے اس کی تکمیل ہوئی - ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ط

۱- خطبات جمعہ

ہمارے دین میں عوام کے اذہان کو قرآنی تعلیمات کی جانب موڑنے اور ذہنی و فکری تطہیر کے ضمن میں 'جمعۃ المبارک' کے خطاب کی بہت اہمیت ہے - ہر وہ شخص جس کا کچھ تعلق بھی 'اسلام' کے ساتھ ہے وہ کم از کم جمعہ کی نماز یا اس سے متصل تقریر کا آخری حصہ ضرور سنتا ہے - اب یہ ہمارے 'خطباء اور علمائے دین' کی ذمہ داری ہے کہ وہ قصہ کہانیوں ------ یا گروہی تعصبات کے فروغ کی بجائے "صحیح اسلامی روح" پیدا کرنے کی کوشش کریں - والد محترم کے خطبات جمعہ کا آغاز لاہور میں مسجد خضراء سمن آباد سے ۱۹۶۸ء میں ہوا۔ جہاں بالکل آغاز ہی میں "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے عنوان سے دو تفصیلی خطاب ہوئے، جنہیں بعد میں ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا جو بلاشبہ دعوتِ رجوع الی القرآن کے ضمن میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے - مسجد خضراء میں خطاب جمعہ کا سلسلہ تقریباً دس سال تک یعنی ۱۹۷۷ء تک جاری رہا - اور اس زمانے میں پورے شہر میں ایک یہی مسجد تھی جس میں نماز جمعہ ادا کرنے اور خطبہ جمعہ سننے کے لئے باذوق حضرات لاہور کے دور دراز گوشوں کے علاوہ بیرون لاہور سے بھی آتے تھے۔

'مسجد دارالسلام لاہور' میں خطاب جمعہ کا آغاز ۷۷ء میں ہوا - کرنل سلامت اللہ مرحوم و مغفور کی شدید خواہش کا احترام کرتے ہوئے والد محترم نے اس مسجد میں جمعہ کے خطابات کا ذمہ لیا - یہ خطابات انتہائی باقاعدگی کے ساتھ لگ بھگ ڈیڑھ پونے دو گھنٹے دورانئے پر محیط ہوتے ہیں - ان میں صرف درسِ قرآن پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ملک و ملت کو درپیش مسائل اور ان کے صحیح 'حل' کی نشان دہی کی جاتی ہے - جمعۃ المبارک کے دن ساڑھے گیارہ بجے سے ڈیڑھ بجے تک اس مسجد میں جو رونق رہتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اگرچہ لگ بھگ دو ڈھائی ہزار نمازیوں میں سے بڑی تعداد ان کی بھی ہوتی ہے جو تقریر کے آخری نصف گھنٹہ یا بیس منٹ میں شریک مجلس ہوتے ہیں لیکن دور دراز کے مقامات سے 'درس قرآن' کو سننے یا درپیش صورت حال میں والد محترم کی رائے معلوم کرنے کے لئے ابتداء ہی سے شریکِ محفل رہنے والے بھی سینکڑوں میں ہوتے ہیں -

یہی معاملہ 'خطبات عید' کا بھی ہے - چنانچہ اول وقت میں نماز عید کی ادائیگی اور بعد میں نصف یا پون گھنٹے کے خطاب کو سننے کے لئے 'باغ جناح' میں لوگوں کا ہجوم 'قابل دید' ہوتا ہے - اندازہ یہ ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں شرکاء تو نماز فجر کے فوراً بعد ہی باغ جناح کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں تاکہ 'ڈاکٹر صاحب' کے نزدیک جگہ پاسکیں!

۲-منہج انقلاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

"اسلامی انقلاب اور اس کے تقاضے" اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے "منہج انقلاب نبوی" یعنی طریق انقلاب اسلامی کا استنباط وہ موضوع ہے جو ہمیشہ سے والد محترم کے پیش نظر رہا ہے- لہٰذا جب کبھی سیرت النبی کے جلسوں یا مجلسوں سے خطاب کرنے کا موقع میسر آیا تو وہ صرف فضائل و مناقب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ سیرت مطہرہ کے حوالے سے اسی دعوتی اور انقلابی جذبے کی آبیاری کی امکانی کوشش کرتے ہیں جو اگر اللہ تعالےٰ کو منظور ہوا تو عالمگیر اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے-

یوں تو سیرت النبیؐ کے موضوع پر تقریروں کا آغاز والد محترم کے اوائل عمری سے ہو گیا تھا، پھر جیسے کہ پہلے بیاں ہو چکا ہے قرآن اکیڈمی کے قیام اور وہاں رہائش اختیار کرنے کے فوراً بعد گویا ۱۹۷۸ء کو تو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے "سیرت النبیؐ کا سال" کی حیثیت حاصل ہے - اس کے بعد جب مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب نے سیرت کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا تو ۷۹ء تا ۸۳ء ملک کے طول و عرض میں بلا مبالغہ سینکڑوں تقاریر والد محترم نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر کیں- جن کے دوران خود ان کے بقول سیرت مطہرہ کے بہت سے گوشے ان پر پہلی بار منکشف ہوئے- چنانچہ ۱۹۸۴ء کے اواخر میں مسجد دار السلام باغ جناح میں سیرت النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کردہ "انقلابِ اسلامی کا منہج" کے موضوع پر گیارہ تقاریر ہوئیں- بعد میں یہی خطابات 'منہج انقلاب نبویؐ' کے عنوان سے مکتبہ انجمن نے تین صد چوراسی (۳۸۴) صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع کئے- اس کو مرتب کرنے میں ہمارے بزرگ رفیقِ کار جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی شب و روز کی محنت شامل ہے- ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ شیخ صاحب موصوف کی اس گراں قدر محنت کو قبول فرمائے، انہیں صحت سے نوازے اور آخرت میں ان کو بہترین اجر و ثواب عطا فرمائے (آمین)- اس لئے کہ ان خطابات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا کام اس قدر مشکل کام ہے کہ دانتوں پسینا آتا ہے- فَجَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرَ الْجَزَاءِ -

۳-نماز تراویح کے ساتھ دورہ ترجمہ قرآن

سمن آباد سے قرآن اکیڈمی میں منتقل ہونے کے بعد سے الحمد للہ کہ شاید ہی کوئی ماہِ رمضان المبارک ایسا گزرا ہو جس کے دوران قیام اللّیل یا تراویح میں پڑھے جانے والے

حصے کی مختصر تشریح کا سلسلہ جاری نہ رہا ہو - پانچ سال قبل یہ معاملہ اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچ گیا جب نماز تراویح کے ساتھ کامل دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام شروع ہوا ------ یہ قرآن حکیم کے اعجاز ہی کا ایک پہلو ہے کہ نماز عشاء سے صبح سحری کے وقت تک پورے ماہ مبارک کے دوران لگ بھگ دو صد یا ڈھائی صد اور شب جمعہ کو' اور آخری عشرے میں پانچ صد سے زائد افراد (جن میں اچھی بھلی تعداد خواتین کی بھی شامل ہوتی ہے) کامل دلجمعی کے ساتھ قرآن حکیم کے بیان کو سنتے رہتے ہیں - اوسطاً ساڑھے تین گھنٹے روزانہ کا 'بیان القرآن' اور لگ بھگ دو گھنٹے جو نماز تراویح اور فرض نماز کی ادائیگی میں صرف ہوتے ہیں اور اگر گھر سے آمد و رفت کا وقت بھی شامل کریں تو لگ بھگ ساڑھے چھ گھنٹے روزانہ رات کو جاگنے کا پروگرام اور وہ بھی دن کے اوقات میں دفتری اور کاروباری امور کی انجام دہی کے ساتھ ، یہ اللہ تعالےٰ کے اس کلام پاک کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے ؟ - مزید بر آں دن میں روزے کی مشقت اور بھوک پیاس برداشت کرنے اور افطاری کے بعد طبیعت میں ایک نوع کی کسل مندی اور استراحت کی جانب رجحان کا پایا جانا ایک طبعی امر ہے - لیکن قرآن حکیم کے بیان میں وہ حلاوت اور مقناطیسیت موجود ہے کہ ایک عام فہم انسان بھی اس کے ساتھ ایک لگاؤ اور دلچسپی محسوس کرتا ہے - جنہوں نے بھی ماہِ رمضان المبارک کی راتیں اس کیفیت کے ساتھ بسر کی ہیں ان کا بیان جو عموماً سننے میں آیا وہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی مدت میں پورے قرآن حکیم میں سے "گزر" جانا اور وہ بھی آیات کے باہمی ربط اور ہر سورت کے مرکزی مضمون کی وضاحت ایک ایسا تجربہ ہے جس کی اثر آفرینی اور حلاوت و شیرینی بیان سے باہر ہے ؏ "لذت ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی" !

اس 'دورۂ ترجمہ قرآن' کو آڈیو کیسٹ میں تو بہت پہلے محفوظ کر لیا گیا تھا - ۱۹۸۸ء کے رمضان المبارک میں اسے ویڈیو کیسٹس پر بھی محفوظ کر لیا گیا - اور اس کی ایک صد سے زائد کاپیاں چند ماہ ہی میں نکل گئیں - ۳۰ عدد ویڈیو کیسٹس کا سیٹ جس کا ہدیہ مبلغ پانچ ہزار دو صد پچاس روپے بنتا ہے اتنی بڑی تعداد میں نکل جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ دورۂ ترجمہ قرآن کا یہ پروگرام نہ صرف تذکیر بالقرآن بلکہ خود تعلیم قرآن کے اعتبار سے انتہائی افادیت کا حامل ہے --- وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

۴- کتابچوں کی مفت تقسیم

انجمن کی جانب سے صدر مؤسس کے کتابچے طبع کرا کے مختلف موقعوں پر لوگوں میں تقسیم کئے جاتے رہے ہیں - رمضان المبارک کے موقع "روزہ اور قرآن" سے متعلق

رسولؐ اکرم کا خطبہ (جو رمضان کی آمد پر ارشاد فرمایا گیا) ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر لاہور اور کراچی میں تقسیم کیا گیا- یہ کتابچہ کئی سال تقسیم کیا گیا- اسی طرح عید الاضحیٰ کے موقع پر صدر مؤسس کا مضمون "حج اور عید الاضحیٰ اور ان کی اصل روح قرآن حکیم کے آئینہ میں" ہزاروں کی تعداد میں کتابچہ کی صورت میں چھپوا کر مفت تقسیم کیا جاتا رہا- صدر مؤسس کا ایک اور مضمون "انقلاب نبوی کا اساسی منہاج" بھی چھپوا کر مفت تقسیم کیا گیا- ایک صاحبِ خیر کے تعاون سے مکتبہ انجمن کی جانب سے شائع کردہ کتب "دعوت الی اللہ" اور "راہ نجات" دس دس ہزار کی تعداد میں چھپوا کر تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع منعقدہ رائے ونڈ میں حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" دو ہزار کی تعداد میں اور "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ایک ہزار نسخے مفت تقسیم کئے گئے - مختلف اوقات میں ایسے دوورقے بھی شائع کئے گئے-

۵- اخبارات میں مضامین

ابلاغ عامہ کا ایک اہم ذریعہ اخبارات ہیں- ان میں جو چیز شائع ہوتی ہے وہ ان کے لاکھوں قارئین تک پہنچتی ہے- اس ذریعہ ابلاغ سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی اور صدر مؤسس کے اہم مضامین ان میں شائع کرائے گئے - مضامین کی اگر فہرست دی جائے تو وہ بہت طویل ہو جائے گی مختصراً یہ ہے کہ پاکستان کے تمام قومی اردو وانگریزی اخبارات جنگ' نوائے وقت' مشرق' جسارت' وفاق' امروز' پاکستان ٹائمز' ڈان اور مسلم میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صاحب کے مضامین شائع ہوتے رہے - کراچی کے انگریزی روزنامہ "ڈان" میں تو ڈاکٹر صاحب کا مضمون "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" قسط وار شائع ہوتا رہا- پاکستان کے متعدد رسائل و جرائد میں بھی صدر مؤسس کے مضامین شائع ہوتے رہے- بیرون ملک انگریزی ہفت روزہ ریڈینس (Radiance) جو جماعت اسلامی ہند کا پرچہ ہے' میں بھی ڈاکٹر صاحب کے متعدد مضامین شائع کرائے گئے - اسی طرح رابطہ عالم اسلامی کے ترجمان ماہنامہ "Journal" مکہ مکرمہ میں بھی صدر مؤسس کے کئی مضامین شائع ہوئے' بعد ازاں روزنامہ "جنگ" کے جملہ ملکی اور غیر ملکی ایڈیشنوں میں جناب صدر مؤسس کی دو کتابیں "استحکام پاکستان" اور "مسئلہ سندھ" شائع ہوئیں اور پھر ایک عرصہ تک مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے اسباق شائع ہوتے رہے-

۶- ریڈیو اور ٹیلی وژن

ٹیلی وژن کے آجانے کے بعد گو ریڈیو کی اہمیت اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے لیکن اب

بھی دور افتادہ مقامات یعنی دیہات جہاں ملک کی کثیر آبادی رہتی ہے اور بیرونی ممالک میں ہماری آواز ریڈیو ہی کے ذریعہ پہنچتی ہے۔ چنانچہ ریڈیو پر تقاریر اور درس قرآن کے لئے صدر مؤسس کو دعوت دی جاتی رہی اور موصوف نے بعض مرتبہ "قرآن حکیم اور ہماری زندگی" کے ہفتہ وار پروگرام میں پوری پوری سہ ماہی درس قرآن دیا۔ اس سلسلہ میں سورۂ انفال، سورۂ اعراف اور سورۂ انعام کے بعض مقامات زیر درس رہے۔ "قرآن حکیم کی سورتوں کے پہلے تین گروپوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ" پندرہ نشری تقریروں میں کیا گیا۔ ان کے علاوہ حضرت عثمان غنیؓ، الحیاء شعبۃ من الایمان، اسلام کی عیدیں، نبی اکرم بحیثیت منتظم، صراط مستقیم، آیۃ الکرسی، انفاق فی سبیل اللہ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اسی طرح کے دیگر عنوانات پر تقاریر کی گئیں۔

ذرائع ابلاغ میں سب سے اہم ذریعہ ٹیلی وژن ثابت ہوا ہے۔ ٹیلی وژن پر صدر مؤسس کا سب سے پہلا پروگرام "الکتاب" کے عنوان سے ۷۸ء کے رمضان المبارک میں شروع ہوا۔ اس تیس روزہ پروگرام میں محترم صدر مؤسس روزانہ مختصر وقت میں ایک پارہ کا خلاصہ نہایت سلیس اور دلنشین انداز میں پیش فرماتے تھے۔ صدر مؤسس کو جب اس پروگرام کی دعوت دی گئی تو موصوف کو ٹیلی وژن پر پروگرام پیش کرنے پر تردّد تھا اور آپ نے انکار کر دیا تھا لیکن انجمن کی مجلسِ منتظمہ کے اصرار پر قبول کیا۔ الحمد للہ یہ پروگرام اس قدر مقبول ہوا کہ ٹیلی وژن کے اربابِ اختیار نے دوسرے سال رمضان المبارک میں دوبارہ اسے ٹیلی کاسٹ کیا۔ ۸۰ء کے رمضان المبارک میں روزانہ صدر مؤسس نے "الٓمٓ" کے زیر عنوان پروگرام پیش فرمایا۔ یہ پروگرام دراصل حروفِ مقطعات سے شروع ہونے والی سورتوں کے دروس پر مشتمل تھا۔ ۸۱ء میں صدر مؤسس کے قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل دروسِ قرآن کا مشہور پروگرام "الہدٰی" شروع ہوا۔ اس کا آغاز اپریل ۸۱ء کے آخری ہفتے سے ہوا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن اپنی پوری تاریخ میں اس سے بہتر پروگرام پیش نہیں کر سکا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس وقت یہ ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا پورے پورے گھرانے اپنے تمام کام کاج سے قبل از وقت فراغت حاصل کر کے اس کے انتظار میں ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی زندگیوں میں اس پروگرام سے انقلاب آ گیا۔ یہ سب اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم تھا۔ لیکن الحاد و بے دینی کی قوتوں، مغربی تہذیب کے متوالوں، سرخ سویرے کے پجاریوں اور حاسدین و معاندین کو یہ کب گوارا تھا چنانچہ اس پروگرام کو بند کرانے کے

لئے اندرون خانہ سازشیں شروع کر دی گئیں اور افسوس کہ اس پروگرام کے حق میں زبردست عوامی ردِّ عمل کے باوجود سازشیں کامیاب ہو گئیں اور یہ پروگرام جون ۸۲ء میں بند کر دیا گیا جب کہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب نصف باقی تھا۔

ان کے علاوہ بھی صدر مؤسس کے متعدد پروگرام ٹیلی کاسٹ کئے گئے۔ جنوری ۸۱ء میں ماہ ربیع الاول کے ابتدائی بارہ روز "رسول کاملؐ" کے عنوان سے بارہ تقاریر کی گئیں۔ "ام الکتاب" کے زیر عنوان تین تقاریر ہوئیں۔ اکل حلال' بنیادی حقوق' حی علی الصّلوٰة' اسماءِ ربّانی' القرآن اور اسی طرح کے دیگر عنوانات کے تحت صدر مؤسس کی متعدد تقاریر ٹیلی کاسٹ ہوئیں۔

۷۔ شامِ الہدٰی۔ کراچی

ستمبر ۸۴ء سے تاج محل ہوٹل کراچی کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں ہر انگریزی مہینے کے آخری سوموار کو پاکستان ٹیلی وژن کے مذہبی پروگراموں کے سلسلے "الہدٰی" کے عنوان سے درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس میں شائقینِ علم قرآن اتنی کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سے زائد افراد کی گنجائش ہونے کے باوجود آڈیٹوریم کا وسیع و عریض ہال تنگیٔ داماں کا شکوہ کرتا نظر آتا تھا۔ جب تمام راہداریاں اور راسٹیج کی خالی جگہ بھی پر ہو جاتی تھی تو بہت سے لوگوں کو مایوس لوٹنا پڑتا تھا ------ یہ اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس کتاب عزیز کو سمجھنے کی غرض سے اتنی بڑی تعداد میں پڑھے لکھے لوگ جمع ہوتے رہے اور تین ساڑھے تین گھنٹے کی طویل نشست میں ہمہ تن او رہمہ گوش ہو کر قرآن حکیم کے درس کی سماعت فرماتے رہے۔

شامِ الہدٰی کراچی کی افادیت کو دیکھتے ہوئے واپڈا آڈیٹوریم لاہور میں شامِ الہدٰی لاہور کا ماہانہ درس قرآن کا پروگرام شروع کیا گیا جو کراچی ہی کی طرح انتہائی کامیاب رہا۔

۸۔ کیمونٹی سنٹر اسلام آباد

اسی طرح اسلام آباد کے مرکزی حصے میں واقع کیمونٹی سنٹر کے وسیع و عریض ہال میں ہر ماہ کے پہلے سوموار کو دروس قرآن کے پروگرام شروع کئے گئے۔ اسلام آباد میں جو "بیورو کریٹس کا شہر" کے نام سے پہچانا جاتا ہے' ان پروگراموں میں اوسطاً چار پانچ صد اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات یکسوئی کے ساتھ سماعت فرماتے تھے۔ ایسا شہر' جہاں درس قرآن کے عنوان سے کسی جگہ چالیس پچاس افراد کا جمع ہونا بھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا' اہالیانِ اسلام آباد کے لئے بہت ہی انوکھی بات تھی اور وہاں کے دینی حلقوں میں اسے ایک نیک شگون سمجھا گیا۔

۹ - ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج اور "نیپا"

پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج اور "نیپا" (NIPA) کے تربیتی پروگراموں میں کچھ لیکچر زدینی موضوعات پر بھی شامل ہوتے ہیں - ان دونوں اداروں کے ماہانہ یا سہ ماہی پروگراموں میں انجمن کے صدر مؤسس بڑی باقاعدگی کے ساتھ حاضری دیتے رہے - تقریباً تین چار گھنٹے پر محیط ان پروگراموں میں لیکچر کے علاوہ سوال جواب اور دین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کھلے دل سے موقع ہوتا تھا - چنانچہ ان پروگراموں میں شریک ہونے والے بہت سے اعلیٰ افسروں کے خطوط موصول ہوتے رہے کہ دین کی بعض حقیقتوں کو جس انداز میں ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا اس کی نظیر نہیں مل سکی- ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؎

؎ ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ -

۱۰ - بیرون ملک سفر

جولائی ۱۹۷۹ء میں والد محترم کا پہلا تبلیغی سفر سرزمینِ امریکہ کا ہوا - وہاں پر اقامت گزیں ہونے والے بہت سے پاکستانی تعطیلات وغیرہ میں پاکستان آمد پر والد محترم کے دروسِ قرآن میں شرکت کرتے رہے تھے چنانچہ ان کی جانب سے امریکہ کا سفر کرنے کی پُرزور دعوت موصول ہوئی تھی ---- امریکہ کے اس پہلے سفر نے وہاں پر موجود برّصغیر کے پڑھے لکھے مسلمانوں میں ایک خوشگوار تاثّر چھوڑا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۷۹ء کے بعد سے سوائے ایک سال کے ہر سال امریکہ و کینیڈا کا سفر ہوتا رہا - اور ایک سال کے ناغے کا 'جرمانہ' اس شکل میں ادا کرنا پڑا کہ ------ ایک سال دوبار جانا پڑا - بھارت کے شہر حیدر آباد دکن کے مسلمانوں کی بڑی تعداد بھی امریکہ میں آباد ہے - ان حضرات نے حیدر آباد دکن میں موجود اپنے اعزّہ و اقارب کو والد محترم کے امریکہ کے دروس کے آڈیو کیسٹس ارسال کئے جو بہت ذوق و شوق سے سنے گئے - جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حیدر آباد (دکن) سے پُرزور تقاضا آ گیا اور یوں وہاں بھی دعوت رجوع الی القرآن کی تخم ریزی کے مواقع فراہم ہو گئے - ۸۴ء سے ۸۹ء تک بھارت کے چار بھرپور تبلیغی دورے ہو چکے ہیں -

ریاست ہائے امریکہ و کینیڈا ہی سے بعض حضرات نے والد محترم کے کیسٹس ابو ظہبی ارسال کئے - وہاں بھی دین کا درد رکھنے والے حضرات کے سامنے 'قرآن حکیم' کے بیان کا ایک نیا اسلوب سامنے آیا؛ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۸۰ء دسمبر میں ابو ظہبی میں مقیم

مسلمانانِ پاک و ہند کی جانب سے شدید تقاضے کے نتیجے میں 'المرکز الباکستانی' کے وسیع و عریض ہال میں مسلسل نو روز تک دروسِ قرآن اور خطابات کی محافل ہوتی رہیں۔ چونکہ ان محافل کے ویڈیو کیسٹس تیار کروا لئے گئے تھے' لہٰذا بعد میں ان ویڈیو کیسٹس کا سیٹ حد درجہ مقبول ہوا اور اس کی قبولیت کی صدائے بازگشت وقتاً فوقتاً سننے میں آتی رہتی ہے۔

ایک پندرہ سالہ میٹرک پاس نوجوان کی حیثیت سے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرتے وقت جو پاک ہند سرحد والد محترم نے ۱۹۴۷ء میں عبور کی تھی' اسے دوبارہ پاکستان سے بھارت کے پہلے سفر کے وقت پورے ثلث صدی بعد یعنی ۱۹۸۰ء میں عبور کیا۔ اور اس کے بعد بھی دو ایک سفر مزید ہوئے تاہم والد محترم کے بھارت کے تبلیغی دوروں کا آغاز ۱۹۸۴ء میں ہوا۔ اس کے بعد بعض موانع کے باعث ہر سال تو یہ دورہ نہیں ہو سکا اگرچہ اس کا شدید تقاضا بالخصوص حیدر آباد دکن کے احباب کی جانب سے جاری رہا البتہ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء تک کے عرصہ کے دوران 'والد محترم' نے بھارت کے چار بھرپور دورے کئے۔ جن کے دوران زیادہ قیام اور سب سے زیادہ پر ہجوم پروگرام تو حیدر آباد دکن ہی میں ہوئے البتہ دہلی' علی گڑھ' مدراس' بنگلور وغیرہ میں بھی کئی اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا۔ جن کے ذریعے قرآن کی دعوتِ انقلاب صنم خانۂ ہند میں بھی گونجی۔ کیا عجب کہ اللہ تعالےٰ اس سر زمین کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی خوش آئند پیشین گوئیوں کے پورا ہونے میں اس دعوت قرآنی کی تاثیر کو بھی شامل فرما دے۔ وماذالک علی اللہ بعزیز۔

ضمیمہ

★

"مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق

دعوت رجوع الی القرآن

کے ضمن میں 'حرکت و برکت' کے چند نمونے

★

۱۔ ششماہی رپورٹ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن، کراچی (شائع شدہ 'میثاق' جولائی ۷۲ء)

۲۔ 'رفتارِ کار' (شائع شدہ 'میثاق' مارچ ۷۷ء)

۳۔ روزنامچہ اشعار، ۲۸ دسمبر ۸۱ء تا ۲۸ جنوری ۸۲ء (شائع شدہ 'میثاق' مارچ ۸۲ء)

۴۔ قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تدریسی کورس کے سالِ اوّل کی رُوداد
(شائع شدہ 'حکمتِ قرآن' مئی ۱۹۸۵ء)

ع "گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را!"

ششماہی رپورٹ

حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کراچی

جنوری ۷۲ء تا جون ۷۲ء

مرتّب : شیخ جمیل الرحمٰن ، معتمد عمومی

حلقہ مطالعہ قرآن کراچی کے لیے جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ہر انگریزی ماہ کے پہلے اتوار اور اس سے ماقبل تین یوم کے لیے کراچی تشریف لانے کی منظوری دی تھی۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۷۱ء کو جمعۃ المبارک سے اس مبارک کام کا کراچی میں آغاز ہوا۔ خطبۂ جمعہ ڈاکٹر صاحب موصوف جامع مسجد کورٹ روڈ میں دیتے ہیں۔ یہ مسجد شہر کے قلب میں واقع ہے۔ اس میں تقریباً سات آٹھ سو حضرات نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ خواتین کے لیے بھی نماز جمعہ کی ادائیگی کا اس مسجد میں مستقل انتظام ہوتا ہے۔ خطبہ کے لیے ۴۵ منٹ کا وقت مقرر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی آمد کے موقع پر نمازیوں میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مئی اور جون کے پہلے جمعوں میں حاضری کا محتاط اندازہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس مسجد میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو خطبات دیئے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۳۱ دسمبر ۷۱ء	خطبۂ جمعہ کی اہمیت
۴ ، فروری ۷۲ء	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
۳ ، مارچ ۷۲ء	سورۂ واللّیل کے مضامین کی تشریح و تفسیر
۳۱ ، مارچ ۷۲ء	سورۃ الاعلیٰ کے " " " (نامکمّل)
۵ ، مئی ۷۲ء	سورۂ ھمزہ " " " "
۲ ، جون ۷۲ء	سورۃ الاعلیٰ کے بقیہ حِصّہ کی تکمیل

درس قرآن کا آغاز یکم جنوری ۷۲ء کو بعد نماز عشاء ریاض مسجد دہلی مرکنٹائل ہاؤسنگ سوسائٹی شہید ملّت روڈ پر ہوا۔ اس ہاؤسنگ سوسائٹی اور گردوپیش کی دیگر سوسائٹیز میں زیادہ تر تاجروں اور صنعت کاروں کی آبادی ہے۔ پھر وہ لوگ آباد ہیں جو تجارتی اور صنعتی اداروں میں اونچے مناصب پر فائز ہیں۔ درسِ قرآن

میں شریک ہونے والوں کا اوسط تقریباً ستر اسی افراد رہا ہے۔ اہلِ علاقہ کے علاوہ بعض حضرات دور دراز کے مقامات سے بھی اس درس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس مسجد میں ڈاکٹر صاحب کے حسب ذیل درس ہوئے ہیں:

یکم جنوری ۷۲ء ہفتہ بعد نماز عشاء سورۂ حج کا آخری رکوع

۵، فروری " " " " سورۂ والعصر

۴، مارچ " " " " سورۂ حٰم سجدہ کی آیات از ۳۰ تا ۳۵

یکم اپریل " " " " سورۂ نور کا رکوع ۵

۷، مئی " اتوار " " سورۂ قیامہ مکمل

۲، جون ۷۲ء ہفتہ کو بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے درس نہ ہو سکا۔ مزید براں جولائی ۷۲ء سے اس مسجد میں درس جمعیت الفلاح ہال کے درس کے باعث بند کیا جا رہا ہے جس کی تفصیل آگے آئیگی۔

مسجد باب الاسلام آرام باغ شہر کے وسط میں ماشاء اللہ ایک وسیع جامع مسجد ہے۔ اس مسجد میں ۴ فروری ۷۲ء جمعہ کی شب سے درس قرآن کا آغاز ہوا بفضلہٖ تعالےٰ ہر درس میں حاضرین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے جو اب دو سو افراد سے بھی تجاوز کر گئی ہے اس درس میں بھی لوگ دور دور سے شریک ہوتے ہیں۔ اس مسجد میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے اب تک حسب ذیل درس ہوئے ہیں:-

۴، فروری ۷۲ء جمعہ بعد نماز عشاء سورۂ حٰم سجدہ کی آیات از ۳۰ تا ۳۵

۳، مارچ " " " " سورۂ صف مکمل

۳۱، مارچ " " " " سورۂ جمعہ "

۵، مئی " " " " سورۂ عنکبوت کا پہلا رکوع

۲، جون " " " " سورۂ مومنون کا پہلا رکوع

عزیز آباد اور دستگیر کالونی متوسط طبقہ کی آبادیاں ہیں ان میں اور ان سے ملحق بستیوں میں متوسط درجہ کے تاجر، صنعت کار اور ملازمت پیشہ حضرات کی رہائش ہے۔ اکثریت تعلیم یافتہ حضرات کی ہے۔ محمدی مسجد، عزیز آباد اور دستگیر کالونی کے اتصال پر واقع ہے۔ اس مسجد میں پہلا اجتماع ۳ فروری جمعرات کو بعد نماز عشاء منعقد ہوا جس میں سورۂ حجرات کی آیات ۱۴ تا ۱۸ کا درس ہوا۔ دوسرا اجتماع ۴، مارچ ہفتہ بعد نماز عصر منعقد ہوا جس میں سورۂ حج کے آخری رکوع کا درس ہوا۔ ان دونوں اجتماعات میں شرکاء کی اوسط تقریباً پچاس رہی جو کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی، لہٰذا اپریل ۷۲ء سے یہ اجتماع بند

کرنے کا ارادہ تھا لیکن بعض مقامی حضرات نے جو ڈاکٹر صاحب کی دعوت سے کافی متاثر تھے، اصرار کیا کہ ان کو ایک مزید موقع دیا جائے۔ چنانچہ تیسرا اجتماع ۳۰ مارچ ۱۹۷۲ء جمعرات کو بعد نمازِ عشاء ایک رفیق کارکن کے مکان پر رکھا گیا جس میں شرکاء کی تعداد اسّی سے بھی متجاوز تھی اور اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی تھی۔ چوتھا اجتماع ۲۱ مئی کو بروز ہفتہ بعد نماز عشاء اور پانچواں اجتماع یکم جون کو بروز جمعرات بعد نماز عشاء اسی مقام پر منعقد ہوئے۔ ان دونوں اجتماعات میں شرکاء کی تعداد سوا سو کے لگ بھگ تھی۔ چوتھے اجتماع میں درسِ قرآن کے بجائے ڈاکٹر صاحب نے "حقیقتِ ایمان" کے موضوع پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ خطاب فرمایا اور پانچویں اجتماع میں سورہ آلِ عمران کے آخری رکوع کی آیات از ۱۹۰ تا ۱۹۵ کا درس ہوا۔ ان اجتماعات میں خواتین بھی شریک تھیں۔

کراچی کا مرکزی اجتماع ہر انگریزی ماہ کے پہلے اتوار کو رباط العلوم الاسلامیہ لائبریری میں صبح ۹½ بجے ہوتا ہے۔ یہ لائبریری ہاؤسنگ سوسائٹیز کے علاقہ میں عالمگیر روڈ پر ایک مینار مسجد کے نزدیک واقع ہے۔ اس علاقہ میں ذرائع آمد و رفت کی بڑی تکلیف ہے۔ لیکن اس کے باوجود کراچی کے مختلف اطراف سے اجتماع میں شرکت کے لیے لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ خواتین کے لیے بھی نشست کا علیحدہ انتظام ہوتا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ اب حاضری ڈیڑھ سو افراد سے بھی تجاوز کر رہی ہے۔ اس مرکزی اجتماع کا آغاز ۲؍ جنوری ۱۹۷۲ء بروز اتوار ہوا تھا۔ اس اجتماع میں ڈاکٹر صاحب کا درس عموماً دو، پونے دو گھنٹے کا ہوتا ہے۔ حاضرین بڑے انہماک سے پورے درس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں ڈاکٹر صاحب نے حسب ذیل موضوعات پر خطاب فرمایا ہے:

۲؍ جنوری ۱۹۷۲ء	اتوار صبح دس بجے	خطاب۔ جس میں حالاتِ ملکی کا پس منظر اور پیش منظر بیان کیا گیا اور دعوت رجوع الی القرآن کی ضرورت و اہمیت واضح کی گئی۔
۶ فروری ۱۹۷۲ء	اتوار صبح دس بجے	خطاب۔ جس میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷ "آیت البرّ" کے مطالب بیان کئے گئے۔
۵ مارچ ۱۹۷۲ء	" " " "	خطاب۔ جس میں سورۂ لقمان کے رکوع ۲ کی تفسیر و شرح بیان ہوئی۔
۲؍ اپریل ۱۹۷۲ء	" " " "	خطاب۔ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی روشنی میں حقیقتِ ایمان پر روشنی ڈالی گئی۔
۷؍ مئی ۱۹۷۲ء	" " ۹½	سورۂ تغابن مکمل بیان ہوئی۔

۴ر جون ۷۶ء اتوار صبح ۹½ بجے   سورۂ حجرات مکمل کا درس ہُوا۔

کراچی ایک نہایت وسیع شہر ہے، متعدد مقامات سے مسلسل و پیہم تقاضے آتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی آمد پر ان کے علاقوں میں بھی خطاب اور درسِ قرآن کے پروگرام رکھے جائیں لیکن ڈاکٹر صاحب چونکہ گنتی کے دن کراچی کے لیے نکالتے ہیں اور ان میں بھی بعض دن تو دو دو پروگرام ہوتے ہیں اس لیے پروگراموں میں اضافہ ممکن نہیں البتہ اکثر احباب کی اس تجویز کے پیشِ نظر کہ رباط العلوم الاسلامیہ کی طرز کا ایک اجتماع شہر کے وسط میں کسی ہال میں رکھا جائے، ماہِ جون ۷۶ء سے جمعیت الفلاح ہال میں ایک اجتماع کا آغاز ہو گیا ہے۔ جمعیت الفلاح کی عمارت شہر کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ شہر کے تمام اطراف کے لیے یہاں سواری آسانی سے مِل جاتی ہے۔ صدر میں ریگل بس سٹاپ ایک مشہور اور مرکزی بس سٹاپ ہے جمعیت الفلاح اس بس سٹاپ سے نصف فرلانگ پر واقع ہے۔ جمعیت الفلاح میں پہلا اجتماع ۴ر جون ۷۶ء بروز اتوار بعد نماز مغرب منعقد ہوا۔ شرکاء کی تعداد دو سَو کے لگ بھگ تھی۔ اس اجتماع میں ڈاکٹر صاحب نے "حیاتِ طیبہ" پر تقریر کی اور از رُوئے قرآن حکیم بعثتِ نبوی کے مقصد کی تکمیل کے مراحل اور اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں کے ذیلی عنوانات پر اظہارِ خیال فرمایا۔ آئندہ یعنی ماہ جولائی سے جمعیت الفلاح میں ہر انگریزی ماہ کے پہلے اتوار سے ماقبل ہفتہ کے روز بعد نماز مغرب درسِ قرآن ہوا کرے گا۔ اس اجتماع کی وجہ سے ریاض مسجد کا درس بند ہو جائے گا جو ہفتہ کی شب کو ہُوا کرتا تھا۔ البتہ رباط العلوم الاسلامیہ کا درس اتوار کو علیٰ حالہٖ جاری رہے گا، جو اسی علاقہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ انشاءاللہ جمعیت الفلاح ہال کا اجتماع بہت جلد حاضری کے لحاظ سے دیگر تمام اجتماعات سے بازی لے جائے گا۔

ان مستقل اجتماعات کے علاوہ جناب ڈاکٹر صاحب کے حسب ذیل دو خطابات بھی ہوئے: ۲ر مارچ ۷۶ء کو ڈاکٹر صاحب نے یونین کلب سراج الدولہ روڈ پر بعد نماز عشاء "تہذیب حاضر کے فکری رجحانات اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کے موضوع پر خطاب کیا۔ حاضری ستّر افراد سے زائد تھی، جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی اکثریت تھی۔ یہ ایک خالص علمی تقریر تھی جو بے حد پسند کی گئی ——— یکم اپریل کو جامع مسجد نیو ٹاؤن میں جامعہ اسلامیہ عربیہ کے دار الحدیث کے وسیع ہال میں، جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کرام کو خطاب کیا۔ اس اجتماع کی صدارت جناب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ نے فرمائی۔ اس خطاب میں علماء کرام اور دینی طلبا کو ملّت کے ذہین و فہیم طبقہ میں دعوت تجدید ایمان اور رجوع الی القرآن کی ضرورت و اہمیت کی طرف متوجہ کرایا گیا۔ بحمداللہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کو کافی پسند کیا گیا اور ان کے خیالات سے بالعموم اتفاق کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے خطبات اور درس ہائے قرآن، کراچی میں ٹیپ کر لیے جاتے ہیں اور انہیں مختلف مقامات پر لوگوں کو جمع کر کے سنایا جاتا ہے۔ ان ٹیپس کے ذریعے دعوتی کام میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ ایک صاحب خطباتِ جمعہ کے ٹیپ منتقل کر کے اپنے ساتھ امریکہ لے گئے ہیں تاکہ وہاں مستقل طور پر ٹیپ کے ذریعے خطبات سنانے کا انتظام کیا جائے۔ مختلف حلقوں سے بعض حضرات اپنے ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے خطبات اور درس ہائے قرآن ریکارڈ کر رہے ہیں تاکہ اپنے اپنے حلقوں میں ٹیپ کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز کیا جا سکے۔ حیدر آباد بھی چار ٹیپ جا چکے ہیں — جہاں ان کو مختلف مقامات پر سنانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ لوگ کافی دلچسپی کے ساتھ ٹیپ کے ذریعے درس ہائے قرآن اور خطبات جمعہ سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

رفتارِ کار

از قلم: جمیل الرحمٰن

(ماخوذ از 'میثاق' مارچ ۱۹۷۷ء)

لاہور بفضلہٖ تعالیٰ وعونہٖ لاہور میں مسجد شہداء میں ہر اتوار کی صبح کو ۹ بجے درسِ قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ آج کل سورۃ النساء زیرِ مطالعہ ہے۔ الحمدللہ! تادمِ تحریر اس سورۂ مبارکہ کے نو رکوع کا مطالعہ کیا جا چکا ہے۔ اس درسِ قرآن کو لاہور میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حاضری اکثر پانچ سو سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے جن میں عظیم اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ہوتی ہے۔ خواتین کے لیے پردے کا بھی انتظام ہوتا ہے۔

مسجد خضراء میں خطبۂ جمعہ سے قبل "اربعین نووی" سے درسِ حدیث ہوتا ہے۔ تادمِ تحریر تیس ۳۰ احادیث کا مطالعہ مکمل ہو چکا ہے۔ نمازِ جمعہ کے بعد درسِ قرآن ہوتا ہے۔ اس مسجد میں تقریباً ساڑھے چار سال قبل سلسلہ وار درسِ قرآن شروع ہوا تھا۔ آجکل سورۂ مریم زیرِ مطالعہ ہے، جس کے چار رکوع مکمل ہو چکے ہیں۔ اس درس میں اوسط حاضری دو سو کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اس مسجد میں بھی خواتین کے لیے پردے کا انتظام ہوتا ہے۔

یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو ۱۰ محرم الحرام کی تاریخ تھی۔ چنانچہ اس روز بعد نمازِ مغرب ڈاکٹر صاحب نے مسجد خضراء میں "عظمتِ صحابہؓ" پر تقریر فرمائی۔ اس مجلس کے دوسرے مقرر جناب میاں عبدالرشید صاحب تھے۔

لاہور میں مختلف کالجوں اور دینی، رفاہی اور ثقافتی اداروں سے ڈاکٹر صاحب کو مسلسل خطاب اور درس کے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی مخصوص مصروفیات کے پیشِ نظر ہر جگہ وقت دینا بڑا مشکل ہوتا ہے، تاہم امکان بھر کوشش کی جاتی ہے کہ دعوت پہنچانے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۹۷۷ء کو ایف سی کالج کی جونیئر بیالوجی سوسائٹی کے عہدیداران کی رسمِ حلف برداری میں ڈاکٹر صاحب نے شرکت کی اور اس موقع پر کالج میں "ارتقائے انسان اور قرآن" کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس موقع پر کالج کے وائس پرنسپل اور شعبے کے تمام پروفیسرز اور لیکچررز صاحبان نے برملا کہا کہ ہمیں آج معلوم ہوا ہے کہ سائنسی حقائق کے لیے قرآن مجید میں محکم شواہد اور واضح اشارات موجود ہیں۔

۲۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن لاہور میں "اسلام میں ترقی کا مفہوم" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ اس ادارے کے تحت وفاقی اور صوبائی حکومت کے اعلیٰ افسران کی تربیت کے لیے مختلف کورسوں کا انتظام ہوتا ہے۔ اسی ادارے میں ڈاکٹر صاحب نے ۲ فروری کو دوسرا لیکچر "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے احیائی عمل" کے موضوع پر دیا۔ یہ دونوں لیکچرز بے حد پسند کئے گئے۔

۴ فروری ۱۹۷۷ء کے جمعہ کو ڈاکٹر صاحب نے مسجد خضراء کے بجائے پی۔ اے۔ ایف بیس لاہور

چھاؤنی کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ سے قبل "اسلام کا فلسفۂ شہادت و جہاد" کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس بیس میں چار مساجد ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کے خطاب کی وجہ سے اس جمعہ کو تین مساجد میں جمعہ کا اہتمام نہیں کیا گیا تاکہ تمام نمازی جامع مسجد میں ڈاکٹر صاحب کے خطاب میں شریک ہوسکیں۔ جامع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مسجد کے باہر میدان میں کافی صفوں کا انتظام تھا تقریباً صفیں ایک بجے تک ہی پُر ہو گئیں۔

اسی روز ریواز گارڈن کی جامع مسجد میں نماز عصر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک خطبۂ نکاح ارشاد فرمایا۔ اس موقع پر لوگوں کو توجہ دلائی گئی کہ شادی بیاہ کی تقاریب کو سنّت کے مطابق انجام دینے کی کوشش اصلاحِ معاشرہ کے نقطۂ نظر سے بہترین کاموں میں سے ہے۔

۱۶ فروری ۱۹۷۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے پنجاب امپلائیز سوشل سکیورٹی انسٹی ٹیوٹ میں "اسلام اور ضبطِ ولادت" پر لیکچر دیا۔

چنیوٹ

جناب حاجی محمد رفیق سہگل صاحب کا عرصہ سے بے حد اصرار تھا کہ ڈاکٹر صاحب چنیوٹ آکر 'دعوت رجوع الی القرآن' پیش کریں۔ اس مقصد کے لیے وہ لاہور بھی تشریف لاتے تھے۔

چنانچہ ۲۴ جنوری کی صبح کو ڈاکٹر صاحب چنیوٹ تشریف لے گئے۔ ایک روز قبل لاہور اور اس کے تمام قریبی اضلاع میں خوب بارش ہو چکی تھی، چنیوٹ میں بھی بارش اور سردی کے شدید اثرات موجود تھے۔ ۲۴ جنوری کو چنیوٹ میں ڈاکٹر صاحب نے خواتین کے ایک اجتماع کو سورۂ تحریم اور سورۂ احزاب کی آیات کی روشنی میں خطاب کیا۔ جس کے ذریعے از روئے قرآن مسلمان خواتین کی ذمّہ داریوں پر روشنی ڈالی۔ اسی شب کو شاہی مسجد میں بعد نمازِ عشاء ڈاکٹر صاحب نے "عظمتِ صحابہؓ" کے موضوع پر خطاب کیا۔ شدید سردی کے باوجود کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ۲۵ جنوری کو بعد نماز فجر ڈاکٹر صاحب نے مسجد شیخاں میں درسِ قرآن دیا، جس میں سورۂ جمعہ کی آیت : هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ کی روشنی میں انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے اساسی طریق منہاج کو بیان کیا۔ اسی روز ۱۰ بجے ڈاکٹر صاحب نے اصلاح ہائی اسکول کے طلبہ و اساتذہ کو "نوجوانوں کے دینی و ملّی فرائض" کے موضوع پر خطاب کیا۔ اسی دن بعد ظہر ڈاکٹر صاحب لاہور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

سکھر

دسمبر میں کراچی جاتے ہوئے ۲۱ اور ۲۲ دسمبر، دو دن ڈاکٹر صاحب نے سکھر میں قیام کیا۔ وہاں کی روداد جناب عبداللطیف صاحب نے قلم بند کر کے ارسال کی تھی، جو پیش خدمت ہے :-

ڈاکٹر صاحب کے گزشتہ دورۂ سکھر کے اختتام پر جناب سید حسن میاں ایڈووکیٹ نے باصرار اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ آئندہ پروگرام کے موقع پر کم از کم ایک نشست مسجد سے باہر کسی ایسی جگہ رکھی جائے جہاں مسجد میں نہ آنے والے حضرات شرکت کر سکیں۔ موصوف کا استدلال یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا درسِ قرآن جدید تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ نوجوانوں کو سنوارنے کے لیے زیادہ مفید اور سود مند ہے۔ اس سے قبل ایک مرتبہ

سیّد حسن میاں صاحب اور جناب ڈاکٹر خالد مسعود میاں کی تحریک پر شہر کے سب سے فیشن ایبل ہوٹل "انٹر پاک اِن" میں ڈاکٹر صاحب نے روٹری کلب کے زیرِ اہتمام کلب کے ممبران اور معززینِ شہر کی ایک بڑی تعداد سے خطاب فرمایا تھا۔ جس سے تمام سامعین بے حد متاثر ہوئے تھے اور تقریباً تمام حضرات نے باصرار اور بصد شوق اس مجلس میں 'انجمن خدام القرآن' کی جانب سے بلاقیمت تقسیم کردہ پمفلٹ "سورۃ العصر کی تفسیر" پر ڈاکٹر صاحب سے دستخط حاصل کئے تھے۔

"انٹر پاک اِن" میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے اختتام پر روٹری کلب کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے سیّد حسن میاں نے فرمایا تھا کہ "میں آج تک یہ سمجھتا تھا کہ قرآنِ کریم میں اکثر و بیشتر قصے کہانیاں بیان کی گئی ہیں، جن میں آپس میں کسی قسم کا ربط نہیں مگر ڈاکٹر صاحب کی تقریر سن کر آج یہ بات منکشف ہوئی کہ قرآنِ کریم نہ صرف باہم مربوط ہے بلکہ واقعی کتابِ رشد و ہدایت ہے اور قرآنِ کریم پر میرے تمام ہی شکوک و شبہات کا ازالہ ہو گیا ہے۔" روٹری کلب کے صدر جناب اخلاق حسین صاحب (موصوف اے۔سی سی سیمنٹ فیکٹری کے جنرل منیجر ہیں) نے صدارتی تقریر میں کہا کہ مجھے یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی تھی کہ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر کا درسِ قرآن سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ مگر تقریر سن کر یہ محسوس ہوا ———— کہ ڈاکٹر صاحب نے قوم کے جسمانی علاج کا پیشہ ترک کر کے رُوحانی علاج کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ بے حد مفید اور اشد ضروری ہے۔

چنانچہ ۲۱ دسمبر کو بعد نمازِ عشاء مکّی مسجد میں درسِ قرآن اور ۲۲ دسمبر کو بعد نمازِ مغرب ریلوے انسٹی ٹیوٹ ہال میں "اسلام میں نیکی کا تصوّر" کے موضوع پر تقریر کا پروگرام بنایا گیا۔ پروگرام میں خصوصاً ریلوے انسٹی ٹیوٹ والے پروگرام کی تشہیر کے سلسلے میں، پیرانہ سالی کے باوجود سیّد حسن میاں صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ تمام عدالتوں میں جج حضرات اور وکلاء کی بڑی تعداد کو بہ نفسِ نفیس پروگرام کے ہینڈ بل تقسیم کئے اور تفصیل سے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرانے کے بعد تقریر میں شرکت کا وعدہ لیا۔

۲۱ دسمبر بعد نمازِ عشاء مکّی مسجد نزد ابنِ قاسم پارک میں ڈاکٹر صاحب نے سورۃ الکہف کے آخری رکوع کا درس دیا۔ باشندگانِ سکھر گرمی برداشت کرنے کے معاملہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن سردی کے معاملہ میں بے حد کمزور واقع ہوئے ہیں۔ اُس روز صبح سے ہی مطلع ابر آلود تھا اور ہوا میں کافی خنکی تھی، جس سے شدید خدشہ تھا کہ آج حاضری بہت کم رہیگی۔ مگر خلافِ توقع مسجد کا ہال کھچا کھچ بھر گیا اور کافی حضرات کو برآمدے میں بیٹھنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سورت کے عمود اور اس کے مرکزی مضمون پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی۔

۲۲ دسمبر کو بعد نمازِ مغرب ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں "اسلام میں نیکی کا تصوّر" کے موضوع پر تقریر تھی۔ اسٹیج پر ڈاکٹر صاحب کی نشست اور ہال میں کرسیوں پر سامعین کی نشست کا انتظام تھا۔ باہر برآمدہ میں مکتبہ بھی لگایا گیا تھا۔ حاضری اڑھائی سو کے لگ بھگ تھی۔ تقریر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ قرآن مجید کے دوسرے پارے کی آیت ۱۷۷، نیکی کے اسلامی تصوّر کی مکمّل تصویر واضح کر رہی ہے۔ نیکی میں کیا مقدم ہے، کیا مؤخر ہے، اصول کیا ہیں اور فروع کیا ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے پوری تفصیل اور انتہائی دل نشین انداز میں اس آیت کی روشنی میں موجودہ مسلمان

معاشرہ میں نیکی کے غلط تصوّرات پر تنقید و تبصرہ کیا اور نیکی کے صحیح تصور اور اُس کے ایک ایک جُز پر عمل درآمد کی ضرورت کو واضح کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب نے سامعین کو بتایا کہ گذشتہ دس برس سے انہوں نے قرآنِ کریم کے تعلیم و تعلّم کو اپنی زندگی کا مقصدِ وحید بنا رکھا ہے اور اسی سلسلہ میں لاہور کے علاوہ کراچی اور سکھر کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے قرآن کریم سے ایک نصاب مرتّب کیا ہے، اگر کوئی شخص اس منتخب نصاب کا مطالعہ سنجیدگی سے اور تھوڑی سی محنت کرکے کرے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کو قرآن مجید سے ایک ذہنی اور قلبی مناسبت قائم ہو جائے گی ۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تقریر تقریباً پونے دو گھنٹے جاری رہی۔

یہ رپورٹ رفیق محترم قاضی عبدالقادر صاحب کی مرتّب کردہ ہے۔

کراچی

سکھر کے پروگرام سے فارغ ہو کر ۲۳ دسمبر بروز جمعرات ڈاکٹر صاحب کراچی پہنچے۔ سندھ ایکسپریس اس روز تقریباً پانچ گھنٹے لیٹ تھی، جس کے باعث نصف دن ضائع ہو گیا۔ اُسی روز بعد نماز مغرب ڈاکٹر صاحب نے کراچی تھیوسوفیکل ہال میں 'تنظیم اسلامی' کے زیر اہتمام ایک اجتماعِ عام کو "ہمارے قومی، ملّی اور دینی فرائض" کے موضوع پر خطاب کیا۔ موصوف نے 'تنظیم اسلامی' کی دعوت کے اساسی نکات کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ہماری یہ تنظیم لوگوں کو تجدیدِ ایمان، 'توبہ' اور تجدیدِ عہد کی دعوت دینے کے لیے قائم کی گئی ہے جس کے بغیر ہمارے معاشرے کا نہ تعلق باللہ درست ہو سکتا ہے نہ ایمان بالآخرت صحیح ہو سکتا ہے اور نہ ہی ختم المرتبت، سیدالمرسلین، خاتم النبیّین جناب محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر پختہ یقین حاصل ہو سکتا ہے ۔۔۔۔ اس اجتماع کی صدارت تنظیم کے معتمد شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے فرمائی۔ اس شام کو چند دینی جماعتوں کے اپنے پروگرام ہونے کے باوجود، الحمدللہ' ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ اجتماع کی کارروائی تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ اختتام پر عشاء کی نماز باجماعت قریب کی مسجد میں ادا کی گئی۔ اس موقعہ پر 'تنظیم اسلامی' کی دعوت کے بنیادی نکات پر مشتمل حاضرین میں ایک خوبصورت دو ورقہ بھی تقسیم کیا گیا۔

۲۴ دسمبر کو کراچی کے مشہور تجارتی علاقے میریٹ روڈ میں 'بخاری مسجد' میں ڈاکٹر صاحب نے خطبۂ جمعہ سے قبل خطاب فرمایا جس میں ایمان بالآخرت کی اہمیت کو واضح کیا اور بتایا کہ ہمارے معاشرے میں کوئی مستقل اور پائیدار اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک لوگوں کو آخرت پر دل والا یقین حاصل نہ ہو جائے۔ ہمارے معاشرے میں دینی و اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہمارے دلوں سے محاسبۂ اُخروی کا خوف نکل گیا ہے، یا اس کے بارے میں ہم مختلف مغالطوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اسی شام بعد نمازِ عصر جمعیت الفلاح ہال میں سہ روزہ قرآنی تربیت گاہ کا آغاز ہوا، اس پروگرام کے لیے تین دن اور پانچ نشستیں مقرّر کی گئی تھیں۔ چونکہ ہفتہ اور اتوار (۲۵، ۲۶ دسمبر) کو عام تعطیل تھی لہٰذا ان دو دنوں میں صبح اور شام دو نشستیں رکھی گئی تھیں۔ الحمدللہ ان پانچ دنوں میں سورۂ کہف کا

درس مکمل ہوگیا۔ اس تربیت گاہ میں سکھر اور لاہور سے بھی چند رفقاء نے شرکت فرمائی۔

'الفلاح ہال' ہی میں اتوار ۲۶ دسمبر کو بعد نمازِ ظہر 'تنظیمِ اسلامی' کے رفقاء کا ایک خصوصی اجتماع ہوا، جس میں کام کا جائزہ لیا گیا اور تنظیم کے معتمد شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے رفقاء کو آئندہ کام کے سلسلہ میں اہم ہدایات دیں۔

اتوار کو درس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے اعلان فرمایا کہ جو حضرات ہمارے کام کو سمجھنا چاہیں اور تعلیم و تعلّم قرآن کی دعوت میں ہمارے ساتھ کسی طرح سے بھی تعاون فرمانا چاہیں وہ اگلے روز بعد نمازِ مغرب جاپان مینشن میں تشریف لے آئیں۔ چنانچہ اگلے روز پرانے رفقاء کے علاوہ کچھ نئے حضرات بھی جاپان مینشن کے اجتماع میں شریک ہوئے، جہاں کافی دیر تک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

دسمبر میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کے موقع پر ہی یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کراچی میں آئندہ درس کا پروگرام فروری کے آغاز میں رکھا جائے۔ چنانچہ اس پروگرام کے تحت ڈاکٹر صاحب اتوار ۶ فروری کی شام کو کراچی پہنچے اور 'الفلاح ہال' میں پیر، منگل اور بدھ (۷ تا ۹ فروری) بعد نمازِ مغرب تا عشاء سورۂ مریم کا درس دیا ــــــ مغرب اور عشاء کی نمازیں ہال ہی میں ادا کی جاتی رہیں۔ بعض ساتھیوں کو یہ خدشہ تھا کہ انتخابات کی گہما گہمی کی وجہ سے درس کی مجالس کی حاضری متأثر ہوگی لیکن الحمدللہ! ایسا نہیں ہوا ــــ حاضری معمول کے مطابق تھی بلکہ تیسرے دن حاضری کچھ زیادہ ہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو حضرات پابندی اور غایت درجہ کی دلچسپی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے درس کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں اُن پر یہ وقتی ہنگامے اثر انداز نہیں ہوتے۔

۹ فروری کو عصر تا مغرب 'رفقاءِ تنظیمِ اسلامی' کا ایک خصوصی اجتماع منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب محترم نے بھی شرکت فرمائی۔ رفتارِ کار کا جائزہ، تنظیمی امور پر تبادلۂ خیال کے علاوہ دعوت کی توسیع کے سلسلہ میں بھی ڈاکٹر صاحب نے مفید مشورے دیئے۔

اپنے اس دورہ میں ڈاکٹر صاحب نے دو کالجوں میں بھی طلباء کے اجتماعات کو خطاب فرمایا۔ پہلا اجتماع پیر ۷ فروری کو علامہ اقبال کالج میں اور دوسرا این۔ای۔ڈی (N.E.D) انجینئرنگ کالج کیمپس میں، منگل ۸ فروری کو منعقد ہوا۔ انتظامات اور حاضری کے اعتبار سے انجینئرنگ کالج کا اجتماع نہایت شاندار تھا۔ یہ اجتماع دراصل خلافتِ راشدہ کانفرنس تھی۔ جس میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ شاہ بلیغ الدین صاحب نے بھی تقریر فرمائی اور مولانا طاسین صاحب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت پر ایک مقالہ پڑھا جو امید ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی 'میثاق' کے صفحات کی زینت بنے گا۔

تبلیغ قرآن اور دعوتِ دین کے عظیم مقاصد کے لیے
انجمن خدّام القرآن کے صدر مؤسس اور امیر تنظیم اسلامی کے
طوفانی دَوروں کی ایک مثال

(ماخوذ از 'میثاق' فروری ۸۲ء تحریر ڈاکٹر اسرار احمد)

"دَوروں اور تقریروں کے جس طوفان کا ذکر اس وقت کرنا مطلوب ہے اُس کا آغاز اواخرِ دسمبر ۸۱ء میں پشاور کے دَورے سے ہوا۔

وہاں سے ۲۸ دسمبر کی رات کو واپسی ہوئی۔

۲۹ کو راقم نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر "العادل" کے عنوان سے ریڈیو پاکستان لاہور کے ایک سیمینار میں تقریر کی۔

۳۰ کو ایک درس قرآن پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج میں ساڑھے گیارہ سے ایک بجے تک ہوا۔ پھر شام کو "حقیقت و مدارج جہاد فی سبیل اللہ" کے موضوع پر ایک تقریر مسجد شہداء میں عصر تا مغرب اور پھر مغرب تا عشاء ہوئی۔

۳۱ دسمبر کو پھر ایک درس اسٹاف کالج میں ہُوا اور سیرت النبیؐ پر ایک تقریر جامع مسجد جی۔او۔آر ۱ میں مغرب اور عشاء کے مابین ہوئی۔

یکم جنوری ۸۲ء کو جمعہ تھا۔ چنانچہ حسب معمول خطبہ و خطاب جمعہ مسجد دارالسلام میں ہوا، اور درسِ قرآن بعد نماز مغرب 'جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں۔ جہاں ایک عقد نکاح کے ضمن میں بھی کسی قدر مفصّل خطاب ہوا۔

۲ جنوری کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی جانا ہوا۔ جہاں عصر تا مغرب تنظیم اسلامی کے دفتر واقع ۱۱ داؤد منزل، شارع لیاقت میں رفقائے تنظیم اسلامی کراچی کے ایک اجتماع میں شرکت ہوئی اور بعد نماز عشاء کے ڈی اے سکیم ۱ میں واقع جناب محمد فاروق صاحب کے مکان پر اعلیٰ سطح کے کاروباری

حضرات اور سرکاری افسروں کے ایک بڑے اجتماع میں 'حقیقتِ ایمان' کے موضوع پر تقریر ہوئی۔

۳ جنوری کو ایک تقریر بوقت دوپہر نیپا (NIPA) کراچی میں ہوئی پھر ایک تقریر مغرب تا عشاء سیرت النبیؐ پر خالقدینا ہال، بندر روڈ میں ہوئی۔ وہاں سے بھاگم بھاگ ناظم آباد ۲ پہنچا ہوا جہاں عشاء کا وقت خاص طور پر مؤخر کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ بعد نماز عشاء وہاں درسِ قرآن کی محفل ہوئی۔

۴ جنوری کو حسبِ روزِ گذشتہ ایک تقریر مغرب اور عشاء کے مابین پاکستان سُنّی کونسل کے زیرِ اہتمام خالقدینا ہال میں ہوئی اور دوسری یوم فاروقِ اعظمؓ آرگنائزنگ کمیٹی کے زیرِ اہتمام رات کے گیارہ سے بارہ بجے تک میدان جامع مسجد فاروقِ اعظمؓ نارتھ ناظم آباد میں منعقدہ ایک جلسۂ سیرت النبیؐ میں۔

۵ جنوری کا دن غالباً سخت ترین تھا۔ چنانچہ ایک تقریر ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع جناب کیپٹن عبدالکریم صاحب کے مکان پر قبل از ظہر ہوئی۔ (اس میں بھی کراچی کی "ٹاپ جنٹری" کے کثیر التعداد حضرات شریک تھے)۔ پھر دو تقریریں، ایک بعد نماز مغرب اور دوسری بعد نماز عشاء خالقدینا ہال میں ہوئیں ـــ اور پھر ایک تقریر رات کے بارہ سے ایک بجے تک ایبی سینیا لائن میں منعقدہ جلسہ سیرت النبیؐ میں ہوئی۔

۶ جنوری کو راقم کے ایم بی بی ایس کے کلاس فیلو اور فی الوقت ایسوسی ایٹ پروفیسر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو وسیکلر ڈیزیز، کراچی کی تالیفِ لطیف "قلب" کی تقریبِ رونمائی تھی۔ اس میں شرکت بھی ہوئی اور مختصر خطاب بھی ہوا۔ سہ پہر کو ذیل پاک سیمنٹ فیکٹری کے ہیڈ آفس کے ملازمین کے زیرِ اہتمام جلسہ سیرت النبیؐ میں تقریر ہوئی اور رات کو لاہور واپسی ہو گئی۔

جمعرات ۷ جنوری کو ذرا دم لے کر جمعہ ۸ جنوری سے پھر چکّی کے دونوں پاٹ اُسی تیز رفتاری سے چلنے شروع ہو گئے۔ مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ 'احکامِ ستر و حجاب' پر ہوا۔ وہیں نماز کے بعد برادرِ مکرم الطاف حسین صاحب کی بھتیجی کا عقدِ نکاح ہوا جس میں حسبِ معمول 'خطبہ' دیا۔ رات کو جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں 'ختمِ نبوّت' کے عنوان سے تقریر ہوئی جو غالباً سوا دو گھنٹے جاری رہی۔

۹ جنوری کو علی الصبح مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ کا اجلاس تھا۔ اُس کے فوراً بعد ملتان روڈ پر واقع اعوان کالونی میں ایک جامع مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت تھی اور وہاں بھی لامحالہ مختصر خطاب کرنا پڑا۔ ۳ بجے سہ پہر پاکستان ائر فورس کے چھوٹے طیارے "مشّاق" کے ذریعے (جس میں پائلٹ کے علاوہ صرف ایک سیٹ زیرِ تربیت ہوا باز کے لئے ہوتی ہے!) شورکوٹ کے قریب واقع رفیقی ایئر بیس جانا ہوا۔ جہاں مغرب کے بعد مفصّل خطاب ہوا۔

۱۰ جنوری کو اسی طیارے میں شورکوٹ سے اسلام آباد جانا ہوا۔ جہاں تیسرے پہر حکومت پاکستان

کی وزارت مذہبی امور کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی نیشنل سیرت کانفرنس میں اپنا مقالہ بعنوان "اخلاقیات کے میدان میں نبی اکرمؐ کی اتمامی و تکمیلی شان کا اصل مظہر : عدل و اعتدال" پڑھا۔ پھر بعد نمازِ مغرب ایک مفصل تقریر سیرت النبیؐ کے موضوع پر جامع مسجد عثمانیہ، صدر، راولپنڈی میں ہوئی۔

۱۱ر جنوری سے وفاقی کونسل عرف مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہو گیا۔ یہ اجلاس ابتداءً ۱۱ تا ۱۶ر جنوری کے لیے بلایا گیا تھا۔ جمعہ ۱۵ر جنوری کو صرف شام کا اجلاس رکھا گیا تھا۔ راقم نے اس سے رخصت کی درخواست دائر کر دی تاکہ جمعہ کے لیے لاہور آنا ہو سکے۔ الحمد للہ کہ بعد میں جمعہ کو اجلاس کے مکمل ناغے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح کونسل کا اجلاس ۱۱ تا ۱۴ر جاری رہا۔ ان ایام کے دوران بھی اپنے اصل کام، کی چکّی پورے زور شور سے چلتی رہی۔

چنانچہ گیارہ اور بارہ جنوری کو بعد نمازِ مغرب کمیونٹی سنٹر اسلام آباد میں درس قرآن کی نشستیں حسب پروگرام ہوئیں جن میں سورۂ حجرات کا از ابتداء تا آیت ۱۲ درس ہوا۔

۱۳ر جنوری کو بعد نمازِ عشاء توکلی مسجد، نزد چوک فوّارہ، راولپنڈی میں "نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" کے موضوع پر مفصّل خطاب ہوا۔ جس میں اہالیان راولپنڈی نے اُسی جوش و خروش سے شرکت کی جس کا ذکر گذشتہ شمارے میں ہو چکا ہے۔

۱۴ر کو مجلس شوریٰ کے دن کے اجلاس میں شرکت کر کے رات کو بذریعہ کار لاہور آنا ہوا۔

جمعہ ۱۵ر جنوری کو مسجد دارالسلام میں مجلس شوریٰ میں شرکت کے موضوع پر خطاب ہوا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور بعد نمازِ مغرب قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن میں "رفع و نزولِ مسیحؑ" کے عنوان سے تقریر ہوئی۔ اور راتوں رات پھر اسلام آباد واپسی ہو گئی۔

۱۶ر جنوری کو دن میں شوریٰ میں شرکت رہی اور بعد نمازِ مغرب اسلام آباد کے زیرو پوائنٹ کے قریب نو تعمیر شدہ A.D.B.P کی بارہ منزلہ عمارت کے آڈیٹوریم میں حکومتِ پاکستان کے پلاننگ کمیشن کے شعبۂ شماریات کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک جلسۂ سیرت النبیؐ سے خطاب ہوا۔

شوریٰ کا اجلاس ۱۶ر کو ختم ہو جانا تھا۔ چنانچہ ۱۷ر اور ۱۸ر دو دن لاہور ٹیلی ویژن سنٹر پر 'الھُدیٰ' کی مزید ریکارڈنگ کے لیے طے کر لیے تھے۔ لیکن وہاں شوریٰ کا اجلاس ایک دن کے لیے مزید بڑھا دیا گیا۔ میں اُس سے رخصت لے کر بھی چلا آتا لیکن سوءِ اتفاق سے ۱۷ر کی صبح میرے خلاف پیش شدہ 'تحریک استحقاق' پر بحث طے پا گئی۔ چار و ناچار رکنا پڑا۔ البتہ ۱۷ر کی صبح حکومت پاکستان کی فارن سروسز اکیڈمی میں زیرِ تربیت حضرات کے اجتماع سے 'اسلام اور پاکستان' کے موضوع پر مفصّل خطاب ہو گیا۔ جسے اسلام آباد سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے 'مسلم' نے نہایت تفصیل سے شائع کیا۔ بہرحال ۱۷ر کی شام کو لاہور واپسی ہو گئی۔ اور الحمد للہ کہ ۱۸ر کو "الھُدیٰ" کے تین پروگرام ریکارڈ ہو گئے۔

"ملکِ خدا تنگ نیست" اور "پائے مرا لنگ نیست!" کے مصداق ۱۹ کو پھر سفر شروع ہو گیا۔ اوّلاً لاہور سے ملتان بذریعہ پی آئی اے، پھر وہاں سے بہاولپور بذریعہ کار جانا ہوا۔ جہاں "تنظیم سیاسی پاکستان" کے زیرِ اہتمام اور سابقہ امیر بہاولپور اور حالیہ وزیرِ امورِ مذہبی، حکومت پاکستان، کے زیرِ صدارت جلسہ سیرت النبیؐ سے خطاب ہوا، جو عصر تا مغرب بھی ہوا اور پھر مغرب تا عشاء بھی۔ وہاں سے نصف شب کے وقت تیز گام سے سوار ہو کر ۲۰ کی صبح حیدر آباد پہنچا ہوا جہاں محترم و مکرم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حال مقیم پیرس کی ایک ہی دن میں دو تقریریں سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک قبل از دوپہر سندھ یونیورسٹی جام شورو سے ملحق 'انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی' کے آڈیٹوریم میں اور دوسری بعد مغرب مولانا وصی مظہر ندوی صاحب میئر آف حیدر آباد کے زیرِ صدارت کارپوریشن ہال میں ــــ بعد نمازِ عشاء جناب صلاح الدین صاحب کے زیرِ اہتمام ایک شاندار جلسۂ سیرت النبیؐ حیدر آباد شہر کے قلب تلک چاڑی میں ہوا۔ جس میں بعض دوسرے مقررین کے ہمراہ راقم نے بھی مفصّل تقریر کی۔

۲۱ جنوری کو تو واقعہ یہ ہے کہ حد ہو گئی اور مولانا سیّد وصی مظہر ندوی صاحب نے نہ صرف یہ کہ اپنے بزرگانہ اختیارات کا بھرپور استعمال فرمایا بلکہ غالباً اگلے پچھلے سارے حساب چکوا لیے۔ ان سے طے تو صرف اس قدر تھا کہ ایک جلسۂ سیرت سے رات کو خطاب ہو گا ــ اور سہ پہر میں ان کے مدرسے (جامعہ اسلامیہ) کے طلبہ کا ایک جلسہ ہو گا جس میں تقاریر طلبہ ہی کریں گے میری صرف شرکت ہو گی۔ لیکن ہوا یہ کہ بعد عصر تو ایک جلسہ حیدر آباد یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کے ہال میں ان ہی کی اجازت سے 'راس' نامی ایک سندھی ادبی و ثقافتی انجمن کے تحت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں حاضرین کا ذوق و شوق دیکھ کر راقم نے خود ہی کھلے دل سے تقریر کی۔ مغرب کے بعد مولانا نے اپنے مدرسے میں جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں بھی شرکاء کی کثرتِ تعداد اور پڑھے لکھے لوگوں کا ایک بڑا اجتماع دیکھ کر تقریر پر خود ہی انشراحِ صدر ہوتا چلا گیا۔ اُس سے فراغت ہوئی تو معلوم ہوا کہ گلا بالکل بیٹھ چکا ہے اور آواز بمشکل نکل رہی ہے۔ اور ابھی اس روز کا اصل جلسہ باقی ہے! بہرحال جیسے تیسے اصلاً اللہ کی تائید و توفیق کی امید کے سہارے اور کسی قدر ادویات سے مدد حاصل کر کے کمر ہمت کس کر لطیف آباد کے لیے روانگی ہوئی۔ وہاں پہنچ کر جو دیکھا تو فی الواقع 'جشن' کا سماں تھا۔ وسیع و عریض پنڈال جس کے آخر تک نگاہ بمشکل پہنچ رہی تھی۔ روشنیوں کا سیلاب، پرچم کشائی کی تقریب، زرق برق ماحول اور "فرزندانِ توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" اور اس پورے جشن کا واحد مقرر صرف یہ خاکسار! ایسے میں تو اگر جان ہونٹوں پر ہوتی تب بھی 'احقاقِ حق' اور 'ابطالِ باطل' کے لیے اللہ سے ذرا سی مہلت مانگ کر بھی تقریر کی کوشش فرض تھی۔ چنانچہ موضوع وہ لیا جو بظاہر اس قسم کی تقریب کے لیے بالکل "نامناسب" بلکہ 'متضاد' تھا۔ یعنی وہی "نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" ـــ اور بحمد اللہ دو گھنٹے سے

زایدتقریر ہوئی اور احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا ہو گیا اور پورے مجمع سے کسی اختلافی صدا کا اٹھنا تو در کنار کسی جانب سے کسی بے چینی تک کا ظہور نہ ہوا۔ حالانکہ سامعین میں اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو عرفِ عام میں "بریلوی" کہلاتے ہیں۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ ذوالفضل العظیم!

جمعہ ۲۲ر جنوری کو علی الصبح بذریعہ کار حیدر آباد سے کراچی آنا ہوا۔ جہاں پی ٹی آئی کے جناب عبدالصمد صاحب کی دعوت پر جامع مسجد عظمٰی میں جمعہ کی نماز پڑھائی اور قبل از نماز سیرت النبیؐ کے موضوع پر خطاب ہوا۔ وہاں بھی حاضری ہر حساب سے بالا تھی اس لیے کہ وہ مسجد آبادی کے بیچ میں واقع ہے۔ رات کو بعد نمازِ مغرب جامع مسجد قدوسی، ناظم آباد بلاک ۱۲ میں درس قرآن کی نشست ہوئی۔ جہاں سورۂ حجرات کی آیات ۱۴ و ۱۵ کا درس ہوا۔ اس میں بھی لوگوں نے نہایت کثیر تعداد میں شرکت کی۔

ہفتہ ۲۳ر جنوری کو قبل از دوپہر سندھ میڈیکل کالج میں خطاب ہوا۔ اور سہ پہر کو چیمبر آف کامرس کراچی میں۔ جس کے بارے میں متعدد لوگوں نے بتایا کہ چیمبر کے زیرِ اہتمام کسی جلسے میں آج تک اتنی حاضری نہیں ہوئی ــــ اسی رات کو پی آئی اے سے لاہور آنا ہوا لیکن صرف ایک رات کے لیے۔

۲۴ر کی شام کو پھر ملتان کے لیے شدِّ رحال ہو گیا۔ جہاں مدرسہ تعلیم الابرار کے مولانا ابوالحسن قاسمی صاحب کے زیرِ اہتمام ملتان کارپوریشن کے جناح ہال میں جلسہ سیرت النبیؐ سے خطاب ہوا۔ جہاں ہال میں تو صدرِ جلسہ جناب میجر جنرل راجہ سروپ خاں صاحب (ڈی ایم ایل اے) کے بقول واقعۃً "تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی" اور ہال کی تنگ دامانی کے باعث بہت سے لوگوں کو نامراد واپس جانا پڑا۔ اسی رات کو بذریعہ شاہین ایکسپریس ملتان سے ڈہرکی جانا ہوا۔

۲۵ر جنوری کی شام کو ڈہرکی میں واقع 'ایکسون' کے عظیم الشان کھاد بنانے کے کارخانے میں ایک اجتماعِ خواتین میں شرکت ہوئی اور رات کو جلسۂ سیرت النبیؐ سے خطاب ہوا۔

۲۶ر کی صبح ڈہرکی سے بذریعہ کار سکھر جانا ہوا جہاں (i) بعد نمازِ ظہر ایک ظہرانہ جیمخانہ کلب میں ہوا جس میں خاصی تعداد میں شہر کے کاروباری حضرات اور ضلعی افسران شریک ہوئے۔ (ii) عصر تا مغرب ایک تقریر ریلوے ہائی اسکول میں ہوئی اور (iii) بعد نمازِ عشاء 'اللہ والی مسجد'، بندر روڈ، میں سیرت النبیؐ پر تقریر ہوئی جو شرکاء کی تعداد اور ان کے ذوق و شوق کے باعث سوا دو گھنٹے سے بھی تجاوز کر گئی۔ چنانچہ بھاگم بھاگ ہی روہڑی ریلوے سٹیشن پہنچنا ہوا۔ جہاں تیز گام پلیٹ فارم پر گویا 'منتظر' ملی جس سے ۲۷ر جنوری دوپہر کے وقت لاہور واپسی ہوئی!

اور آج ۲۸ر جنوری ۸۲ء کو جب یہ سطور سپردِ قلم ہو رہی ہیں تو ذہن پر ایک خوف کی سی کیفیت طاری ہے ــــ کہ کل جمعہ ہے، اور پرسوں پھر پشاور اور راولپنڈی و اسلام آباد کے لیے روانگی ہے۔ واپسی

پر دو دن تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلسِ مشاورت کا اجلاس جاری رہے گا۔ پھر جمعہ آئے گا اور اس کے بعد پھر آزاد کشمیر کے لیے رختِ سفر باندھنا ہوگا ــــ الغرض ـــــ " چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے !" ـــــ اور ادھر خدا گواہ ہے کہ حال یہ ہے کہ طبیعت تقاریر سے اکتا ہی نہیں گئی شدید بیزار ہو چکی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک بار بتایا تھا کہ اوائل عمر میں کسی دینی خدمت کے سلسلے میں انہیں کچھ عرصہ رنگون رہنا پڑا تھا تو وہاں روٹی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً مسلسل ڈبل روٹی کھانی پڑی۔ نتیجۃً اُس کے بعد ان کی طبیعت ڈبل روٹی کی جانب کبھی مائل نہ ہوئی۔ کچھ ایسا ہی حال اس وقت تقریروں کے باب میں راقم الحروف کا ہے ـــــ لیکن تقاضوں اور مطالبوں کا سیلاب ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اور التجاء اور خوشامد کے علاوہ سفارشوں کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے ـــــ گویا ؎

" رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے!
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!!"

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

دو۲ سالہ تدریسی کورس

کے سالِ اوّل کی رُوداد

(ماخوذ از 'حکمتِ قرآن' مئی ۱۹۸۵ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی۔

اس کے پیشِ نظر جہاں (۱) "عربی زبان کی تعلیم و ترویج" (۲) "قرآن مجید کے مطالعے کے عام ترغیب و تشویق" اور (۳) "علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت" ایسے 'عمومی مقاصد' تھے وہاں (۴) "ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّمِ قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں" اور (۵) "ایک ایسی 'قرآن اکیڈمی' کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے" ــــ ایسے 'معیّن منصوبے' بھی تھے۔

قرآن اکیڈمی کا سنگِ بنیاد ۱۹۷۶ء میں رکھا گیا۔

پانچ سال کے عرصے میں تعمیرات کی معتدبہ حد تک تکمیل اور راقم الحروف اور بعض رفقائے کار کی رہائش اور انجمن کے دفاتر کی منتقلی کے ابتدائی اقدامات کے بعد ۱۹۸۱ء میں متذکرہ بالا 'معیّن ہدف' کی جانب پیشقدمی کا آغاز ہُوا۔

چنانچہ ۱۹۸۲ء میں 'قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم' کا اجراء ہُوا۔ جس میں ۷ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تعلّمِ قرآن کے لیے پوری زندگی وقف کرنے کے عزم کے ساتھ شریک ہوئے۔

راقم الحروف کے لیے یہ امر نہایت موجبِ اطمینان و امتنان ہے کہ قرآن حکیم کی ہدایت "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اور دعوت و اصلاح کے عمل کے اصل الاصول یعنی "الاقدم فالاقدم" کے عین مطابق اور ایک انگریزی کہاوت "CHARITY BEGINS AT HOME" کے مصداق راقم کے دو فرزند بھی ان سات خوش قسمت نوجوانوں میں شامل ہیں۔

ان نوجوانوں کی دو سالہ تدریس کی تکمیل کے بعد محسوس ہُوا کہ جذبہ اور خلوص کے باوصف تخلیقی و تحقیقی کام کی صلاحیت و اہلیت سب لوگوں میں نہیں ہوتی ــــ چنانچہ اُن میں سے دو نوجوانوں کو تو اُن کی خواہش

پر آزاد کر دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے CAREERS کو جاری رکھتے ہوئے آزادانہ دین کی خدمت اور دعوت و تبلیغ میں اُس صلاحیت و استعداد کو بروئے کار لائیں جو انہیں دو سالہ تدریس سے حاصل ہوئی ہے۔ باقی پانچ نوجوان بحمداللہ مزید حصولِ علم کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے انجمن کے تحت دعوتی و تبلیغی، تدریسی و تعلیمی اور تنظیمی و انتظامی شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

گذشتہ سال فیصلہ کیا گیا کہ پوری زندگی کو وقف کرنے کا عہد (COMMITMENT) لئے بغیر ذرا زیادہ تعداد میں نوجوانوں کو ایک دو سالہ تدریسی کورس میں شرکت کی دعوت دی جائے اور ضرورت ہو تو انہیں ان کے تعلیمی معیار کی مناسبت سے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ تخلیقی و تحقیقی کام کی صلاحیت و استعداد کے حامل نظر آئیں انہیں مستقل فیلوشپ سکیم میں شامل کر لیا جائے۔

اس کے لیے اصلاً تو انہی لوگوں کو ترغیب دلائی گئی جو ایک عرصے سے راقم الحروف کے ساتھ وابستہ ہیں اور انجمن خدام القرآن یا تنظیم اسلامی میں سرگرم عمل ہیں لیکن ایک دعوتِ عمومی کے لیے اس اسکیم کی تشہیر جرائد کے ذریعے بھی کی گئی ـــــ جس کے نتیجے میں اخبارات کے صفحات میں بعض حاسدین اور ناقدین کی جانب سے چہ میگوئی (CONTROVERSY) بھی شروع کی گئی جس کا بر وقت جواب دے دیا گیا۔

بحمداللہ اس دو سالہ تدریسی کورس کا پہلا تعلیمی سال اس شعبان المعظم میں مکمل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

(۱) اس کورس کا آغاز چالیس شرکاء سے ہُوا تھا لیکن دورانِ سال مختلف اسباب کی بنا پر نو شرکاء ہمت ہار گئے۔ ایک صاحب ایک ماہ کی تاخیر سے شامل ہوئے اس طرح پہلے تعلیمی سال کی تکمیل کرنے والے شرکاء کی تعداد ۳۲ بتیس ہے۔

(۲) ان میں ایک تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ چالیس ۴۰ سال سے زائد عمر کے شرکاء چھ ہیں، تیس ۳۰ اور چالیس ۴۰ سال کے مابین گیارہ ۱۱ اور تیس ۳۰ سال سے کم عمر کے پندرہ ۱۵۔

(۳) ایک دوسری تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ بیس خود کفیل اور غیر مؤظف تھے۔ جبکہ صرف بارہ شرکاء کو مختلف مقدار میں ماہانہ وظیفہ دیا گیا۔

(۴) ان کی تعلیمی قابلیت کا چارٹ حسب ذیل ہے:

ایم بی بی ایس	۲	بی ڈی ایس	۱
بی وی ایس سی	۱	چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ	۱
بی ایس سی انجینئرنگ (مکینکل)	۲	بی ایس سی، اے ایم آئی ای (سول)	۱
ایم ایس سی	۲	ایم اے	۳

بی ایس سی	۲	بی اے	۸
ایف اے	۴	مختلف ڈپلومہ ہولڈرز	۵

دو سالہ تدریسی کورس کے سالِ اوّل کی تکمیل کرنے والے شرکاء میں سے بعض کا معاملہ واقعۃً قابلِ ذکر ہی نہیں قابلِ رشک اور قابلِ تقلید بھی ہے لہٰذا اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ کی عمر ۵۰ برس ہے۔ اور وہ وسّن پورہ اور شادباغ کے علاقے کے مصروف ترین میڈیکل پریکٹیشنر ہیں لیکن انہوں نے اس کورس کے دوران صرف شام کا مطب کرنے اور صبح کا پورا وقت خالص طالب علمانہ انداز میں حصولِ علم میں مشغول رہنے کی جو مثال قائم کی ہے وہ یقیناً قابلِ رشک ہے۔

(۲) بالکل یہی معاملہ میرے برادرِ خورد وقار احمد سلمہٗ کا ہے کہ انہوں نے بھی ۴۴ سال کی عمر میں اور ایک مصروف کاروباری زندگی گزارتے کے باوصف (وہ کئی تعمیراتی ٹھیکے لینے والی اور تعمیراتی سامان بنانے والی کمپنیوں کے ڈائرکیٹر ہیں) بالکل طالب علمانہ انداز میں عربی زبان کے ابتدائی قواعد یاد کئے۔ اور ثقیل تعلیم کو خندہ پیشانی سے پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ نباہا اور امتحانات میں اکثر اعلیٰ پوزیشن حاصل کرتے رہے۔

(۳) ایک اعتبار سے ان دونوں سے بھی بڑھ کر مثال قائم کی ہے میاں محمد رشید صاحب نے کہ ساٹھ برس کی عمر میں پوری پابندی کے ساتھ تحصیلِ علم میں لگے رہے اور بہت سوں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال بن گئے۔

(۴) ایک اور اہم مثال میاں محمد نعیم صاحب کی ہے ـــ (عمر ۲۹ سال) جو جیالوجیکل سروے آف پاکستان میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں اور کوئٹہ میں تعینات ہیں۔ انہوں نے بلا تنخواہ رخصت حاصل کی۔ اہل وعیال سمیت شدِّ رحال کیا اور خالص طالب علمانہ انداز میں علم حاصل کیا۔

(۵) اسی سے ملتا جلتا معاملہ میرے دامادِ کلاں محمود عالم میاں کا ہے جو ایم ایس سی کیمسٹری ہیں اور پی۔سی۔ایس آئی۔آر میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی رخصت حاصل کی اور اپنی اہلیہ (میری بڑی بچّی) سمیت اس کورس میں شرکت کی۔ الحمد للہ کہ دونوں کا ریکارڈ بہت اچھا رہا بلکہ میری بچّی نے بفضلہ تعالیٰ تین بچّوں کی ماں ہونے کے باوجود حیرت انگیز ترقی کی اور بہت سے امتحانات میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

(۶) ایسی ہی ایک قابلِ تنبیہ مثال چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب کی ہے وہ اے جی آفس میں سپرنٹنڈنٹ ہیں لیکن انہوں نے بھی طویل رخصت حاصل کی اور اپنی بچّی سمیت اس کورس میں شرکت کی۔ ان دونوں باپ بیٹی نے بھی بحمد اللہ نمایاں استعداد حاصل کی۔

(۷) میرے دوسرے داماد ڈاکٹر عبد الخالق، بی ڈی ایس ڈینٹل سرجن نے بھی اپنا مطب صرف شام

کے اوقات میں کرلیا اور اس کورس میں باضابطہ شرکت کی۔

(۸) ایک اور بہت شاندار مثال اشفاق احمد صاحب کی ہے کہ وہ تازہ تازہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنے ہیں، اور حال ہی میں ایک معقول ملازمت کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے ایک بار ان سے سرسری طور پر کہہ دیا کہ کیوں نہ آپ بھی اس کورس میں شرکت کرلیں۔ اُس اللہ کے بندے نے فوراً اپنی فرم سے بات کرکے اپنے کام کے لیے شام کے اوقات طے کرالیے اور اگرچہ اُن کی تمام کی تمام تعلیم انگریزی سکولوں میں ہوئی تھی، اور عربی کجا اردو تک سے بہت کم شناسائی تھی تاہم انہوں نے نہایت شدید محنت کرکے اس کلاس کے ساتھ قدم ملا کر دکھا دیئے! اللہ مزید ہمت عطا فرمائے اور دین کے لیے ہمہ تن قبول فرمالے!

(۹) ایسی ہی ایک اور شاندار مثال محمد صادق صاحب کی ہے۔ یہ تینتیس سالہ نوجوان بی ایس سی ہیں اور سعودی عرب میں ایک تعمیراتی فرم میں میٹریل انسپکٹر کی حیثیت سے کئی ہزار ریال ماہانہ پر ملازم تھے۔ انہوں نے جیسے ہی 'میثاق' میں اس کورس کا اعلان پڑھا فوراً ملازمت کو خیر باد کہی اور کورس میں آ شامل ہوئے۔ اگرچہ وہاں کے معاملات کو نبٹانے میں کچھ وقت لگ گیا۔ چنانچہ اُن کی کورس میں شمولیت ایک ماہ تاخیر سے ہوئی۔

(۱۰) اسی طرح جاوید اسلم صاحب نے جو بی ایس سی مکینکل انجینئر ہیں اور ایک کارخانے میں کام کرتے ہیں اپنی ڈیوٹی مستقلاً شام کی شفٹ میں لگوائی ۔ اور اس کورس میں شرکت کرلی۔

(۱۱) کراچی کے محمد یامین صاحب کی مثال بھی قابلِ رشک ہے۔ وہ ایم اے اسلامیات کے علاوہ آٹوموبائل میں ڈپلومہ رکھتے ہیں اور پاکستان کی فضائی فوج میں ملازم ہیں۔ انہوں نے بھی وہاں سے بلاتنخواہ رخصت حاصل کی، مع اہل و عیال لاہور آئے اور کورس میں شرکت کی!

(۱۲) ایسی ہی مثال ایک پٹھان نوجوان محمد سلیمان کی ہے، جو مردان کے رہنے والے ہیں اور مرکزی حکومت کے کسی محکمے میں سٹینو ٹائپسٹ ہیں انہوں نے بھی بلاتنخواہ رخصت حاصل کی اور کورس میں شریک ہوگئے۔

(۱۳) صوبہ سرحد کے ایک اور نوجوان اختر منیر نے ایم اے اسلامیات کے بعد کراچی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا اور پڑھائی شروع کردی تھی کہ اچانک اخباری اعلان نظر سے گذرا ۔ اور وہ ایل ایل بی کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرکے اس کورس میں آ شریک ہوئے۔

(۱۴) اس کورس کے بقیہ شرکاء میں سے بھی ہر ایک کا معاملہ کسی نہ کسی اعتبار سے قابلِ ذکر ہے لیکن بغرضِ اختصار بقیہ حضرات کے صرف نام اور تعلیمی کوائف درج کیے جارہے ہیں:-

حافظ خالد محمود	ایم اے (اسلامیات)	میانوالی
اسد الرحمٰن فاروقی	بی ایس سی انجینئرنگ (مکینکل)	کراچی
محمد اسلم قاضی	بی وی ایس سی	لاہور

عبدالرزاق	بی اے	لاہور	محمد اشرف	بی اے	لاہور

جاوید رفیق ״ ״ مختار احمد خان ״ ״

کلیم الرحمٰن ״ ״ غلام سلطان ״ آزاد کشمیر

محمد غوری صدیقی ڈپلوما اِن سول انجینئرنگ لاہور

شکیل احمد ایف اے لاہور محمد افتخار تاج ایف اے لاہور

نعیم اختر ״ ״ محمد ارشد چیمہ ״ ״

شعیب الرحیم انصاری ״ کراچی

میاں ساجد حمید ڈپلوما اِن الیکٹرانکس لاہور

محمد اشرف بیگ ڈپلوما اِن کامرس ״

(۱۵) چونکہ رفاقت سکیم کے ضمن میں آیت قرآنی " قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ " کا ذکر ہوا تھا، لہٰذا یہاں مناسب ہے کہ تحدیثاً للنعمۃ یہ ذکر بھی ہو جائے کہ اس دو سالہ کورس کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو " وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ " کی ایک حقیر سی مثال پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس ضمن میں بھائی، بیٹی اور دو دامادوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس لسٹ کی تکمیل ہوتی ہے میرے ایک اور داماد اور حقیقی بھتیجے عزیزم حمید احمد سلمہٗ کے ذکر پر جو بی ایس سی ہیں اور متعدد تعمیراتی لمیٹڈ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں لیکن الحمدللہ کہ اس کورس میں بھی پوری تندہی اور پابندی سے شریک رہے ہیں اور اُن کے والد اور میرے برادرِ خورد اقتدار احمد سلمہٗ کا ارادہ ہے کہ اپنی اولاد میں سے انہیں دین کی خدمت کے لیے بالکلیہ وقف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ قبولِ حسن سے نوازے۔ آمین۔

افسوس صد افسوس کہ ہمارے خاندان کا یہ گلِ نوشگفتہ قضائے الٰہی کو کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا اور "گلچیں یہ تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا" کے مصداق اسے تقدیر کے دستِ حنائی نے چُن لیا۔ اور اُس نے اسے ہمارے لئے توشۂ آخرت کے طور پر قبول فرما لیا۔ چنانچہ ۱۷ ستمبر ۸۶ء کو اُن عزیز نے اپنے بہنوئی اور ہمارے بھانجے عبداللہ طاہر کے ساتھ ایک سڑک کے حادثے میں راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

ہم ان تمام ادھیڑ عمر اور نوجوان شرکاءِ کورس کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ جو استعداد انہوں نے اس محنت و مشقت اور ایثار و قربانی سے حاصل کی ہے وہ دین کی خدمت میں باحسن وجوہ استعمال ہو۔

یہ تذکرہ بھی نامکمل رہے گا اور شدید حق تلفی بھی ہو گی اگر ہم یہاں اُستاذ مکرم حافظ احمد یار صاحب کا شکریہ ادا

نہ کریں جنہوں نے نہایت جانفشانی و تن دہی اور دلی لگن کے ساتھ تدریس فارسی و عربی کے فرائض سرانجام دیئے اور اپنے شاگردوں کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ انہیں عمرِ دراز عطا فرمائے اور صحت و عافیت سے رکھے تاکہ وہ انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمی کے ساتھ اپنا عملی تعاون اسی طرح جاری رکھ سکیں۔

حافظ صاحب محترم سے انجمن خدامُ القرآن سے دلچسپی رکھنے والے اکثر حضرات بخوبی واقف ہیں اس لیے کہ وہ انجمن کے زیرِ اہتمام جملہ قرآن کانفرنسوں اور تمام محاضراتِ قرآنی میں بلا استثناء واحد حصہ لیتے رہے ہیں۔ غیر متعارف حضرات کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ حافظ صاحب پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ علومِ اسلامیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علوم دینی میں مہارت کے علاوہ فنِ تدریس میں خصوصی ملکہ عطا فرمایا ہے اور ان شاء اللہ وہ ہمارے اس تدریسی پروگرام کے مستقل مدرّس رہیں گے۔

اسی طرح کا ایک شکریہ واجب ہے علامہ سید غلام شبیر بخاری صاحب کے لیے جنہوں نے گاہے گاہے تکلیف فرما کر ان طالبانِ علم کو فارسی کی ادبیاتِ عالیہ بالخصوص مولانا رومیؒ اور علامہ اقبال مرحوم کے کلامِ ترجمان القرآن سے متعارف کرایا۔

اسی طرح حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق سخت ناانصافی اور حق تلفی ہو گی اگر اُن حضرات کا بھی شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے اس دوسالہ تدریسی اسکیم کے ضمن میں انجمن کے ساتھ خصوصی مالی تعاون کیا۔

اس موقع پر یاد آیا کہ لگ بھگ چھ ماہ قبل جب پاکستان کے اخبارات میں اس دوسالہ تدریسی کورس پر چہ میگوئی کا سلسلہ جاری تھا اور بعض حضرات کی تحریروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت اچنبھے میں ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد ایسے درویش کے پاس اتنا سرمایہ کہاں سے آگیا کہ وہ ایک ایک ہزار اور آٹھ آٹھ سو روپے وظیفہ دینے کو تیار ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے حسبِ عادت، کچھ اشارے کنایے میں امریکی یا سعودی امداد کی بات (یعنی ڈالر اور پیٹرو ڈالر) کی بات بھی کی تھی تو اس کے ضمن میں ذہن بے ساختہ منتقل ہُوا تھا سورۂ المنافقون کی اس آیۂ مبارکہ کی جانب:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

تاہم یہ بات تو برسبیلِ تذکرہ قلم پر آگئی ، اصل میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اُن دنوں محترم ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی (ایبٹ آباد) کا ایک خط راقم کے نام آیا تھا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ "تم مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے قائم کردہ 'دارالارشاد' کا نام تو لیتے ہو لیکن کیا انہوں نے بھی وظائف دیئے تھے ـــــ اور کیا معاوضے اور تنخواہ پر ایسا عظیم الشّان اور جلیلُ القدر کام ہو سکتا ہے ؟" (روایت بالمعنیٰ) اس وقت تو میں نے اُن کے ادب و احترام کے باعث انہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن ـــ آج اُن کی اور اُن کی طرز پر سوچنے والے دُوسرے حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ دیکھ لیجئے ! ہماری اس اسکیم کے ۳۲ بلکہ (ڈاکٹر) بچپولی سمیت ۳۳ شرکا میں سے صرف ۱۲ مُوظّف ہیں اور بیس بلکہ ۲۲ غیر مُوظّف ـ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اصل بات یہی ہے کہ لوگوں میں اس درجہ جذبہ (MOTIVATION) پیدا کر دیا جائے کہ وہ ایثار اور قربانی سے کام لیں ـ اور حتی الامکان رضا کارانہ بلا معاوضہ خدمات سرانجام دیں ـــــ لیکن اس تصوّر پسندی یعنی (IDEALISM) کے ساتھ ساتھ ہمیں واقعیت پسندی یعنی (REALISM) کے دامن کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑ دینا چاہیئے ـ ہمارے یہاں کے معاشی و معاشرتی حالات میں کتنے نوجوانوں کے لیے یہ بالفعل قابلِ عمل ہے کہ وہ اپنی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کی تکمیل کے بعد خالص دین کے علم کی تحصیل بھی اپنے ذاتی اخراجات خود برداشت کرتے ہوئے کر سکیں ـ ظاہر ہے کہ اکثر حالات میں قابلِ عمل (PRACTICABLE) شکل یہی ہے کہ اس کام کی ابتداء کو آسان بنایا جائے پھر اُن میں سے جو واقعتہً اپنے اندرونی جذبے سے متحرک (MOTIVATE) ہو جائیں گے ـــ وہ ان شاء اللہ فاقے برداشت کر کے بھی کام کرتے رہیں گے

تحریک رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل :

دورۂ ترجمۂ قرآن

۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۹ء تک کے تدریجی سفر کا ایک جائزہ

مرتب : فرقان دانش خان

قرآن حکیم سے تجدید تعلق کی ہمہ گیر تحریک

۱۹۶۵ء میں جب محترم ڈاکٹر اسرار احمد غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد اور تعلّم و تعلیم قرآن کی منظم منصوبہ بندی کے ساتھ مستقل طور پر لاہور منتقل ہوئے تو تحریک دعوت رجوع الی القرآن کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی۔ اگرچہ اس وقت آپ نے تن تنہا لاہور کی مختلف مساجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن آپ اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے۔ اللہ نے آپ کو جذب اندروں بھی عطا کیا تھا اور تاثیر بھی۔ یہ وہ وقت تھا جب مساجد میں دعوت و تبلیغ' خطبہ و وعظ' غرضیکہ سب کچھ ہوتا تھا' مگر درس قرآن نہیں ہوتا تھا۔ لوگ قرآن کو اجنبی اور غیر متعلق کتاب سمجھتے تھے۔ ان ناموافق حالات کے باوجود محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے ہمت نہ ہاری اور لاہور کی مختلف آبادیوں میں درس قرآن کے متعدد حلقے قائم کر لئے۔ ان کی یہی پکار تھی کہ قرآن مجید کو تہہ دل سے اللہ کی کتاب مانا جائے' اسے پڑھا جائے' اسے سمجھا جائے' اس پر عمل کیا جائے اور اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی اس کاوش کو شرف قبولیت عطا کیا اور جسمانی امراض کے ڈاکٹر کو انسانوں کے روحانی معالج کے طور پر منتخب کر لیا۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے ایک بیٹھک سے شروع ہونے والے درس قرآن نے مسجد خضراء سمن آباد' مسجد شہداء ریگل چوک اور جامع مسجد دارالسلام باغ جناح میں گویا شیخ الہند مولانا محمود حسن ؒ کی خواہش کی تکمیل کے طور پر حقیقتاً عوامی درس قرآن کی شکل اختیار کر لی۔ دروسِ قرآن کا یہ سلسلہ چھ برس اس شان سے جاری رہا کہ کوئی ادارہ موجود تھا نہ انجمن' یہ سب کام انفرادی سطح پر ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ڈاکٹر صاحب کو ہم خیال افراد ملتے گئے' جنہوں نے ایک قافلے کی صورت اختیار کی تو ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور وجود میں آ گئی۔ یہ قافلہ اور آگے بڑھا تو ڈاکٹر صاحب نے قرآنی معاشرے کی تشکیل اور فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے لئے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں آپ نے انجمن خدام القرآن کے صدرِ مؤسس

کی حیثیت سے ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کی داغ بیل ڈالی اور ۱۹۸۷ء میں قرآن کالج قائم کیا۔ یہ سفر جاری رہا اور رجوع الی القرآن اور تعلیم و تعلّم قرآن کی اس تحریک کا حلقہ اندرون ملک پھیلتے پھیلتے بیرونی دنیا میں بھی وسیع ہو گیا۔ پھر وہ وقت آیا کہ اللہ کی رحمت سے امت کا ایک قابل ذکر طبقہ قرآن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کہیں قرآن کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔ کہیں فہم قرآن کے حلقے قائم ہونے لگے۔ آج اگر کہیں قرآن کے نام سے کوئی محفل یا ادارہ قائم ہوتا نظر آتا ہے یا کہیں درس قرآن کا غلغلہ ہے تو اکثر و بیشتر وہ ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریک دعوت رجوع الی القرآن کے شجر ہی کا کوئی ثمر یا برگ و بار ہے۔

اسی تحریک کے زیر اثر ڈاکٹر اسرار احمد نے ۱۹۸۴ء میں جامع القرآن 'قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور' میں رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کے نام سے قرآن کو سمجھانے کے پروگرام کا آغاز اس طور سے کیا کہ ہر چار رکعت نماز تراویح سے قبل اس میں سنائی جانے والی آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کر دی جاتی کہ پھر نماز تراویح میں سامعین جب ان آیات قرآنی کو سنتے تو ان کا مفہوم بہت حد تک ذہن میں مستحضر ہوتا۔ زمانہ قریب کی معلوم و مشہور تاریخ میں ایسا پروگرام پہلی بار ہوا تھا۔ اُن دنوں چونکہ شدید گرمیوں کا زمانہ تھا اور راتیں مختصر تھیں' پروگرام رات کے دو' اڑھائی بجے ختم ہوتا تھا کہ سامعین کے لئے اپنے گھروں تک پہنچ کر سحری کرنے کے لئے وقت بمشکل بچتا تھا لہٰذا شروع شروع میں یہ کام ناممکن العمل نظر آتا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ سلسلہ اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھی متعارف ہو گیا۔ اب صورت یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے علاوہ ان کے بیسیوں شاگردان رشید ہر سال نہ صرف ملک کے گوشے گوشے میں قرآنی علوم و معارف کی ان انوار و برکات بھری محفلوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ بیرونی دنیا میں بھی ان پروگراموں کو پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن کی حکمت

انسانی وجود روح اور جسد خاکی کا مرکب ہے۔ ان دونوں کے تقاضے مختلف ہی نہیں متضاد بھی ہیں۔ اگر جسد انسانی کی رُوحِ انسانی پر سے گرفت ڈھیلی کر دی جائے تو رُوح کو آسودگی اور سیرابی کا موقع میسر آتا ہے۔ جبکہ روح کی بھوک کی سیری اور پیاس کی آسودگی کا موثر ترین ذریعہ قرآن ہے۔ کیونکہ رُوحِ انسانی اور کلامِ ربانی کا اپنی اصل کے اعتبار سے آپس میں گہرا قرب و تعلق ہے۔ ایک بزرگ کے بقول "یہ دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک میں اہل ایمان کو دو گونہ پروگرام عطا کیا گیا ہے۔ یعنی دن کا "روزہ" اور رات میں دورانِ قیام "قرآن کا پڑھنا یا سننا"۔ کیونکہ روزہ جسد انسانی کے ضعف و اضمحلال کا سبب بنتا ہے۔ ایسے میں کلام ربانی کا سمجھ کر پڑھا جانا روح انسانی کے لئے بیش بہا خیر و برکت کا باعث بنتا ہے۔ اور فیوض و برکات کی یہ بارش کشت قلوب کی آبیاری کا

بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ نماز تراویح میں ہمارے ہاں حفاظ کرام (الا ماشاء اللہ) خود بھی ان آیات کا مطلب نہیں سمجھتے' بے چارے نمازیوں کا تو کہنا ہی کیا۔ لہٰذا نماز تراویح کا مقصد بھی تلاوت قرآن کی طرح صرف ثواب کا حصول رہ گیا ہے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ تراویح کے ذریعے روح کی تقویت کا سامان کیا جائے' قرآنی احکامات کو سمجھا جائے تاکہ ان پر عمل کے ذریعے اخروی نجات ممکن ہو سکے۔ انہی مقاصد کے حصول کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے نماز تراویح میں دورۂ ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔

دورۂ ترجمۂ قرآن کا طریقہ کار

نماز تراویح میں دورۂ ترجمہ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ نماز عشاء کے فرائض و سنن کی ادائیگی کے بعد ہر چار رکعت نماز تراویح میں پڑھی جانے والی آیات کا پہلے ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے۔ شرکاء قرآن کھول کر ایک ایک لفظ کا مفہوم ذہن نشین کرتے جاتے ہیں' پھر نماز تراویح میں حافظ صاحب "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلاً" کا حق ادا کرتے ہوئے ان آیات کی ٹھہر ٹھہر کر چار رکعات میں تلاوت کرتے ہیں۔ اس طرح مقتدیوں کو نماز تراویح کے دوران ان آیات کا مفہوم و مطلب سمجھ میں آنے کے باعث کسی درجے میں وہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے جسے اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

اگرچہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے رمضان میں رات کے قیام کو نفلی عبادت کا درجہ دیا ہے' لیکن احادیث مبارکہ میں ماہ رمضان میں رات کے قیام بالقرآن کے لئے جو تشویق و ترغیب ملتی ہے اس سے اس معاملے کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ جو لوگ رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمۂ قرآن کے اس پروگرام میں اول تا آخر شریک رہتے ہیں وہ ایک ماہ میں قرآن کے مطالب سے اس طور گزر جاتے ہیں کہ قرآن کریم کا انقلابی تاثر انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کی زندگیوں میں لازماً تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور وہ نہ صرف خود قرآن کے عامل بن جاتے ہیں۔ بلکہ قرآن کے داعی بن کر چہار دانگ عالم میں اس کی روشنی پھیلانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ذیل میں دورۂ ترجمۃ القرآن کے آغاز سے اب تک اہم پروگراموں کی مختصر رُوداد پیش کی جا رہی ہے تاکہ تحریک دعوت رجوع الی القرآن کی تاریخ کا یہ اہم باب آئندہ قرآن کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے رجالِ دین کی رہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔

سلسلہ ہائے دورۂ ترجمۂ قرآن کا افتتاحی پروگرام (۱۹۸۴ء)

۱۹۸۴ء میں رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ جون کے مہینے میں سایہ فگن ہوا۔ اس سے پہلے چند

سالوں سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ معمول تھا کہ نماز تراویح میں تلاوت کردہ حصے کے اہم مطالب و مفاہیم پر روشنی ڈالا کرتے تھے۔ اس طرح یہ پروگرام نصف شب سے پہلے ہی ختم ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن ۱۹۸۴ء میں محترم ڈاکٹر صاحب کے دل میں اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس رمضان المبارک میں ہر چار رکعتوں میں پڑھے جانے والے قرآن حکیم کا رواں ترجمہ اور مختصر تشریح ساتھ ساتھ بیان کی جائے۔ اس خیال کی وجہ وہ احادیث بنیں جن میں رمضان المبارک کے تزکیۂ نفس کے پروگرام کے دو حصے بتائے گئے ہیں۔ یعنی ایک دن کا روزہ اور دوسرے رات کا قیام اور اس میں قراءت و استماع قرآن۔ اگرچہ ان میں سے پہلی شق فرض کے درجے میں ہے اور دوسری بظاہر نفل کے' تاہم قرآن مجید اور احادیث مبارکہ اشارۃً یہ بات واضح ہے کہ قیام الیل رمضان المبارک کا جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ رمضان المبارک کی پہلی شب چاند کی رویت کا تاخیر سے اعلان ہونے کے باعث دوسری رات سے قرآن اکیڈمی لاہور میں پہلی بار اللہ کی کتاب کو سمجھنے سمجھانے کا یہ انوکھا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ ماضی میں اسی غرض سے بعض دینی درسگاہوں میں تراویح کے آخر یا ابتداء میں قرآن حکیم کے چیدہ چیدہ نکات کے بیان کے مبارک سلسلے شروع کئے گئے مگر انہیں بالعموم پذیرائی نہ مل سکی اور بعض مقامات پر اس قسم کی کوششوں کو جلد ہی بند کرنا پڑا' کجا یہ کہ پورے قرآن مجید کے ترجمے و تشریح کو بیان کرنے کی نوبت آتی۔ شاید اللہ کی مشیت میں اس مبارک کام کے آغاز کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت کا انتخاب ہو چکا تھا۔

پروگرام کی طوالت اور موسم کی شدت کے پیش نظر ابتداءً خیال یہ تھا کہ یہ پروگرام نہایت کٹھن رہے گا اور اس میں شرکاء کی تعداد بہت کم رہے گی۔ لیکن فرمان خداوندی "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" کے مصداق اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا اظہار اس طور سے ہوا کہ قرآن اکیڈمی میں موسم بہار کے جشن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پروگرام کے آغاز میں شرکاء کی تعداد تقریباً دو سو تھی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ آخری عشرہ میں تو یہ کیفیت تھی کہ ہر شب تقریباً سو سے زیادہ کاریں اور اسی قدر موٹر سائیکلیں جامع القرآن' قرآن اکیڈمی کے اطراف میں جمع ہو جاتی تھیں۔ بعض مرتبہ شرکاء کی تعداد سات سو سے بھی تجاوز کر گئی اور یہ صورت بھی پیش آئی کہ شرکت کے خواہش مند افراد کو جگہ نہ ملنے کے باعث واپس جانا پڑا۔ شرکاء کی کثیر تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل ہوتی تھی جن میں ڈاکٹرز' انجینئرز' پروفیسرز' وکلاء' ممتاز صنعت کار اور تاجر حضرات غرضیکہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔ خواتین کی اچھی خاصی تعداد بھی پروگرام میں شریک ہوتی رہی۔ چونکہ یہ پروگرام تقریباً رات دو بجے اختتام کو پہنچتا تھا۔ اور اس کے فوراً بعد سحری کھانے کا وقت ہوتا تھا۔ اس لئے بہت سے حضرات گھر پہنچ کر صرف سحری کھا پاتے اور نماز فجر کی ادائیگی کے باعث ان کی پوری رات ہی قیام اللیل کے اس پروگرام کی نذر ہو جاتی اور دن میں اپنے معمولات و مشاغل کی ادائیگی کے باعث آرام کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ تاہم اس کے باوجود عام تاثر یہ تھا کہ یہ پروگرام اتنا مفید اور پرکشش

ہے کہ پوری رات جاگنے کے باوجود کسی مرحلے پر بھی بوریت یا گرانی کا احساس نہیں ہوتا۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل اور اس کے کلام کی برکت کا مظہر تھا کہ صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ تجربہ حسنِ سماع اور حسنِ شعور و حسنِ معنی کا امتزاج جمیل ہونے کے باعث دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک کے سفر کی قرآن فہمی اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کی منزل کی طرف پیش قدمی کے ضمن میں ایک بھرپور قدم ثابت ہوا۔ یہ پروگرام ۹۰ منٹ کے ۵۵ آڈیو کیسٹس پر ریکارڈ ہوا۔ دورہ ترجمہ قرآن کے اس پہلے پروگرام کی مفصل رپورٹ میثاق کے اگست ۸۴ء کے شمارے میں محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے قلم سے شائع ہوئی تھی۔

۱۹۸۵ء میں ہونے والے دورۂ ترجمۂ قرآن کی تفصیلات

گزشتہ سال کی افادیت اور لوگوں کے ذوق و شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سال بھی قرآن اکیڈمی لاہور میں رمضان المبارک کے دوران نماز تراویح کے ساتھ محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے قرآن حکیم کا ترجمہ و تشریح بیان کرنے کا اہتمام کیا۔ مئی اور جون کے شدید ترین گرم موسم کے باوجود قرآن حکیم سے محبت و شغف اور وابستگی رکھنے والے حضرات نے رمضان کے دوران دن میں روزہ کی مشقت برداشت کی اور راتیں اس کیفیت میں گزاریں کہ یا تو تراویح میں قرآن مجید کی سماعت ہو رہی ہے یا پھر توجہ و انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ قرآن کے علوم و معارف اور احکامات کو ذہن و قلب میں اتارا جا رہا ہے۔ یہ پروگرام بھی عموماً سوا دو بجے ختم ہوتا جس کے ساتھ ہی سحری کا وقت شروع ہو جاتا۔ اس پروگرام کے دوران کئی آزمائشیں بھی آئیں' مثلاً پہلے عشرہ کے دوران امیر تنظیم اسلامی کو مسلسل حرارت رہی مگر آپ نے دن بھر دفتری و انتظامی امور کی مشغولیت کے باوجود اللہ کی توفیق سے رات کا پروگرام جاری رکھا۔ اسی طرح دوسرے عشرے میں نماز تراویح میں قرآن سنانے والے جناب حافظ رفیق صاحب کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا' جس کی وجہ سے وہ یہ ذمہ داری پوری نہ کر سکے۔ ۱۴/ رمضان سے نماز تراویح میں قرآن پڑھنے کی ذمہ داری حافظ عاکف سعید نے سنبھالی لیکن اگلے روز افطار سے آدھ گھنٹہ قبل عاکف صاحب کے صاحبزادے حسین عاکف جن کی عمر بمشکل دو برس تھی' کا ناگہانی طور پر بجلی کا کرنٹ لگنے سے انتقال ہو گیا۔ اس موقع پر عاکف سعید صاحب نے اللہ کی تائید و توفیق سے بے انتہا صبر و استقامت سے کام لیا اور آخر تک اس ذمہ داری کو نبھایا۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کا یہ پروگرام ۶۰ منٹ کی ۸۳ آڈیو کیسٹس پر ریکارڈ ہوا۔

۱۹۸۶ء ○

اس سال محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے کراچی کے رفقاء کے اصرار پر ناظم آباد بلاک نمبر ۵ پاپوش نگر کراچی کی وسیع و عریض جامع مسجد میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ تراویح میں قرآن حکیم

حافظ محمد رفیق نے سنایا۔ ابتدائی راتوں میں شرکاء کی تعداد لگ بھگ دو سو افراد رہی۔ پہلے عشرے ہی میں یہ تعداد تین سو تک جا پہنچی جبکہ جمعہ اور ہفتہ کی راتوں میں یہ تعداد سوا چار سو تک پہنچ جاتی تھی۔ آخری عشرے میں شرکاء کی تعداد پانچ سو سے لے کر چھ سو سے بھی متجاوز رہی۔ پورے پروگرام میں خواتین کی شرکت بھی روزانہ اوسطاً پچاس رہی۔ ۲۶/ رمضان المبارک کی شب یہ پروگرام اختتام کو پہنچا۔ یہ پروگرام بھی پورے رمضان سحری کے آغاز تک جاری رہتا تھا لیکن تمام شرکاء کا شدید اصرار تھا کہ آئندہ سال بھی یہ پروگرام کراچی میں رکھا جائے۔ اس دورۂ ترجمۂ قرآن کے برکات و اثرات کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ ۵۴ بالکل نئے حضرات نے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاتھ پر بیعت سمع وطاعت کر کے اقامت دین کی جدوجہد میں شمولیت اختیار کی۔

اس سال یہ سلسلۂ خیر مزید آگے بڑھا اور اپنی نوعیت کا یہ منفرد دورۂ ترجمۂ قرآن کراچی کے علاوہ لاہور میں بھی دو مقامات پر منعقد ہوا۔ ایک پروگرام قرآن اکیڈمی لاہور میں ہوا جہاں پروفیسر حافظ احمد یار (مرحوم) سابق صدر شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی نے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ شرکاء کی تعداد اوسطاً ڈیڑھ سو رہی۔ صلوٰۃ التراویح میں قرآن سنانے کی ذمہ داری حافظ عاکف سعید کے سپرد تھی۔ دوسرا پروگرام مرکزی دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو میں رکھا گیا تھا۔ یہاں قرآن حکیم کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کرنے کا فریضہ ڈاکٹر عبد الخالق نے انجام دیا۔ صلوٰۃ التراویح حافظ محمد اشرف نے پڑھائی۔ مستقل طور پر شریک ہونے والوں کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان رہی۔

○ ۱۹۸۷ء

اس سال رمضان المبارک میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد اپنی صحت کی خرابی اور بیرون ملک دعوتی دوروں کے باعث یہ سعادت خود تو حاصل نہ کر سکے تاہم ان کا لگایا ہوا یہ شجر برگ و بار لا چکا تھا۔ چنانچہ اس بار لاہور میں تین مقامات پر اس نہج کے قرآن مجید کے دور کا اہتمام ہوا۔ قرآن اکیڈمی لاہور میں حافظ محمد رفیق نے ترجمۂ قرآن بیان کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔

○ ۱۹۸۸ء

اس سال پھر محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے قرآن اکیڈمی لاہور میں گزشتہ سالوں کے مقابلے میں زیادہ بھرپور انداز سے نماز تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن مع مختصر تشریح بیان کرنے کا اہتمام فرمایا۔ مرد و خواتین شرکاء کی تعداد بھی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ رہی۔ جبکہ ٹیلیفون ریلے سسٹم کے ذریعے لاہور میں ۶۴ مقامات پر یہ ترجمہ قرآن سنا گیا۔ بعض مقامی اخبارات میں اس پروگرام کی افادیت کے اعتراف میں تعریفی کالم اور تاثرات بھی شائع ہوئے جن میں "ایک سچا عاشق قرآن" کے عنوان مجیب الرحمٰن شامی کا کالم جلسۂ عام (روزنامہ نوائے وقت) اور تنویر قیصر شاہد کے تاثرات (روزنامہ امروز)

قابل ذکر ہیں۔

○ ۱۹۸۹ء

اس سال امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے ابو ظبی کے احباب کے شدید تقاضے اور اصرار پر ابو ظبی کے پاکستانی سنٹر کی خوبصورت جامع مسجد میں ترجمۂ قرآن بیان کیا۔ اس رات بھر کے پروگرام میں پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد دلچسپی سے شریک ہوئی۔
جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں اس سال بھی پچھلے چند برسوں کی طرح ماہ رمضان المبارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی روایت پورے اہتمام سے نبھائی گئی۔ جسے پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے کبر سنی اور علالت کے باوجود نہایت خوبی سے نبھایا۔ لاہور میں دو اور مقامات پر یہ پروگرام منعقد ہوئے۔ مرکز تنظیم اسلامی گڑھی شاہو میں محترم ڈاکٹر صاحب کے دورۂ قرآن کے ویڈیو کیسٹس کے ذریعے استفادہ کیا گیا۔ جبکہ نواں کوٹ ملتان روڈ کی ایک مسجد میں محترم رحمت اللہ بٹر صاحب نے دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ یہاں نمازیوں کی سہولت کی غرض سے پہلے نماز تراویح ادا کی جاتی اور آخر میں قرآن کے پڑھے گئے حصے کا ترجمہ بیان ہوتا۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے جواز کا فتویٰ

ناظم آباد کراچی بلاک نمبر ۵ کی جامع مسجد میں بھی یہ محفل سجی' جہاں حافظ محمد رفیق نے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ یہاں پہلے عشرہ کے دوران بعض لوگ دورۂ ترجمۂ قرآن کے خلاف جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن سے ایک فتویٰ لے کر آئے جس کی رُو سے قرآن فہمی کی اس کوشش کو خلاف شرع اور بدعت قرار دیا گیا تھا۔ لیکن یہ فتویٰ مدرسہ ھذا کے رئیس دارالافتاء کا جاری کردہ نہ تھا بلکہ کسی جونیئر استاد کا مرتب کردہ تھا۔ تاہم انجمن خدام القرآن کی طرف سے لاہور کی چوٹی کی دو دینی درسگاہوں یعنی جامعہ اشرفیہ' جامعہ نعیمیہ اور کراچی میں مفتی محمد شفیع کے قائم کردہ "دارالعلوم" میں ایک استفتاء مرتب کر کے بھجوایا گیا۔ تاکہ صورت مسئلہ میں رہنمائی حاصل ہو سکے۔ الحمد للہ مذکورہ بالا تینوں دارالعلوموں کے بلند پایہ مفتی حضرات نے نہ صرف یہ کہ دورۂ ترجمۂ قرآن کے جواز کا فتویٰ دیا بلکہ بعض نے کچھ شرائط کے ساتھ اسے بہتر اور مستحسن بھی قرار دیا۔

○ ۱۹۹۰ء

دورۂ ترجمۂ قرآن کی مستحسن روایت ساتویں سال میں بھی بلا کسی تعطل و انقطاع کے جاری رہی۔
قرآن اکیڈمی لاہور میں خود امیر تنظیم اسلامی نے اس ذمہ داری کو اپنے ذمہ لیا۔ یہ پروگرام بھی نماز عشاء کے ساتھ شروع ہوتا اور سحری ہی کی خبر لاتا لیکن اس مشقت کے باوجود مرد و خواتین خصوصاً

نوجوانوں کا شغف دیدنی تھا۔ جو ظاہر بات ہے کہ شدید طلب اور روحانی پیاس کے بغیر ممکن نہیں۔

۱۹۹۱ء

محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اس بار قرآن اکیڈمی کراچی کی زیر تعمیر عمارت میں دورۂ ترجمۂ قرآن سنانے کا فیصلہ کیا۔ دوران پروگرام یہ عمارت شہر سے ایک طویل مسافت اور ساحل سمندر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر درخشاں سوسائٹی کلفٹن میں واقع ہونے کے باوجود مرجع خلائق بنی رہی۔ شرکاء کی اوسطاً تعداد اڑھائی سے تین صد رہی۔ آخری عشرے میں یہ تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔

قرآن اکیڈمی لاہور میں محترم ڈاکٹر صاحب کے خلف الرشید حافظ عاکف سعید نے یہ ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے ادا کی۔ حافظ محمد رفیق صاحب نے علامہ اقبال ٹاؤن لاہور کے رضا بلاک کی جامع مسجد میں دورۂ ترجمہ قرآن کروایا' جہاں نمازیوں کی سہولت کے پیش نظر نماز تراویح کی ادائیگی کے بعد پڑھے گئے پارے کا ترجمہ بیان کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مرکزی دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو اور قرآن سکول وسن پورہ سمیت پانچ مقامات پر امیر محترم کے ویڈیو کیسٹس کے ذریعے قرآن حکیم کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا۔

۱۹۹۲ء

امیر تنظیم اسلامی نے اس سال آفیسرز کالونی ملتان کی زیر تعمیر قرآن اکیڈمی میں اس مبارک پروگرام کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ یہ پروگرام بھی سابقہ تمام پروگراموں کی طرح بھرپور رہا۔ پروگرام کا آغاز نو بجے شب ہوتا تھا اور قریباً تین بجے بلکہ بسا اوقات ساڑھے تین بجے صبح اختتام پذیر ہوتا تھا۔ دو صد سے زائد افراد روزانہ اس پروگرام میں شریک ہوئے۔

قرآن اکیڈمی لاہور سمیت جہاں حافظ عاکف سعید صاحب نے سعادت حاصل کی' چار مقامات پر لاہور میں اور چار ہی مقامات پر کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگراموں کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ بہت سے مقامات پر ویڈیو کیسٹس کی مدد سے جبکہ بعض جگہوں پر تنظیم کے رفقاء نے خود ہمت کر کے "رجوع القرآن" کی اس تحریک میں حصہ ڈالنے کے لئے کئی پروگرام منعقد کئے۔

۱۹۹۳ء

۱۹۹۳ء کے رمضان المبارک میں امیر تنظیم اسلامی کے دورۂ امریکہ کے باعث قرآن اکیڈمی لاہور میں مسلسل تیسری بار حافظ عاکف سعید نے اپنے مؤثر اور شگفتہ انداز میں دورۂ ترجمۂ قرآن کروایا۔ لاہور میں اس کے علاوہ مزید پانچ مقامات پر بھی یہ پروگرام منعقد ہوئے۔ جن میں دو مقامات میں سے ایک جگہ فتح محمد قریشی صاحب اور دوسری جگہ چوہدری رحمت اللہ بٹر نے یہ سعادت حاصل کی جبکہ تین دیگر

مقامات پر ویڈیو کیسٹ کے ذریعے محترم ڈاکٹر صاحب کے دورۂ ترجمۂ قرآن سے استفادہ کیا گیا۔ مزید برآں فیروزوالا (مضافات لاہور) میں نعیم اختر عدنان صاحب‘ فیصل آباد میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب‘ ملتان میں مختار حسین فاروقی صاحب اور کراچی میں نوید احمد صاحب نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری نبھائی۔

○ ۱۹۹۴ء

قرآن اکیڈمی لاہور میں اس سال امیر تنظیم اسلامی نے ترجمہ قرآن بیان کیا۔ شرکاء کی تعداد سابقہ تمام پروگراموں سے زیادہ اور بھرپور تھی۔ پروگرام کا دورانیہ کم و بیش چھ گھنٹے تھا‘ نماز عشاء ساڑھے آٹھ بجے ادا کی جاتی اور فارغ ہوتے بالعموم اڑھائی بج جاتے۔ اس سال ملک کے دوسرے شہروں میں بھی دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام منعقد ہوئے۔

لاہور میں دیگر اہم پروگرام : مسجد و مکتب‘ مدینہ روڈ‘ والٹن لاہور میں تنظیم اسلامی کے رفیق محترم فتح محمد قریشی صاحب نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کی۔ یہ پروگرام روزانہ رات آٹھ بجے سے بارہ بجے تک جاری رہتا تھا۔ حاضرین کی اوسطاً تعداد تیس‘ پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ جبکہ چند خواتین نے بھی باقاعدگی سے اس پروگرام میں شرکت کی۔

دارالقرآن وسن پورہ لاہور میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی ویڈیو کیسٹس کے ذریعے دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام مکمل کیا گیا۔ اسی طرح جامع مسجد گنگ محل میں حافظ محمد اقبال نے روزانہ تراویح کے بعد آدھ گھنٹہ تلاوت کردہ حصہ کے مطالب کا خلاصہ بیان کیا۔

کراچی : اس سال قرآن اکیڈمی کراچی میں انجینئر نوید احمد نے اس پروگرام کو احسن طریق پر انجام دیا۔ روزانہ اوسطاً ۱۰۰ افراد اس پروگرام میں شریک رہے جبکہ شب جمعہ میں یہ تعداد ۱۵۰ تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ تقریباً پچیس تیس خواتین نے بھی پروگرام میں شرکت کی۔ بعض اوقات یہ تعداد ۷۰ سے ۸۰ تک پہنچ جاتی تھی۔

دفتر تنظیم اسلامی کراچی شرقی نمبر ۲ میں جناب اعجاز لطیف نے اس پروگرام کی تکمیل کی۔ چھوٹا گیٹ‘ ائیرپورٹ کراچی میں ایک رفیقہ تنظیم نے خواتین کے لئے دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام منعقد کیا جس میں ۵۰ تا ۶۰ خواتین شریک ہوئیں۔ محمود آباد میں جناب جاوید عبداللہ نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کا فریضہ سرانجام دیا۔

ان پروگراموں کے علاوہ کراچی میں متعدد مقامات پر دورۂ ترجمۂ قرآن کی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کے ذریعہ بھی استفادہ کیا گیا۔

ملتان : قرآن اکیڈمی ملتان میں انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کی۔ شرکاء کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ تقریباً ۲۵ خواتین بھی اس پروگرام میں شریک رہیں۔

فیصل آباد : گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی فیصل آباد میں رمضان المبارک کے دوران نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن انجمن خدام القرآن کے دفتر میں منعقد کیا گیا۔ مدرس و مترجم کے فرائض ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے انجام دیے۔

علاوہ ازیں جناب محمد رشید عمر صاحب نے جامع مسجد محمدی اہلحدیث پیپلز کالونی میں نماز تراویح کے بعد اس روز پڑھے جانے والے قرآن مجید کی منتخب آیات کا ترجمہ آدھ گھنٹہ میں بیان کرنے کی سعادت حاصل کی۔

پشاور : اس سال پشاور میں بھی رفقائے تنظیم نے دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام منعقد کیا۔ ترجمہ قرآن کرنے کی سعادت خورشید انجم صاحب نے حاصل کی۔ اس پروگرام میں قرآن مجید کا جو منتخب حصہ تراویح میں پڑھا جانا ہوتا' فرض نماز کے بعد اس کے مضامین کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا۔ جس میں آدھ تا پون گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔

راولپنڈی / اسلام آباد : راولپنڈی / اسلام آباد میں بذریعہ ویڈیو کیسٹ دورۂ ترجمۂ القرآن کی محافل منعقد ہوتی تھیں۔ جس کی صورت یہ تھی کہ مقامی مساجد میں نماز عشاء اور تراویح پڑھ کر بعد میں مندرجہ ذیل مقامات پر استفادہ کیا جاتا۔

۱۔ ڈھوک گنگال' بر مکان محبوب ربانی مغل
۲۔ بمقام شکریال' بر مکان شمس الحق اعوان
۳۔ مسلم ٹاؤن' بر مکان شمیم اختر
۴۔ بر مکان غلام مرتضیٰ اعوان ۶/۲۔جی اسلام آباد

اس کے علاوہ فیصل مسجد میں خالد محمود عباسی اور چند رفقائے تنظیم نے اعتکاف کیا۔ اس دوران خالد محمود عباسی نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔

○ ۱۹۹۵ء

امیر محترم نے گھٹنوں کی شدید تکلیف کے باوجود امریکہ کے رفقائے تنظیم کے اصرار پر نیو جرسی کی مسجد الرحمٰن میں بزبان انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز کیا۔ لیکن اس پروگرام کے لئے مسلسل چھ چھ گھنٹے ایک ہی انداز میں کرسی پر بیٹھے رہنے کا نتیجہ ٹانگوں پر سوجن اور ورم کی صورت میں ظاہر ہوا اور یہ پروگرام چار روز بعد ہی موقوف کرنا پڑا۔ تاہم شرکاء کے ذہن و نقش پر اس چار روزہ پروگرام کے بھی دیرپا اثرات قائم ہوئے۔

☆ قرآن اکیڈمی لاہور میں جناب مختار حسین فاروقی نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔

☆ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے مرکزی دفتر تنظیم اسلامی میں جناب فتح محمد قریشی نے والٹن مسجد میں اور

چودھری رحمت اللہ بٹر نے ڈھولن وال میں دورۂ ترجمۂ قرآن کروایا۔

☆ مزید برآں لاہور میں دو مقامات پر بذریعہ ویڈیو کیسٹ استفادہ کیا گیا۔

☆ قرآن اکیڈمی ملتان میں ڈاکٹر طاہر خان خاکوانی نے یہ ذمہ داری نبھائی۔

☆ جامع مسجد گوجراں، گجرات میں مولانا عبدالرؤف اور جناب شاہد اسلم نے دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا۔

☆ دفتر تنظیم اسلامی فیصل آباد میں ڈاکٹر عبدالسمیع نے مترجم کے فرائض سرانجام دیئے۔

☆ راولپنڈی / اسلام آباد میں آٹھ مقامات پر بذریعہ ویڈیو کیسٹ اس پروگرام کا انعقاد ہوا۔ جبکہ دو مقامات پر جناب محبوب ربانی مغل اور جناب شفاء اللہ خان مترجم تھے۔

☆ کراچی میں نو مقامات پر ویڈیو کیسٹ کے ذریعے اور پانچ مقامات پر انجینئر نوید احمد، سید یونس واجد صاحب، اعجاز لطیف صاحب، عبدالمقتدر صاحب اور شمس العارفین نے مترجم کے فرائض ادا کئے۔ کراچی میں دو حلقے خواتین کے بھی قائم ہوئے جہاں خواتین مترجمات ہی نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔

☆ حلقہ سرحد و بلوچستان میں بھی متعدد مقامات پر دورۂ ترجمۂ قرآن کے حلقے قائم رہے۔

○ ۱۹۹۶ء

☆ امیر تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے گزشتہ سال انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل نہ ہونے کے باعث اس سال مسلم سینٹر آف نیویارک امریکہ میں بزبان انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۵ پاروں کی آڈیو / ویڈیو ریکارڈنگ مکمل ہو گئی۔ یہاں نماز تراویح میں قرآن سنانے کی سعادت جناب حافظ عاکف سعید کے حصے میں آئی۔

☆ قرآن اکیڈمی لاہور میں ڈاکٹر عبدالسمیع نے دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا، موصوف اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے روزانہ فیصل آباد سے تشریف لاتے تھے۔

☆ اس کے علاوہ ملک بھر میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے بیسیوں حلقے قائم ہوئے، جہاں ہزاروں طالبان قرآن نے رمضان المبارک کے تزکیہ نفس کے دوگونہ پروگرام میں روزہ کے ساتھ ساتھ قیام اللیل کی سعادت حاصل کی۔

○ ۱۹۹۷ء

اس سال پاکستان کے طول و عرض میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے جو اہم پروگرام ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پنجاب شرقی :

☆ پنجاب شرقی لاہور ڈویژن پر مشتمل حلقہ پنجاب شرقی میں قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن' لاہور کو دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگراموں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے یہ ذمہ داری نبھائی۔

☆ مسجد و مکتب خدام القرآن والٹن میں جناب فتح محمد قریشی مدرس تھے۔

☆ جامع مسجد لارکس کالونی (کینال بنک ایکسٹینشن) میں جناب محمد بشیر نے "تفہیم القرآن" کی مدد سے دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا۔

☆ چھ مقامات پر امیر محترم کی ویڈیو ریکارڈنگ کے ذریعہ استفادہ کیا گیا۔

پنجاب شمالی :

☆ عظمت ممتاز ثاقب کے مکان واقع ایف۔۱۰ اسلام آباد میں جناب شمس الحق اعوان نے مدرس کے فرائض سرانجام دیئے۔

☆ مزید برآں راولپنڈی / اسلام آباد میں سات مختلف مقامات پر بذریعہ ویڈیو کیسٹ دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام منعقد ہوئے۔

پنجاب جنوبی :

قرآن اکیڈمی ملتان میں جناب مختار حسین فاروقی اور نشتر میڈیکل کالج کی مسجد میں ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری نبھائی۔

پنجاب غربی :

☆ حمید پیلس، فیصل آباد میں ڈاکٹر عبدالسمیع مدرس تھے۔

☆ دفتر حلقہ' ریلوے روڈ' فیصل آباد میں جناب شاہد مجید نے ترجمۂ قرآن بیان کیا۔

☆ مرکز تنظیم اسلامی سرگودھا میں جناب رشید عمر نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔

☆ چک ۷ ۱۲/ جنوبی میں محمد اقبال نے یہ ذمہ داری نبھائی۔

☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے پنجابی زبان میں دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا۔

☆ سانگلہ ہل میں بذریعہ ویڈیو کیسٹ یہ پروگرام منعقد ہوا۔

حلقہ آزاد کشمیر :

بیروٹ میں جناب خالد محمود عباسی نے مترجم کے فرائض سرانجام دیئے۔

حلقہ سرحد :

پشاور میں بذریعہ ویڈیو کیسٹ جناب خدا بخش کے مکان پر یہ پروگرام منعقد کیا گیا۔

حلقہ کراچی :

☆ تنظیم اسلامی ضلع وسطی نمبر ۱

۱۔ بر مکان احتشام الحق صدیقی 'نیو کراچی۔ مدرس عبدالمقتدر

۲۔ بر مکان جناب نجم الحسن 'نارتھ ناظم آباد۔ بذریعہ ویڈیو کیسٹ

☆ تنظیم اسلامی ضلع وسطی نمبر ۲

۱۔ بر مکان جناب جلال الدین اکبر 'گلشن اقبال۔ مدرس جلال الدین اکبر

۲۔ بر مکان جناب نوید احمد 'اسحاق آباد۔ بذریعہ ویڈیو کیسٹ

۳۔ بر مکان جناب محمد طارق 'عزیز آباد۔ بذریعہ ویڈیو کیسٹ

☆ تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر ۱

۱۔ دفتر تنظیم اسلامی۔ مدرس عبدالرزاق

☆ تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر ۲

۱۔ دفتر تنظیم اسلامی۔ مدرس اعجاز لطیف

۲۔ بر مکان جناب اعجاز لطیف (صبح دس تا ڈیڑھ بجے)۔ مدرسہ بیگم اعجاز لطیف

۳۔ بر مکان جناب بشیر احمد سلیمی 'ملیر کینٹ۔ بذریعہ ویڈیو کیسٹ

۴۔ بر مکان جناب محمد سلیم ' ماڈل کالونی۔ بذریعہ ویڈیو کیسٹ

☆ تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر ۳

۱۔ مسجد طیبہ 'زمان ٹاؤن 'کورنگی نمبر ۴۔ مدرس سید یونس واجد

۲۔ بر مکان جناب ابوذر ہاشمی 'لانڈھی نمبر ۱۔ یہاں تین رفقاء نے ذمہ داری نبھائی

☆ تنظیم اسلامی ضلع جنوبی

۱۔ قرآن اکیڈمی ' ڈیفنس۔ مدرس انجینئر نوید احمد

○ ۱۹۹۸ء

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس سال قرآن اکیڈمی کراچی میں دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ اس مرتبہ ممبئی (بھارت) کے ادارے اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کی خواہش پر بذریعہ سیٹلائٹ نشر کیے جانے کی غرض سے مخصوص ڈیجیٹل ریکارڈنگ کا اہتمام

یہ پروگرام ساڑھے آٹھ بجے شب شروع ہوتا اور تقریباً اڑھائی بجے تک جاری رہتا۔ شرکاء کی تعداد اوسطاً ساڑھے تین سو رہی۔ جو ہفتے کی آخری شب پانچ سو سے بھی تجاوز کر جاتی۔ اس پروگرام کے اختتام پر تقریباً ۱۵۰ افراد نے تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن میں شمولیت اختیار کی۔

☆ قرآن اکیڈمی لاہور میں جناب خالد محمود عباسی نے ترجمۂ قرآن بیان کیا۔

☆ اس کے علاوہ لاہور میں چار مختلف مقامات پر جناب عبدالرزاق قمر' جناب اقبال حسین' حافظ محمد اشرف اور حافظ علاؤالدین نے یہ سعادت حاصل کی جبکہ گیارہ مقامات پر بذریعہ ویڈیو کیسٹ یہ پروگرام منعقد کیا گیا۔

☆ کراچی اور لاہور کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں بھی حسب معمول بیسیوں مقامات پر یہ پروگرام منعقد ہوئے۔

امریکہ میں دورۂ ترجمۂ قرآن : اس سال مسلم سنٹر آف نیویارک میں دوران نماز تراویح جناب حافظ عاکف سعید نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ امریکہ میں یہ پہلا موقع تھا' جب یہاں نیکیوں کے موسم بہار میں قرآنی علوم و معارف کے انوار کی بارش ہوئی۔ یہ دورۂ ترجمۂ قرآن اردو زبان میں مکمل کیا گیا۔ اس سے پہلے اسی سنٹر میں امیر تنظیم اسلامی نے بزبان انگریزی پندرہ پارے ریکارڈ کروائے تھے۔ یہ تعداد امریکہ کی مصروف زندگی کے باوجود اردو جاننے والے خواتین و حضرات کی اچھی خاصی تعداد اس پروگرام میں باقاعدگی سے شریک ہوتی رہی۔ روزانہ اوسط حاضری ساٹھ ستر افراد سے زیادہ رہتی' جبکہ جمعہ' ہفتہ اور اتوار کے روز یہ تعداد ۱۵۰ سے ۲۰۰ افراد تک پہنچ جاتی۔ جناب حافظ اسد اعوان اور حافظ ڈاکٹر فرید شاہ نے نماز تراویح میں قرآن سنایا۔ یہ پروگرام نیویارک کے مسلم حضرات کو قرآن کی روحانی کیفیت سے روشناس کرانے کی طرف ایک اہم قدم تھا۔

○ ۱۹۹۹ء

وہ پودا جسے امیر تنظیم اسلامی نے ۱۹۸۴ء میں لگایا تھا اس سال اپنے جوبن پر نظر آتا ہے۔ یہ پودا اب نہ صرف ایک تناور درخت بن چکا ہے' بلکہ تحریک دعوت رجوع الی القرآن کے زیر اثر شروع ہونے والا یہ پروگرام خود ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس سال پاکستان مین مجموعی طور پر اٹھائیس مقامات پر دورۂ ترجمۂ قرآن کے مکمل پروگرام منعقد ہوئے۔ مزید برآں بیان القرآن (خلاصۂ مباحث قرآن) کے پروگرام گیارہ مقامات پر اور آڈیو/ویڈیو کیسٹ کے ذریعے ترجمہ قرآن کے مکمل و مختصر پروگرام ۳۵ مقامات پر ہوئے۔

اس بار قرآن اکیڈمی لاہور میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ البتہ اس بار ڈاکٹر صاحب کی صحت کے پیش نظر اس پروگرام میں

تھوڑی سی تبدیلی کی گئی تھی۔ اس پروگرام سے پہلے معمول یہ تھا کہ ترجمۂ قرآن عشاء کی نماز سے شروع ہو کر پانچ پانچ' چھ چھ گھنٹے میں مکمل ہو تا تھا۔ لیکن اس مرتبہ قرآن کے لفظ بہ لفظ ترجمہ و تشریح کے بجائے صرف رکوع بہ رکوع مباحث و مضامین کا خلاصہ بیان کیا گیا۔ اس فیصلے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس صورت میں "خلاصۂ مباحث قرآن" کی ایک ایسی ریکارڈنگ میسر ہو گئی جو آئندہ سالوں میں رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں بعض مقامات پر کم وقت میں مطالب قرآن کے بیان کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس طرح اس پروگرام کا دائرہ افادیت وسیع تر ہو گیا کیونکہ اب زیادہ سے زیادہ لوگ رمضان کے مہینے میں بذریعہ ویڈیو کیسٹ قرآن کے مباحث سے استفادہ کرنے کے لئے اس پروگرام میں شرکت کر سکیں گے۔

اس سال خلاصہ مباحث قرآن کے پروگرام میں محترم ڈاکٹر صاحب نماز عشاء کے بعد نماز تراویح کی پہلی آٹھ رکعتوں میں پڑھے جانے والے قرآن کے مضامین کا خلاصہ ایک گھنٹے میں بیان فرماتے' پھر آٹھ رکعتیں پڑھی جاتیں۔ اس کے بعد اگلی بارہ رکعت میں پڑھے جاتے والے قرآن کا خلاصہ بھی ایک گھنٹے میں بیان کیا جاتا۔ اس کے بعد بیس منٹ کا وقفہ ہو تا جس میں مرکزی انجمن خدام القرآن کی طرف سے شرکاء کو چائے پیش کی جاتی۔ وقفے کے بعد بارہ رکعت تراویح اور صلوٰۃ الوتر ادا کی جاتی جبکہ پروگرام کے اختتام پر نصف گھنٹہ سوال و جواب کی نشست کے لئے مختص ہو تا۔ یوں یہ پروگرام ساڑھے بارے بجے اختتام پذیر ہو جاتا۔

اس پروگرام کی ایک غیر معمولی بات شرکاء کی حاضری تھی' دھند اور دسمبر' جنوری کی شدید سردی کے باوجود لاہور کے دور دراز علاقوں اور قریبی شہروں سے بے شمار لوگ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ روزانہ پروگرام میں شرکت کرتے۔ چنانچہ قرآن اکیڈمی کی مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ مسجد کے علاوہ خواتین اور بچوں کے لئے الگ سے دو ہال بھی کھچا کھچ بھرے ہوتے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پروگرام کے اختتام پر شرکاء کی ایک قابل ذکر تعداد نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر کے اقامت دین کی جدوجہد میں محترم ڈاکٹر صاحب کا باقاعدہ ساتھی بننے کا فیصلہ کیا۔

روزنامہ پاکستان لاہور نے ۱۴ جنوری ۹۹ء کی خصوصی اشاعت میں اس پروگرام پر ایک بھرپور فیچر شائع کیا' جس میں پورے دو رنگین صفحات پر اس پروگرام کا بھرپور طریقے سے احاطہ کیا گیا تھا۔

موسم کی خرابی کے باوجود لوگوں کی اتنی بڑی تعداد میں شرکت و دلچسپی' آخر میں لوگوں کی تنظیم میں شمولیت سے ایسا محسوس ہو تا تھا کہ مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی انقلاب کی منزل اب زیادہ دور نہیں۔

اس مرکزی پروگرام کے علاوہ اس سال مندرجہ ذیل مقامات پر دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام منعقد ہوئے۔

حلقہ پنجاب شرقی :

☆ لاہور میں بارہ مقامات پر بذریعہ ویڈیو دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام منعقد ہوئے۔

☆ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل مقامات پر جن مدرسین نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کی' ان کے نام یہ ہیں :

(۱) مسجد خدام القرآن والٹن لاہور میں جناب فتح محمد قریشی مترجم تھے۔

(۲) دارالقرآن وسن پورہ لاہور میں جناب عبدالرزاق قمر نے یہ سعادت حاصل کی۔

(۳) مسجد نور' گلستان کالونی' مصطفیٰ آباد میں جناب اقبال حسین نے دورۂ ترجمۂ قرآن کرایا۔

(۴) تاج پورہ میں محمد اختر خان صاحب کے مکان پر نماز تراویح کے بعد جناب حافظ محمد اشرف نے مختصراً مضامین قرآن بیان کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔

(۵) مسجد العزیز رچنا ٹاؤن فیروز والا میں حافظ علاؤ الدین مترجم تھے۔

(۶) شیخوپورہ میں قیصر جمال فیضی نے یہ پروگرام مکمل کیا۔

حلقہ پنجاب جنوبی :

☆ پنجاب جنوبی میں تین مقامات پر ویڈیو کیسٹ کے ذریعے دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام منعقد کئے گئے۔

☆ قرآن اکیڈمی ملتان میں ڈاکٹر طاہر خاکوانی نے دورۂ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری پوری کی۔

☆ مسجد تنظیم اسلامی میانوالی میں جناب بشیر احمد نے ترجمۂ قرآن بیان کیا۔

حلقہ پنجاب غربی :

☆ قرآن ہال سرگودھا میں جناب خالد محمود عباسی مترجم تھے۔

☆ دفتر مسلم لیگ سانگلہ ہل کی تالاب والی مسجد میں جناب رحمت اللہ بٹر نے پنجابی میں ترجمۂ قرآن بیان کیا۔

☆ دفتر انجمن خدام القرآن فیصل آباد میں جناب رشید عمر نے یہ سعادت حاصل کی۔

☆ دفتر تنظیم اسلامی فیصل آباد شرقی میں جناب محمد فاروق نے اس ذمہ داری کو پورا کیا۔

حلقہ پنجاب وسطی :

☆ جامع مسجد عبید اللہ جھنگ صدر میں جناب انجینئر مختار حسین فاروقی نے دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا۔

حلقہ پنجاب شمالی :

☆ اسلام آباد میں عظمت ممتاز ثاقب صاحب کے مکان پر جناب عاطف وحید نے مدرس کی ذمہ داری نبھائی۔

☆ مسجد السید ہسپتال ایبٹ آباد میں جناب ذوالفقار علی مترجم تھے۔

☆ النور کالونی راولپنڈی میں محمد ظہیر اعوان کے مکان پر جناب شمس الحق اعوان نے نماز تراویح کے بعد تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن کے حصے کا خلاصہ و مختصر تشریح بیان کی۔

☆ مسجد ربانیہ آباد' راولپنڈی جناب محبوب ربانی نے نماز تراویح کے بعد مختصر تشریح بیان کی۔

☆ مسجد سول ہسپتال گوجر خان میں جناب محمد مشتاق نے بعد نماز تراویح مختصر پروگرام منعقد کیا۔

☆ مسجد محکمہ انہار' جہلم میں بعد نماز فجر جناب محمد اشرف نے ۴۰ منٹ اس روز تراویح میں پڑھے جانے والے حصہ قرآن کے اہم مضامین کا خلاصہ بیان کرنے کی ڈیوٹی سرانجام دی۔

☆ مزید برآں راولپنڈی/اسلام آباد میں نو مقامات پر اور ایبٹ آباد میں ایک مقام پر بذریعہ ویڈیو دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام منعقد ہوئے۔

حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن :

☆ جامع مسجد عمر فاروق گجرات میں جناب عبدالرؤف نے مترجم کے فرائض سرانجام دیئے۔

☆ مسجد چاہ جٹاں والی' سیالکوٹ میں جناب شمس العارفین نے یہ سعادت حاصل کی۔

☆ جامع مسجد عثمانیہ 'ڈسکہ میں جناب شاہد اسلم نے ترجمۂ قرآن بیان کیا۔

حلقہ آزاد کشمیر :

☆ دفتر تنظیم اسلامی مظفر آباد آزاد کشمیر میں روزانہ ساڑھے آٹھ تا گیارہ بجے بذریعہ ویڈیو استفادہ کیا گیا۔

حلقہ سرحد :

☆ جامع مسجد اُوچ' بٹ خیلہ سرحد میں جناب مولانا غلام اللہ حقانی نے دن بارہ بجے تا نماز عصر ترجمۂ قرآن بیان کرنے کی ڈیوٹی سرانجام دی۔

☆ مدینہ مسجد سکندر پورہ پشاور میں بعد نماز تراویح ڈیڑھ گھنٹہ ترجمۂ قرآن کا مختصر پروگرام منعقد کیا گیا۔

☆ تیمر گرہ میں جناب محمد مختار کے مکان پر ویڈیو کیسٹ کے ذریعے یہ پروگرام منعقد ہوا۔

☆ کینٹ پشاور میں بھی ویڈیو کیسٹ کے ذریعے استفادہ کیا گیا۔

حلقہ سندھ وبلوچستان

☆بلوچستان میں دو مقامات پر بذریعہ ویڈیو دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام منعقد کیا گیا۔

☆ قرآن اکیڈمی کراچی میں جناب اعجاز لطیف نے مترجم کے فرائض سر انجام دیئے۔ قرآن اکیڈمی کے شہر سے خاصے فاصلے پر ہونے کے باوجود بھی حاضری بھرپور رہی۔ تقریباً ۱۵۰ مرد اور ۶۰ خواتین اس پروگرام میں شریک رہیں۔

☆گلشن اقبال کراچی کے ایک شادی ہال میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری انجینئر نوید احمد نے نبھائی۔ تقریباً ۱۵۰ مرد اور ۷۵ خواتین اس پروگرام میں شریک ہوئیں۔

ایسی دیوانگی دیکھی نہیں! (لب سڑک دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام)

☆ برنس روڈ' کراچی شہر کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس علاقے میں جناب شجاع الدین شیخ نے دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام منعقد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ علاقہ کی مسجد میں اس پروگرام کے انعقاد کی اجازت طلب کی گئی لیکن مسجد کمیٹی سے اس کی اجازت نہ مل سکی۔ لہٰذا شجاع الدین صاحب نے طے کیا کہ وہ سڑک پر ٹینٹ لگا کر یہ سعادت حاصل کریں گے۔ اہل محلہ نے اس کارخیر میں خوب تعاون کیا اور یوں شجاع الدین صاحب نے اپنی نوعیت کے اعتبار سے دعوت رجوع الی القرآن کے اس منفرد پروگرام کو انوکھے انداز میں سڑک کے کنارے منعقد کر کے اپنے صاحب جنوں ہونے کا ثبوت فراہم کیا جس کی دعوت وتبلیغ کے کام میں بہت ضرورت ہوتی ہے اور جس جنون کی رفقاء اپنے اندر اکثر کمی محسوس کرتے ہیں۔

اس پروگرام کی اوسط حاضری عام راتوں میں ۵۰ جبکہ طاق راتوں میں ۱۰۰ سے متجاوز رہی۔

☆ مدرسہ شمس النساء منظور کالونی کراچی میں جناب فیصل منصوری نے یہ ذمہ داری نبھائی۔ اوسط حاضری ۲۰ مرد اور دس خواتین پر مشتمل تھی۔

☆ڈاکٹر احتشام الحق صدیقی کے مکان واقع نیو کراچی میں جناب عبدالمقتدر مترجم تھے۔ پروگرام کی اوسط حاضری ۱۵ تھی۔

☆ جامع مسجد یاسین آباد فیڈرل بی ایریا کراچی میں مترجم کے فرائض جناب جلال الدین اکبر نے ادا کئے۔ اوسط حاضری ۵۰ افراد تھی۔

☆ مسجد طیبہ' زمان ٹاؤن کورنگی نمبر ۴ میں جناب عمران لطیف کھوکھر اور یونس واجد صاحب نے

ترجمۂ قرآن مکمل کیا۔ اس پروگرام کی اوسط حاضری ۲۵ رہی۔

☆ عابد جاوید خان کی رہائش گاہ واقع بلدیہ ٹاؤن میں مترجم کے فرائض جناب عبدالرزاق خان نیازی نے ادا کیے۔

☆ نیول کالونی کی مسجد میں جناب سعید الرحمٰن مترجم تھے۔

☆ لانڈھی میں جمیل احمد کی رہائش گاہ پر جناب عامر خان اور افتخار عالم خان نے ترجمۂ قرآن بیان کیا۔ اوسط حاضری ۳۵ مرد اور ۱۰ خواتین پر مشتمل رہی۔

☆ کوچنگ سنٹر K ایریا، کورنگی نمبر ۵، کراچی میں اقبال احمد صدیقی نے یہ سعادت حاصل کی۔

☆ جناب اختر ندیم صاحب نے اپنے مکان واقع PECHS کراچی میں مختصر مضامین قرآن بیان کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔

☆ ماڈل کالونی کراچی میں محمد سلیم صاحب کے مکان پر بذریعہ ویڈیو کیسٹ ہونے والے پروگرام میں اوسط حاضری ۱۵ افراد تھی۔

☆ بشیر احمد سلیمی صاحب کی رہائش گاہ واقع ملیر کینٹ کراچی میں ویڈیو کے ذریعے پروگرام منعقد ہوا۔ اوسط حاضری ۳۰ مرد اور ۱۰ خواتین پر مشتمل تھی۔

☆ پی آئی اے ٹاؤن شپ میں طارق محمود ملک صاحب کی رہائش گاہ پر ہونے والے ویڈیو پروگرام میں اوسط حاضری ۱۰ تھی۔

☆ دفتر تنظیم اسلامی، اسلام چوک، اورنگی ٹاؤن میں پروجیکٹر کے ذریعے دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام ہوا۔

☆ سکھر میں ریلوے آفیسرز کلب میں مترجمین جناب غلام محمد سومرو اور خالد محمود سومرو تھے۔ اوسط حاضری ۴۰ تھی۔

خواتین کے پروگرام :

☆ اعجاز لطیف صاحب کی رہائش گاہ واقع گلشن اصغر، کراچی میں ان کی اہلیہ صبح دس بجے ترجمۂ قرآن بیان کرتی تھیں۔ خواتین کی اوسط حاضری ۱۴۰ تھی۔

☆ لانڈھی میں ابوذر ہاشمی صاحب کی رہائش گاہ پر ہونے والے پروگرام کی مترجمہ افتخار عالم خان صاحب کی اہلیہ تھیں۔ یہ پروگرام روزانہ آٹھ بجے شب ہوا کرتا تھا۔ اوسط حاضری ۴۵ تھی۔

☆ ایبٹ آباد میں جناب ذوالفقار علی کے مکان پر خواتین کے لئے روزانہ صبح دس تا گیارہ بجے بذریعہ ویڈیو دورۂ ترجمۂ قرآن کا اہتمام تھا۔

نیویارک میں دورۂ ترجمۂ قرآن نیویارک کے شہر فلشنگ میں اردو سمجھنے اور انڈیا/پاکستان سے

تعلق رکھنے والے حضرات کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ چنانچہ اس سال مسلم سنٹر آف فلشنگ نیویارک میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے دوسری بار دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کی سعادت حاصل کی۔ اس سے قبل حافظ عاکف سعید صاحب نے ۱۹۹۸ء میں یہاں پہلی بار اس پروگرام کو روشناس کرایا تھا۔ اس بار دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام زیادہ منظم انداز میں ہوا۔ ابتداء میں خیال یہ تھا کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یہاں انگریزی زبان میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کریں گے لیکن آخری دنوں میں پروگرام بدل گیا۔ یہاں حاضری بہت حوصلہ افزا رہی۔ ہفتہ کی آخری راتوں (week-ends) میں یہ تعداد ۱۲۰ حضرات اور ۳۰ خواتین تک جا پہنچی تھی۔ رمضان کی ستائیسویں شب یہ تعداد ۳۰۰ افراد کے لگ بھگ تھی۔ ہفتہ کی آخری راتوں میں پروگرام سحری تک طول پکڑ جاتا۔ چنانچہ شرکاء کے لئے سحری کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ پروگرام کے اختتام پر گیارہ افراد بشمول نماز تراویح میں قرآن سنانے والے حافظ ڈاکٹر عامر عزیز نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔

☆☆☆

پس نوشت

یہ رپورٹ دو سال قبل ۹۹ء میں مرتب کی گئی تھی۔ بعد کے سالوں میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام نہ صرف یہ کہ حسبِ سابق پاکستان کے متعدد بڑے شہروں میں پہلے سے زیادہ بھرپور انداز میں منعقد ہوئے بلکہ امریکہ میں نیویارک کے علاوہ شکاگو میں بھی گزشتہ دو سالوں میں ماہ رمضان المبارک کے دوران باقاعدہ دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگراموں کا انعقاد ہوا۔ پہلی بار یہ پروگرام اسلامک سنٹر شکاگو سٹی میں منعقد ہوا جبکہ دوسری بار اسلامک فاؤنڈیشن ولا پارک کی عالیشان مسجد میں اس مبارک پروگرام کا انعقاد ہوا۔ شکاگو میں ترجمہ قرآن کی سعادت دونوں بار جناب حافظ عاکف سعید کے حصے میں آئی ——— گزشتہ سال نیویارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے دو پروگرام ہوئے۔ انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسلم سنٹر فلشنگ میں انگریزی زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن کی ریکارڈنگ مکمل کروائی۔ واضح رہے کہ قبل ازیں انگریزی میں نصف دورۂ ترجمہ قرآن کی ریکارڈنگ اسی مقام پر چار سال قبل عمل میں آئی تھی۔ علاوہ ازیں لانگ آئی لینڈ نیویارک میں Bayshore کی مسجد میں ڈاکٹر طاہر خاکوانی صاحب نے اردو زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن مکمل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ فالحمدلله علىٰ ذلک

(۱۳/اکتوبر ۲۰۰۱ء)

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر

قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجئے

نوٹ

اس کتابچے کا انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن، لاہور- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

مرکزی انجمن خدّامُ القرآن لاهور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ